چار ناولٹ

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

چار ناولٹ

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

دوسرا ایڈیشن --- ۱۹۸۹
تعداد ------- ۱۰۰۰
قیمت ------ ۵۰/-

کتابت : ریاض احمد، الہ آباد
مطبع : ایس۔ کے پرنٹرس دہلی

CHAR NOVLET
BY QURRATUL AIN HAIDER
NOVLET 1989 RS.50/-

EDUCATIONAL BOOK HOUSE
MUSLIM UNIVERSITY, MARKET
ALIGARH 202002

ترتیب

دِلرُبا

دلرُبا کا کولاژ مصنف نے بنایا ہے

۱۔ پردہ گرنے کے بعد

"—— رباب ستار پکھاوج سُر سنگھار باج دھیان مان سے گمک تان سے تین گرام سے بجے سب باج ناچو نرت بتاؤ اور اڑاؤ گندھرو راگ۔ مانی دھانی دھاپا ماگارے سادھاکرٹاتک —— دھاکرٹاتک دھم کرٹاتک دھان تک تھئی دھاکرٹاتک تھئی ——" آخری پرشکوہ کورس کی گونج مدھم پڑی۔ عہد وکٹوریہ کے مکینکل اسٹیج کرافٹ سے لیس شاہی دربار میں جمع زرق برق پوشاکوں سے جگمگاتی کاسٹ پر عنابی مخملیں پردہ آہستہ آہستہ گرا۔ باہر آکر ڈریس سوٹ میں ملبوس پارسی منیجر رستم جی بسٹن جی نے کمپنی کی طرف سے پبلک کا شکریہ ادا کیا اور اگلی رات کا پروگرام اناؤنس کیا۔ جونہی والوں کی سیٹیوں اور تالیوں کے شور میں ہال برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا۔ عنابی پلش کے ڈریس سرکل میں سے نکل کر شرفائے لکھنؤ زینہ اترنے لگے۔ ایک کونے والے "لیڈیز باکس" میں برقعہ پوشوں نے فوراً پردہ برابر کیا۔ چند منٹ بعد ان میں سے ایک نے باہر جھانکا، ہال خالی ہو چکا تھا۔ چاروں کا جلوس "باکس" سے برآمد ہوا۔ ان میں سے ایک نے گھبراہٹ میں شٹل کاک برقعہ اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ آنکھوں کی سفید جالی سر کے پیچھے تھی۔ چاروں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کیا۔ ایک

سنسان کوریڈور میں سبز بانات سے منڈھے دروازے پر "پرائیویٹ" کی تختی لگی تھی۔ نیم واکواڑ سے ٹکراکر چاروں غڑاپ سے اندر۔

اپنے پرائیویٹ ڈریسنگ روم میں "ملکہ مہر" سنگھار میز کے سامنے بیٹھی نقلی زیورات اتارنے میں مشغول تھی۔ بلب سے روشن آئینے میں عجیب ماجرا نظر آیا۔ ایک نقاب پوش گھیردار سفید برقعے میں ملفوف فرش پر ڈھیر۔ تین نقاب پوش دہلیز پر موجود۔

"اوئی اللہ ـــ" "ملکہ مہر" دہل کے چیخی ـــ "کندن ـــ منو ـــ بہروپیے ـــ چور ـــ چور ـــ" حاضر دماغی سے کام لے کر "نادر جنگ" کے قتل کے ارادے والے سین کا مصنوعی خنجر جو سنگھار میز پر رکھا تھا اٹھایا۔

فرش پر پڑی مخلوق برقعے میں الجھی ہاتھ پاؤں چلا کر آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ملکہ مہر" نے کڑک کر پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ـــ للو ـــ" برقعے میں سے ایک کم سن آواز آئی "میڈم! ہم ہیں ـــ للو جی ـــ ہمیں نکالئے ـــ ہمارا دم گھٹا جارہا ہے۔" پھر ہاتھ پاؤں مار کر برقعے میں سے ایک پندرہ سالہ صاحبزادے برآمد ہوئے۔ "ملکہ مہر" کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔ اب بقیہ تینوں کی ہمت بڑھی اور انھوں نے نقاب الٹے۔ تینوں کے رنگ فق۔ ان میں سے ایک نے اسکول کی کتابیں ہاتھ میں بڑی احتیاط سے سنبھال رکھی تھیں۔ جہاندیدہ تجربہ کار تھیٹر والی نے سوچا بھنورے میں پلے شریف زادے۔ ماں باپ سے چھپ کر ناٹک دیکھنے آئے ہیں۔ یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں جو بھی نہ ہو کم ہے۔ کسی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ اس طرح مبہوت کھڑے تھے گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو کہ اتنی مشہور ہیروئن کے ڈریسنگ روم میں موجود ہیں۔

"بیٹھ جاؤ ـــ" ہیروئن نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ چاروں برقعوں سمیت صوفے پر ایک قطار میں بیٹھ گئے۔ "ملکہ مہر" نے خنجر میز پر رکھ کر اتراف روزینہ اپنے اوپر چھڑکا اور اطمینان کی سانس لی۔ پھر اسٹول پر بیٹھ کر پکاری۔ "کندن ـــ حرامزادی ـــ چھنال ـــ کہاں مرگئی؟"

لڑکوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے خوابوں کی ملکہ ــــ نیو الفریڈ کمپنی کی چیف ایکٹریس، صید ہوس کی نامور ادا کار گلنار بائی اٹاوے والی، بھڑبھوجنوں بھٹیارنوں کی طرح گالیاں دے رہی تھی۔

ایک ٹرّی شکل والی عورت کمرے میں گھسی۔ لال لہنگا، نیلا شلوکہ، ہرا دوپٹہ، ناک میں بُلاق، خاصی بندریا۔ مسخ، پھٹکار زدہ صورت۔ گلنار بائی اس پر برس پڑیں ــــ "کلموہی ــــ مال زادی ــــ میں یہاں لُٹ جاؤں۔ ڈکیت آن پڑیں، ٹھگ آن گھسیں۔ کھیل ختم ہوا نہیں اور تم سب چرس کا دم لگانے بیٹھ گئے۔ دروازہ کس نے کھلا چھوڑا؟ ــــ ارے یہ تو خیر اسکول کے چھوکرے نکلے۔ چور بدمعاش اچکے ہوتے تو؟ ــــ اور منڈوے کے چوکیدار سب انفلوئنزا میں مر گئے کیا ــــ؟ منوا کبھسم ہو گیا ــــ؟ اس کی گور میں کیڑے پڑیں۔ ڈھائی گھڑی کی آئی۔ مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو ــــ"

کندن نے جلدی سے بید مشک پیش کیا۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا گھنگھریالے بالوں والا لڑکا جو شکل سے گلنار کا بھائی معلوم ہوتا تھا اندر آیا ــــ "باجی ــــ باجی ــــ کیا ہوا ــــ؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"منوا کے بچے ــــ حرام زادے ــــ بھڑوے ــــ دروازہ تو کھلا چھوڑ گیا تھا؟"

چاروں برقعہ پوش بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ جگہ تو بھنگڑ خانہ نکلی اور مس گلنار کیبھائی۔

"بیٹھ جائیے آپ لوگ ــــ" گلنار نے گرج کر کہا۔ "جاتے کہاں ہیں۔ اپنا پتہ نشان بتا کر جائیے۔ پوچھ تاچھ کے لئے کل کلاں آپ کے باوا آ کر میرے سر پر سوار ہوئے تو ان کو کیا جواب دوں گی۔ او کندنیا ــــ بابا لوگ کے لئے سوڈا لیمن لا۔"

"باجی! ایسٹن جی کو بلاؤں ــــ؟" منوا نے مستعدی سے دریافت کیا۔ وہ لال لال آنکھوں سے برقعہ پوش لڑکوں کو گھور رہا تھا۔

"بھاگ جا بے ــــ حرام کی اولاد ــــ" گلنار نے بالوں کا نقرئی برش اس کی طرف

غصے سے پھینکا۔" دروازے پر بیٹھ جاکر اپنے اسٹول پر۔ کوئی ان بچوں کو ڈھونڈتا آئے تو مجھے اطلاع کرنا۔"

"بہت اچھا باجی ـــــ" منوا سر جھکائے جاکر باہر اپنی ڈیوٹی پر بیٹھ گیا۔ کندن نے نیلے پھولدار گلاسوں میں سوڈالیمن لڑکوں کو پیش کیا۔

"باہر جاؤ ـــ" گلنار نے حکم دیا۔

کندن بلاق کے نیچے مسکراتی لہنگا پھڑکاتی گلیارے میں چلی گئی۔ گلنار نے کواڑ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔

کندن کوریڈور میں نکلی۔ پھسکڑا مار کے منوا کے اسٹول کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ شلوکے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ ایک خود سلگائی۔ دوسری منوا کو دی۔ پھر گلے میں لٹکے چاندی کے خلال سے دانت کریدتے ہوئے بولی ـــ" اب کے بہت ننھے منے مرغے پھنسے ہیں۔ کسی کی مونچھوں کا کونڈا بھی نہیں ہوا اب لگ۔ لکھنؤ کے نابالغ نواب زادے ـــ برقعے اوڑھ کر گلو سے ملنے آئے ـــ کھی کھی کھی ـــ قہ ـــ قہ ـــ قہ۔"

ڈریسنگ روم کے اندر گلنار بائی عرف گلو جان کو دروازے کی چٹخنی لگاتے دیکھ کر وہ چاروں لڑکے بالکل حواس باختہ ہو چکے تھے۔ بار بار دل میں کہہ رہے تھے۔ برے پھنسے بہت برے پھنسے۔ اور سب اپنے اپنے بزرگوں کے ہاتھوں بید سے پٹنے کا تصور کرنے میں کھوئے بیٹھے تھے۔

اتنے میں ایک جادوگرنی نما ادھیڑ عورت اندرونی دروازے سے کمرے میں آئی۔

"اب یہ بڑھیا ہمیں مکھیاں یا بکرے بنادے گی۔" ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

جادوگرنی گلنار بائی اور منوا کی ہم شکل تھی۔ گھنگریالے کھچڑی بال بڑی بڑی آم کی پھانکوں

جیسی آنکھوں میں کاجل۔ ناک میں ہیرے کی لونگ۔ دائیں بازو پر تعویذ۔ چھینٹ کی اٹنگی ساری۔ پاؤں میں سلیپر۔ عجب قطع تھی۔ اس نے چیل کی سی نظروں سے لڑکوں کو گھورا۔ اور بولی "اس منوا کے نیچے کو تو بیسے پر رکھ کر ماروں۔"

"آپا تم ذرا باہر جاؤ۔ ابھی بلاتی ہوں۔" گلنار نے کہا۔ عجوزہ نامعقول یہ سنتے ہی فوراً غائب ہوگئی۔ گلنار اپنے زیور اتارتی گئی اور لڑکوں سے مخاطب ہوئی۔

"اب فرمائیے۔ آپ کا اسم شریف؟ اس نے سب سے بڑے لڑکے سے پوچھا جس نے وقار کے ساتھ جواب دیا۔" بندے کو برج بہاری لعل ماتھر کہتے ہیں۔"

"بتو ___ بتو کہلاتے ہیں ___" بیوقوف للو نے فوراً کرکری کر دی۔ اور بولے "ہم گھنشیام داس رستوگی عرف للو ___ اور یہ ننھے ___ اور یہ ہمارے شجو بھیا ___"

"سید شجاعت حسین تعلقدار کریم پور ضلع ہردوئی۔" بتو نے سلسلۂ تعارف دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے کر متانت سے کہا۔

گلنار فوراً تاڑ گئی۔ یہ بھولے بھالے شجو میاں باپ کی جواں مرگی کی وجہ سے تعلقدار ہو چکے ہیں۔ یہ تینوں ان کے مصاحبین ہیں۔

"آپ کے قانونی سرپرست کون ہیں؟" گلنار نے شجو سے دریافت کیا۔

شجو نے سراسیمہ امداد طلب نظروں سے بتو جی کو دیکھا۔

"ماموں ___ سید رفاقت حسین۔ بیرسٹر۔ تعلقدار بارہ بنکی۔ آج کل چھتا مل والوں کے مقدمے کے لئے دلی گئے ہوئے ہیں۔" بتو جی نے بتایا۔

"اوہو ___ بیرسٹر صاحب کا تو ہم نے نام سنا ہے۔ اخبار میں فوٹو بھی دیکھے ہیں۔ اچھا تو وہ شہر میں موجود نہیں۔ اسی لئے آپ لوگ ناٹک دیکھنے چلے آئے۔ یہ برقعے اوڑھنے کی ترکیب کس نے سجھائی ___؟" گلنار نے دفعتاً ہنس کر خوش خلقی سے پوچھا۔

"ہم نے رازِ عشق در خفیہ پولیس عرف گنجینۂ سراغرسانی کتاب میں پڑھا تھا ___" للو جی

نے ارشاد کیا۔
"اور آپ کے والد ——؟" گلنار نے بتو جی سے پوچھا جو چاروں لڑکوں میں سب سے تیز فہم اور ہوشیار معلوم ہوتے تھے۔
"ہمارے والد —— مسٹر کنج بہاری لعل ماتھر۔ بیرسٹر ایٹ لا۔"
"ماشاء اللہ۔ اور آپ ——؟" تیسرے لڑکے سے پوچھا۔ وہ گھبرایا ہوا چپ بیٹھا رہا۔
بتو نے پھر کہا: "ان کا نام ننھے ہے۔ ان کے فادر شیخ رشید احمد اودھ پنچ اخبار میں کام کرتے ہیں۔"
"یہ ——؟"
اس نے للو کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔
بتو نے جواب دیا: "للو کے فادر رفاقت حسین چاچا کے رشتو گی ہیں گے۔"
گلنار نے سوالیہ نگاہوں سے بتو جی کو دیکھا۔ وہ لکھنؤ پہلی مرتبہ آئی تھی۔
"ہمارے پتا جی جو ہیں ——" للو نے بڑے وقار کے ساتھ تشریح کی: "وہ رفاقت حسین صاحب کے علاقے کے منیجر ہیں۔"
"اسکول جاتے ہو؟"
"جی ہاں ——" بتو بولے۔ "ہم لا مارٹینیئر میں ہیں۔ شبو کالون تعلقدارز اسکول میں اور ننھے امیر الدولہ جاتے ہیں۔"
گلنار نے دوبارہ للو اور ننھے پر نظر ڈالی۔ دونوں مسکین سے بچے شبو میاں اور بتو جی سے کم حیثیت معلوم ہوتے تھے۔
"یہاں کیسے آئے؟"
"گھر کی بگھی ہے۔" للو جی نے جواب دیا۔
"نہیں۔ میرا مطلب ہے اسٹیج کے پیچھے کیسے آ نکلے؟" گلنار نے پاندان اپنی طرف سرکا کر پوچھا۔

"باہر جانے کے لئے خفیہ راستہ ڈھونڈھ رہے تھے ۔ سراغرسانی کی کتاب میں پڑھا تھا۔" للو جی نے فرمایا۔

"ہم امی جان کی اجازت بے آئے ہیں ۔" شجو نے جی کڑا کر کے پہلی بار بات کی۔ "برقع اس لئے اوڑھے کہ یہاں ہمارے ماموں میاں یا ماتھر چاچا کا کوئی جان پہچان والا نہ دیکھ لے۔ اور ہمیں گھر لے جانے کے لیے ہمارے آدمی آویں گے ۔ وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوں گے ۔ اجازت دیجیے ۔"

گلنار کو اب لطف آرہا تھا۔ کہنے لگی ۔" بیٹھو میاں ۔ گھبراؤ نہیں ۔ میں نے کہہ دیا ہے ۔ تمھارے آدمی سیدھے یہاں پہنچا دیے جائیں گے ۔ پان کھاتے ہو؟"

انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"سگریٹ تو پینا نہیں شروع کیا ــــ؟ مت پینا۔ بری عادت ہے ۔"

لڑکے حیران و پریشان گلنار بائی کی صورت دیکھا کیے ۔ یہی بی صاحب چند منٹ پہلے اپنے لواحقین کو گالی کوسنوں سے نوازتی کتنی بازاری اور لچر معلوم ہو رہی تھیں ۔ پل کی پل میں دوسرا ماسک پہن لیا ۔ خوش اخلاق ۔ مہذب ۔ شفیق ۔ ان کم عمر لڑکوں کو ابھی تجربہ نہ ہوا تھا کہ انسان کی شخصیت کے کتنے پہلو ہوتے ہیں ۔ ایک آدمی کے اندر کتنی مختلف اور متضاد ہستیاں چھپی رہتی ہیں اور بعض لوگ موقع و محل کے لحاظ سے کس طرح اپنا رنگ بدلتے ہیں ۔ گلنار بائی کی اصلیت کیا تھی ــــ؟ بازاری یا شریف ــــ؟ غالباً دونوں ــــ اور یہ بات شاید خود اسے معلوم نہ تھی ۔

بڑی نفاست سے پان کی گلوریاں بناتے بناتے اس کی نظر ان کاپیوں پر پڑی جو للو احتیاط سے سنبھالے بیٹھے تھے ۔ اس نے دریافت کیا ۔" اسکول سے سیدھے یہاں آرہے ہو؟"

"جی نہیں ــــ ہم اور شجو بھیا جو مکالمے اور گانے اچھے لگتے ہیں ان کو لکھ لیتے ہیں ۔" للو نے جواب دیا ۔ اور سنگھار میز پر رکھے مصنوعی خنجر کو بڑی عقیدت سے دیکھا جو گلنا نے فوراً

اٹھاکر انھیں دے دیا۔

للّو اور شجو بڑے انہماک سے اسے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔

"اے چھُری اچھی چھُری دے ساتھ گر تو ساتھ ہے ـــــ میں بھی عورت ذات ہوں اور تو بھی عورت ذات ہے ـــــ" شجو نے دہرایا پھر فوراً جھینپ گئے۔

"سبحان اللہ ـــ خوب حافظہ ہے" گلنار نے تعریف کی "تھیٹر میں کام کرنے کو جی چاہتا ہے ؟"

"جی ہاں"

"ناممکن غلط بات ہے" بنّو نے جو عمر میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے اس وقت خود کو ان احمق چھوکروں کا گارجین سمجھ رہے تھے جھنجھلا کر کہا۔

گلنار ذرا برا مان گئی "کیوں۔ بنگال میں بڑے بڑے رئیس زادے ناٹک میں کام کرتے ہیں" اس نے کہا۔

"بنگال کی بات بنگالی بابو جانیں۔ ہمیں ان سے کیا غرض" بنّو نے جواب دیا۔

"آپ کی طرف کے بھی ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ حافظ عبداللہ۔ انھوں نے اپنی کمپنی قائم کی ہے۔ خود ایکٹنگ کرتے ہیں اور کتنے شریف زادوں کے نام گنا دوں ؟"

"جی ہاں۔ ان کے ماما کو یہی تو فکر ہے کہ یہ حضرت بھی اسی رنگ میں نہ رنگ جاویں" گلنار کی ہمت افزائی کی وجہ سے شجو اب خود کو بہت دلیر محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے بنّو جی کو نظر انداز کرکے ایکٹرس سے کہا "ہم تو آغا صاحب کے سارے ناٹک پہلے کتاب میں پڑھ لیتے ہیں۔ صید ہوس کا تو ہمیں ایک پورا سین زبانی یاد ہے۔ سنئے گا ؟"

"ضرور۔ ضرور ـــــ" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاکر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

شجو میاں اٹھے۔ کھنکارے اور ہاتھ لہرا کر آغاز کیا "جب قید خانے میں بچہ شہزادہ کہتا ہے ـــ نہیں ـــ نہیں ـــ قزل مجھے بند مت کرو نہیں۔ میں شور نہیں کروں گا۔ بھیڑ کی طرح بیٹھا

رہوں گا۔ قزل بولا۔ خاموش۔ شہزادہ قیصر بولا۔ میں ہلوں گا بھی نہیں ۔غریب گائے کی طرح شور بھی نہیں کروں گا۔ اور لوہے کی طرف غصے سے بھی نہ دیکھوں گا۔ تم جو دکھ دو گے معاف کردوں گا۔ پھر بولا۔ پھر بولا ـــــ دیکھو۔ میری بے گناہ آنکھوں کو روتا دیکھ کر لوہا بھی ٹھنڈا ہوگیا۔ قزل بولا ـــــ میں اسے پھر گرم کروں گا۔"

کمسن شہزادے کی ٹریجڈی یاد کرکے شجو، للو، ننھے تینوں بہت ملول ہوگئے۔ گلنار بڑی انسیت سے ان کے بھولے چہروں کے تاثرات دیکھا کی۔ اسے ایسے سیدھے سادے بے غرض مداحوں سے آج تک سابقہ نہ پڑا تھا۔

دروازے پر دستک ۔ اس نے اٹھ کر چٹخنی کھولی ۔ مسٹر رستم جی پسٹن جی مینجر نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کی طویل ناک ظاہر ہوئی ۔ پھر پورا چہرہ ۔ پھر خود۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک ایرانی ٹوپی۔ کھچڑی مونچھیں ۔ ٹوٹی عینک ۔ سیاہ شیروانی ۔ دوسری دوپلی ٹوپی ۔ سفید مونچھیں۔ دھاگے سے بندھی عینک ۔ سفید انگرکھا۔ دائیں ہاتھ میں لپٹی تسبیح عقیق ۔ انگلیوں میں فیروزے کی نقرئی انگوٹھیاں ۔ گلنار نے دونوں حضرات کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ واقعی لکھنؤ کو جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا۔ ایک سے ایک زنگار رنگ افسانوی کیریکٹر۔

"ینگ راجہ صاحب آف کریم پور کا اے۔ ڈی۔ سی۔" پسٹن جی نے مرعوب آواز میں گلنار کو مطلع کیا۔" ان کو گھر لے جانا مانگتا۔"

اس اثنا میں جادوگرنی نما بڑھیا کمرے میں آکر مونڈھے پر بیٹھ چکی تھی ۔ راجہ صاحب کریم پور کا نام سنتے ہی مارے ادب کے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ وہ زمانہ گذرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جب وہ خود اور اس کی بہنیں، بھانجیاں نوابوں کے سامنے کھڑے کھڑے گانا سناتی تھیں ۔ انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی ۔ گلنار بھی متاثر نظر آئی ۔ تو یہ شجو میاں چھوٹے موٹے زمیندار نہ تھے باقاعدہ راجہ صاحب تھے ۔ اس خاندان کے مردوں سے راہ و رسم پیدا کرنا ضروری ہے۔

دونوں" اے۔ ڈی۔ سی" کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ ایرانی ٹوپی والے نے بڑی بی پر نظر ڈال کر

دو پلی ٹوپی والے سے سرگوشی کی۔ "اوہو۔ یہ تو گلنار بائی کی والدہ ہیں۔ گلزار بائی۔ یہ بھی اپنے زمانے کی نامی ایکٹریس تھیں۔ ہم ان کے ناٹک دیکھ چکے ہیں۔ یہ بہت قدیم ہیں۔"

گلنار نے پان کی نقرئی تھالی پیش کی۔ کمرے میں مودب خاموشی طاری تھی۔ ببّو جی نے سوچا۔ یہ اے۔ ڈی۔ سی۔ کی ایک ہی رہی۔ یہ لطیفہ میر حقّہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ببّو نے دوپلی ٹوپی اور انگرکھے والے بزرگ کا تعارف گلنار سے کرایا —— "میر ناصر رضا صفوی ——"

گلنار نے جھک کر تسلیم عرض کی۔

مرزا عباس قلی بیگ قزلباش ایرانی ٹوپی والے کا نام تھا۔ گلنار کورنش بجا لائی۔

مرزا عباس قلی بیگ قزلباش —— میر ناصر رضا صفوی —— کیا شاندار شاہانہ نام تھے مگر دونوں دھان پان مسکین رنجیدہ صورت۔ خستہ حال۔

"اور بائی صاحب ہمارے القاب بھی سن لیجئے۔ مرزا گُڑگُڑی اور میر حُقّہ ——" ایرانی ٹوپی والے نے کہا۔ گلنار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ذرا بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوا۔ گلنار سمیت تمام حاضرین محفل کو علم نہ تھا کہ مرزا عباس قلی بیگ عرف مرزا گڑگڑی اور میر ناصر رضا صفوی عرف میر حُقّہ، دونوں صاحبان ایران و ہند کے بالکل آغا حشر کی سی گھن گرج والے ماضی کی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔ گلنار بائی جو اپنے طبقے اور اپنے ماحول کے لحاظ سے بہت ذہین اور حساس لڑکی تھی کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ تھیٹر ہال یا منڈوے کی اسٹیج تو خیر ہئی —— جس میں مشینوں کے ذریعے پریاں اوپر سے آتاری جاتی ہیں۔ برقی روشنی طرح طرح کے تاثر پیدا کرتی ہے۔ رنگ برنگی "شاہی" پوشاکوں سے طلسم باندھا جاتا ہے۔ مگر دنیا کا منڈوا اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ انگریزی داں پارسی ایکٹر ماسٹر بہرام فیروز نے ایک مرتبہ اسے بتایا تھا کہ ولایت والا شیکسپیئر جس کے ڈراموں کے اردو چربے ہم لوگ پیش کرتے ہیں یہی بات بہت پہلے کہہ گیا ہے۔

گلنار بائی، ماسٹر فیروز، پسٹن جی کے ہزارہا شائقین اور تماشائی، سارا ہندوستان جنّت نشان، اردو پارسی تھیٹر کی مانند ایک ANOCHRONISTIC تماشا تھا اور زمان و مکاں کی قیود

سے آزاد۔ جس طرح پارسی اسٹیج پہ ہریش چندر، نل دمینتی اور چندراولی، غزلیں اور رستم وسہراب، شیریں وفرہاد ہندی بھجن گاتے تھے۔ عہد چنگیز خاں میں جنگ ٹرانسوال کا ذکر ہوتا تھا اور "عرب وعجم" اور "ہند قدیم" کے مسخرے کردار وکٹورین میوزک ہال کی مقبول دھنوں پہ باندھی ہوئی "چیزیں" الاپ کر ادھم مچاتے تھے۔ ہندوستانی مزاج زمان ومکاں کی قیود سے بے نیاز و آزاد ہر تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لئے تیار تھا۔ قدیم سنسکرت رنگ بھوم کے قوانین مسخروں کے ذیلی پلاٹ، نوٹنکی کے مانند گانوں کی فراوانی۔ ایران وتوران کے EPICS کی شان وشوکت، STYLISED اداکاری اور وکٹورین میلوڈراما کا یہ معجون مرکب جو اردو تھیٹر کہلاتا تھا پچھلے ساٹھ ستر برس سے کولونیل ہندوستان کے خواص وعوام کا محبوب ترین سرمایۂ تفریح تھا۔ اور اسی اردو پارسی تھیٹر کے سارے لوازم اور خصوصیات آج کے پچاس سال بعد تک کی ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اسی طرح دائم وقائم رہنے والی تھیں۔ کیوں کہ ہندوستان زمان، ومکاں کی قیود سے آزاد تھا۔

آج اس وقت، گلابی جاڑوں کی اس خوشگوار رات رستم وسہراب کی ذرا مضحکہ خیز ٹریجک نسلی یادگار بے چارے گجراتی پارسی رستم جی پسٹن جی جو جام جمشید کی تلچھٹ کی بھی تلچھٹ کی ایک بوند تھے، جب بے چارے شجو کو بڑے شیکسپیرین انداز میں "گڈ نائٹ ینگ پرنس" کہہ کر باہر گئے تو فیوڈل عیش پرستی کی یادگار گلزار بائی نے دل میں سوچا —— لکھنؤ میں دوسری ہی رات ایک نوابی خاندان سے گلّو کی ملاقات —— نیک شگون ہے —— انھوں نے بیٹی کا نقلی تاج بازوبند اور چندن ہار سمیٹ کر الماری کا پردہ سرکایا۔ اس میں نقلی تلواروں کا ڈھیر کونے میں رکھا تھا۔ لڑکے بڑی دلچسپی سے انھیں دیکھنے لگے۔

"بھیّا اب گھر چلئے" میر حُقّہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے اٹھتے ہی سب فوراً کھڑے ہو گئے۔ گلزار و گلنار سمجھ گئیں —— شجو میاں کے ذاتی عملے کی اہم ترین ہستی یہی ہیں۔

"یہ تلوار تو ماسٹر اختر آفندی چلا رہے تھے" شجو ایک تلوار تبرک کے مانند چھو کر بولے۔

"میر صاحب" گلنار نے میر حُقّہ سے کہا "اگر مناسب سمجھیں تو صاحبزادے کو تھوڑی

دیر کے لیے کل تیسرے پہر ہمارے ہوٹل لے آئیں۔ انھیں ماسٹر اختر آفندی اور ماسٹر بہرام فیروز دونوں سے ملوادیں گے ۔۔۔"

"اختر آفندی اور بہرام فیروز ۔۔۔؟" لڑکوں نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔

۲۔ پام کورٹ ہوٹل

امین آباد کی ایک معقول مہمان سرائے تھی جس میں بیرونجات کے شرفا۔ اور وہ متمول قدامت پسند ہندوستانی جنٹلمین جو برلنگٹن میں انگریزوں کی موجودگی سے گھبراتے تھے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ کشادہ ہوادار کمرے، چپس کے فرش، چینی کے گملوں میں پام کے سرسبز پودے۔ مرغن لکھنوی کھانا۔ نیو الفریڈ کا سینئر اسٹاف یہاں مقیم تھا۔ اس وقت سب گلنار کے کمرے میں جمع تھے۔ سنگ مرمر کے وسطی میز پر نیلے بلوری گلدان میں گلاب کے پھول مہک رہے تھے۔ ایک گوشے میں پیڈل سے چلانے والا فولڈنگ ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف چاندنی بچھی تھی جس پر گلزار بائی کے بیٹے اور گلنار کے برادر خورد منّو عطا محمد ہیٹی ماسٹر کے ساتھ بیٹھے پیالیوں سے طشتریوں میں انڈیل کر چائے نوش کر رہے تھے۔ منشی افسوس (جو مکالمے یاد کرواتے تھے) دیوار سے ٹیک لگائے مطبع نولکشور کا تازہ ترین ناول "چابک سوار معشوقہ" پڑھنے میں محو تھے۔ سفید تنگ پاجامے، کرتے، دوپٹے میں ملبوس گلنار مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کروشیا بُن رہی تھی اور گھریلو لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسی شریف صورت لڑکی اتنی بیہودہ گالیاں بھی بکتی ہے۔ چاروں لڑکوں نے ایک بار پھر تعجب سے سوچا۔

ماسٹر اختر آفندی بید کی کرسی پر ترچھے لیٹے بیڑی پی رہے تھے۔ ان کے نزدیک بیٹھے مرزا گڑگڑی نے منشی افسوس سے بڑی جانکاری کے لہجے میں دریافت کیا "آغا حشر صاحب کمپنی کے ساتھ تشریف نہیں لائے؟"

منشی افسوس نے کان کی لو چھوئی اور جواب دیا "جی نہیں۔ آج کل کلکتے میں تشریف

رکھتے ہیں۔"

مرزا گُرگُرّی دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ چاروں لڑکے مع میر حُقّہ چاندنی پر بیٹھے گلزار بائی کی تھپے دار گفتگو سننے میں مصروف تھے۔ گلزار بائی کی شخصیت بھی آج بالکل مختلف معلوم ہو رہی تھی۔ کل جادوگرنی لگ رہی تھیں۔ آج انھوں نے سفید چوڑی دار پاجامہ ٹہرے کا کرتا اس پر مخملیں صدری، ہلکا آبی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ بال بھی قاعدے سے سمیٹے تھے۔ تعویذ بازو سے اتار کر چوٹی میں لٹکا لیے تھے۔ چوہے دتیاں، ہیکل اور بالی پتے پہنے بالکل گلابو شتابو بنی بیٹھی تھیں۔ چار کی کشتیاں اور کیک پیسٹری، دال موٹھ، سموسے اور بنگالی مٹھائی کی پلیٹیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ایک پیسٹری منھ میں رکھ کر جبڑے چلاتی رہیں۔
" اے بیٹا ہم تو اٹاوے کے ڈیرے دار ہیں۔" انھوں نے اس انداز سے کہا گویا اٹاوے کی صوبیدار ہیں۔ پھر دال موٹھ پھانکی۔ بہت پیٹو تھیں اور مستقل کھا رہی تھیں۔

گلنار نے کروشیا سے بیٹی کوٹ کی چوڑی لیس بنتے بنتے نگاہ اٹھا کر حاضرینِ جلسہ کو دیکھا۔ اسے میر حقہ پسند نہیں آئے تھے۔ اکھل کھرے، جلی کٹی باتیں کرنے والے، بگڑے دل۔ جانے کون سا تخت و تاج چھوڑ کر آئے ہیں جو یہ دماغ ہیں۔ مرزا گرگُرّی البتہ دل چلے شوقین مزاج آدمی تھے۔ اب وہ گلنار بائی سے کہہ رہے تھے :

" بی صاحب ہم نے تو سن اٹھارہ سے پچانوے میں آپ کا ناٹک نل و دمن دیکھا تھا اسی لکھنؤ کے اندر۔"

بائی صاحب کو اپنا اس طرح DATED ہونا پسند نہ آیا۔ ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔
" میں تو بارہ سال کی عمر میں وکٹوریہ ناٹک کمپنی کی ہیروئن بن گئی تھی۔ خورشید بالی والا کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔"

خورشید بالی والا کے نام پر ماسٹر اختر آفندی نے اپنے کان کی لو چھوئی۔
" پھر اپنی طرف کی لائٹ آف انڈیا تھیٹر کمپنی میں کام کیا۔"

"وہی آگرے والی کمپنی جس کے مینجر حافظ عبداللہ تھے ؟" مرزا گُرگُرگُڑی نے پوچھا۔ ان کی معلومات قابل رشک تھیں ۔

"ان حضرت نے کلام پاک حفظ کرنے کے بعد اچھا کام کیا" میر حقہ بڑبڑائے ۔

"سارے انڈیا کا دورہ کر چکی ہوں ۔ رنگون تلک ہو آئی" گلزار بائی کہتی رہیں ۔

"آپ کا وہ گانا ___ جب دمینتی جنگل میں گاتی ہے ___ آہاہا ___ ہمیں اب تلک یاد ہے ۔ ہم کا چھاڑ چلے مہاراجہ ایسے اجاڑ بن میں ___" مرزا گُرگُرگُڑی نے سر ہلایا ۔

گلزار بائی نے ابروسے بیٹی ماسٹر کو اشارہ کیا ۔ وہ ہارمونیم پر تیز تیز انگلیاں چلانے لگے ۔ منّو نے بایاں ہتھوڑی سے ٹھونکنا شروع کیا ۔ گلزار بائی نے بیٹے سے کہا "تال پشتو" پھر سامعین کو مخاطب کیا "نل ودمن کی ایک غزل پیش خدمت ہے"

اب انھوں نے ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر گانا شروع کیا ۔

"ارے ہجر کی آگ سے گھر دل کا مرے خاک ہوا ___ ایسا بے لاگ جلا لگ گئی آکے مجھے عشق صنم کی جو ہوا ___ کیا لگے کوئی دوا ___"

مرزا گُرگُرگُڑی نے ہر شعر پر جھوم جھوم کر داد دی ۔ گانے کے بعد گلزار بائی نے کہا "پنڈت جی ___ طالب بنارسی"

منشی افسوس نے پھر دائیں کان کی لو چھوئی ۔

بتو جی نے پوچھا "آپ کی والدہ بھی ایکٹریس تھیں ؟"

"نہیں میرے لعل ___ میں تو ہو کی اولاد ہوں"

"جی ___ ؟" للّو جی نے تشریح چاہی ۔

"اماں ہماری ___ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ سات پردوں میں رہتی تھیں ۔ دادی مشہور گائیکا تھیں ۔ غدر سے پہلے توڈھاکے تلک بلوائی گئی تھیں ۔ وہاں انھوں نے "بلبلِ بیمار" میں کام کیا"

"سولیشت سے ہے پیشہ ـــــ" میر حقّہ بولے۔ گلزار بائی نے جو چار کے بجائے وسکی نوش جان کر رہی تھیں ایک گلاس میر صاحب کو پیش کیا۔

انھوں نے تنک کر کہا "بی گلزار صاحب ہم نے تو آج تک اس شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"نہیں لگایا تو بُرا کیا ـــــ" وہ دوبارہ دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ کی خلد آشیانی جنت مکانی عصمت مآب مادر گرامی ہمیشہ پس پردہ چراغ خانہ رہیں؟" بنّو جی نے دریافت کیا۔ کایستھ بچے تھے۔

"اے بیٹا ہماری برادری کا یہی قانون ہے۔ ہماری بہوئیں پردے میں رہیں ہیں، ہم اصل نسل ڈیرے دار ہیں، سنا ہے ہماری سگڑ دادی میران پور کڑے کی لڑائی پر گئی تھیں"۔

لڑکوں نے تعجب سے انھیں دیکھا۔

"اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آپ کی سگڑ دادی جنگ میران پور کڑہ میں کام آئی تھیں؟ کس کی طرف سے؟" میر حقہ نے تجاہل عارفانہ سے استفسار کیا "وارن ہیسٹنگز؟ شجاع الدولہ؟ ـــ حافظ رحمت خاں ـــــ؟"

گلزار بائی نے اب انھیں نظر انداز کر دیا۔ لڑکوں سے مخاطب رہیں "میاں ہمارے ڈیرے چلتے تھے نوابوں کے لشکر کے ساتھ۔ میدانِ جنگ میں نواب کا لعل خیمہ۔ جرنیلوں امیروں وزیروں کے خیمے ـــــ پھر ہمارے ـــــ"

شجّو نے معصومیت سے دریافت کیا:

"تو آپ لوگ جنگ میں جاکر لڑتی تھیں؟"

ان کے مشیر خاص بنّو جی نے کان میں کہا:

"اماں گھاس کھا گئے ہو۔ چپ رہو۔ ابھی جرمن کی لڑائی سے ہمارے ڈاکٹر جیجا جی لوٹے ہیں۔ وہ پاپا کو بتا رہے تھے کہ ولایت میں بھی CAMP FOLLOWERS ہوتی ہیں!"

"میم لوگ بھی ــــــ پتریا ہوت ہیں ؟" للّو زور سے بول پڑے۔ اسی وقت ماسٹر فیروز کمرے میں داخل ہوئے۔ سفید برجس، اودا دھاری دار کوٹ، گلے میں سرخ رومال گل مچھے، سرخ ہم کمیں۔ بہرام فیروز بڑی گھن گرج والے رول ادا کرتے تھے مگر اصلیت میں ان کا لب و لہجہ اور اندازِ گفتگو انتہائی پارسی تھا۔ لڑکوں نے حیرت سے ان کی اڑنگ بڑنگ بمبئیا اردو سنی۔ چند منٹ بعد باہر چلے گئے۔ منشی افسوس نے مرزا گڑگڑی کو بتایا "پہلے یہ بے نظیر مون لائٹ آف انڈیا تھیٹر کمپنی میں تھے۔"

ہم بنائیں گے بے تدبیر سن لائٹ سوپ آف انڈیا تھیٹر کمپنی۔ میر محقہ نے سوچا اور دو زانو بیٹھے منظر کا مطالعہ کیا کیے۔ میر ناصر رضا صفوی کی قسمت میں منشی گیری لکھی تھی ورنہ اودھ پنچ کے کالم نویس ہوتے۔ میر صفوی اور مرزا قزلباش عرف گڑگڑی دونوں بیرسٹر رفاقت حسین کے کلرک تھے۔

"ارے صاحب۔ ہم تو آپ کے ناچ کی تعریف نتوا بجوا سے سن چکے ہیں۔" مرزا گُڑگُڑی نے اب گلنار سے خطاب کیا۔ نتوا بجوا کے نام پہ دونوں ماں بیٹیوں نے اپنے کانوں کی لویں چھوئیں۔ گلزار بائی سموسے کی پلیٹ صاف کرنے میں جُٹ گئیں۔ کمرے میں دفعتاً خاموشی چھا گئی۔ ماسٹر اختر آفندی نے جو بے حد کم سخن تھے ایک اور بیڑی سلگائی۔ گلنار نے مسہری کے پاس میز پر پڑا ایک پرانا پائنیر اخبار اٹھایا۔ ننجو کو اشارے سے بلا کر پچھلے صفحے پر چھپی ایک تصویر دکھائی۔ "یہ تمھارے ماموں کا فوٹو ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"پڑھ کر بتاؤ کیا لکھا ہے؟"

"ماموں میاں نے یہاں ایک جلسے میں تقریر کی تھی اس کا ذکر ہے۔"

"تم ان سے بہت ڈرتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اور ممانی ـــــ وہ نرم مزاج ہیں ؟"

"ممانی ـــــ وہ تو اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔"

"اسکول میں ؟"

"جی ہاں ۔ مولوی صاحب کا۔ جج کرامت حسین کا مدرسہ ۔ وہ ہمارے نانا کے دوست تھے ـــــ ابھی ماموں سے ان کا بیاہ کہاں ہوا ہے ۔ بس منگنی ہوئی ہے ۔ آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہیں۔"

"اور تم ـــــ ؟"

"ہم ساتویں میں ـــــ" ذرا جھینپے ۔

یک لخت گلنار اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی ۔ اور چق کی اوٹ سے امین آباد کی رونق دیکھنے میں محو ہوگئی ۔ کمرے میں محفل جمی رہی ۔ گلزار بائی کو عرصہ دراز کے بعد ایک ٹوٹے پھوٹے ۸۸۸ میسر آئے تھے ۔ انھوں نے مرزا گرگڑائی سے دریافت کیا " مرزا صاحب اور خدمت کروں ـــــ ؟ نل ودمن کی ایک اور غزل سنیے گا ـــــ ؟" سازندوں نے فوراً اپنی اپنی جگہ سنبھالی ۔ گلزار بائی نے بڑی دل دوز آواز میں شروع کیا ـ

ڈھونڈا اسے کہاں کہاں اس کا کہیں پتہ نہیں

آئے گئے یہاں وہاں ہائے وہ گل ملا نہیں

گلنار کی جھلک دیکھ کر ہوٹل کے نیچے بھیڑ اکٹھی ہوگئی ۔ وہ بے دماغ ہو کر کمرے میں واپس آئی ۔

ڈھونڈا اسے کہاں کہاں اس کا کہیں پتہ نہیں

اختر آفندی بیڑیاں پھونکتے رہے ۔ میر حُقّہ نے جیب سے زنجیر والی گول گھڑی نکال کر دیکھی اور لڑکوں کو چلنے کا اشارہ کیا ۔ گلنار قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر بال سنوارنے لگی پھر اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنی شکل غور سے دیکھتی رہی ـــــ یہودی کی لڑکی ـــــ اسیرِ حرص

صید ہوس ـــ اور ابھی ایک درخشاں مستقبل سامنے موجود ہے۔

ـــ آئے گئے یہاں وہاں ہائے وہ گل ملا نہیں ـــ والدہ لہک لہک گایا کیں۔

۳۔ طوطے والا بنگلہ

چاروں لڑکے مع میر و مرزا کھلے خزانے باکس میں بیٹھے اسیر حرص ملاحظہ کر رہے تھے۔ انٹرویل میں کمپنی کے ایک لفنڈرے سے کارکن نے آکر مرزا گڑگڑای سے کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ مرزا صاحب تردد سے بولے۔ "تماشے کے بعد پسٹن جی ہم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ جانے کیا بات ہے۔"

"آپ کو مرزا حماقت بیگ کا پارٹ پیش کرتے ہوں گے۔" میر حقّہ نے خشکی سے جواب دیا۔ ڈراپ سین کے بعد جب گلنار بائی کے چھیوں مہمانانِ خصوصی ہیروئن کے ڈریسنگ روم میں سوڈا لیمن اڑا رہے تھے۔ پسٹن جی بوکھلائے ہوئے داخل ہوئے۔ شجو کو دیکھا۔ ہاتھ جوڑے اور کہا۔ "صاحب جی!"

"جی ـــ؟"

"صاحب جی!" ببو نے مسکرا کر جواب دیا۔ ایک ہفتے میں ببو جی خود کو بے حد MAN OF THE WORLD محسوس کرنے لگے تھے۔ شجو رہے وہی گھونچو کے گھونچو۔ پسٹن جی نے چھوٹتے ہی فرمایا۔ "تم نواب لوگ کا لکھنؤ ایک دم کنڈم سالا ـــ"

شجو کے چہرے پر شوک کا اثر بہت نمایاں تھا مگر پسٹن جی کی تقریر جاری رہی۔ "ادھر ہمارا نمبر ون کا بائی کو دیکھو ـــ دیکھو ـــ" انھوں نے ڈپٹ کر دہرایا۔ لڑکوں نے گھبرا کر گلنار پر نظر ڈالی جو نہایت مضمحل اور پژمردہ لگ رہی تھی۔

"انڈین شیکسپیئر کے تین مشاہور پلے کا ہیروئن ـــ کیا ـــ" پسٹن جی نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر کہا ـــ "اب سوچو۔ رات بھر سوچو ـــ دن بھر سوچو ـــ پھر رات بھر سوچو

—— یہ نمبر دن آرٹسٹ جسے بومبے میں بائیسکوپ کا آفر مل چکا ہے، جب یہ ٹھیک سے سلیپ نہیں کر سکیں گا تو کام کیسے کریں گا؟ اکھا دن ہوٹل کے نیچے موالی لوگ بوم مارتا کیا۔؟" انھوں نے پھر منہ اٹھا کر گردن کو جھٹکا دیا۔

"تو برلنگٹن تشریف لے جائیے۔" میر حُقّہ نے نرمی سے کہا۔

"اور دوسرا کھبر سنو —— " پسٹن جی نے مزید فرمایا۔ "باقی کے برابر والے روم میں انفلوئنزا کا کیس ہو گیا۔"

"او ہو —— یہ تو خطرناک بات ہے۔" مرزا گُرُگُڑی بولے۔ "وراً ان کو برلنگٹن پہنچا دیجئے۔"

"پھر ایک اور ہوٹل —— " گلنار نے آزردگی سے کہا۔ "میں ہوٹلوں میں رہتے رہتے تنگ آچکی ہوں۔ کیا ہفتہ دس دن کے لئے ایک کوٹھی کا انتظام نہیں ہو سکتا؟"

"تم ہائی کلاس لوگ ہمارا ہلپ کردنا —— " پسٹن جی بولے۔ "ایک آدھ بنگلو ہی بھاڑے پر مل جائے تو کوئی حرکت نہیں۔"

مرزا گُرُگُڑی نے سوچتے ہوئے اپنی زبردست قزلباش مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے "لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ گورے افسر اور صاحب لوگ لکھنؤ واپس آرہے ہیں اس وجہ سے کوٹھیاں آج کل ذرا مشکل سے ملتی ہیں۔"

"ہمارے کو بھی سب ایسا ہی بولا۔ تبی ہم نے آپ لوگ کو ادھر بلایا۔"

"ہم کل شام تک دو چار لوگوں سے معلوم کر کے آپ کو کہلا دیں گے۔ آپ بھی تلاش جاری رکھیے۔" مرزا گُرُگُڑی نے جواب دیا۔

شجو بنو للو ننھے حسب سابق ایک قطار میں صوفے پر متمکن تھے۔ سامنے کی دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر شجو کی نظر پڑی۔

OCTOBER 14, 1919

ذہن میں ایک خیال کوندا ــــ طوطے والا بنگلہ۔ آج چودہ تاریخ ہے۔ ماموں میاں دلی سے لوٹیں گے ۲۶ کو۔ ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ تینوں بھی سر کھجاتے ہوئے شاید یہی سوچ رہے تھے۔

"تسلیم نواب صاحب" گلزار بائی نے کمرے میں آکر کہا۔

"آداب ــــ" شجو نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ "ہم نواب صاحب نہیں ہیں۔"

"آئے ــــ ہائے ــــ پھر کیا ہو؟"

"ہمارے ہاں کے تعلقدار نواب نہیں کہلاتے ــــ" بتو کو پھر وضاحت کرنی پڑی۔

"اور کیا کہلاتے ہیں ــــ؟"

"بس تعلقہ دار ــــ یا راجہ ــــ ٹھاکر ــــ"

"بہت اچھا بندگی راجہ صاحب ــــ" گلزار بائی نے کہا۔

جب سولہ سالہ راجہ صاحب کریم پور مع احباب ڈریسنگ روم سے نکل کر بگھی کی طرف جا رہے تھے۔ بتو نے ان کے کان میں پھونکا: "اماں وہ تمھارا طوطے والا بنگلہ ــــ کرائے پر اٹھتا ہے کہ نہیں ــــ؟"

"اٹھتا تو ہے ــــ"

"ابھی چار مہینے وہ کرسٹی ڈاکٹرنی اس میں رہ کر گئی ہے کہ نہیں؟"

"تیس روپیہ مہینہ کرایہ دیتی تھی" لالہ گھنشام داس رستوگی عرف للّوجی نے پروفیشنل انداز میں کہا۔ "ہم ایک ہفتہ کا بیس روپیہ طے کروائے لیتے ہیں۔ بلکہ پچیس سے شروع کریں گے۔ گلنار بائی وہاں آجائیں بس روز جاکر گانا سنا کریں گے۔" للّوجی سنگیت کے رسیا تھے۔

"اور ان کی گالی گلوچ اور کوسنے کون سنے گا؟ ــــ بنگلے کو بھٹیار خانہ بنا دیں گی۔" شجو نے ڈھلمل یقین ہو کر کہا۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ ماموں میاں کو واپس آکر پتہ چل گیا تو ہماری بخیہ نہیں ادھیڑ دیں گے۔"

"انھیں پتہ کیسے چلے گا۔ سب معاملات خفیہ ۔۔۔" للو جی نے گنجینۂ سراغ رسانی کے ابواب یاد کرنے شروع کیے۔

میر و مرزا کو پیچھے پیچھے آتا دیکھ کر وہ سب خاموش ہو گئے۔

صبح اسکول جانے سے پہلے شجو دفتر کے کمرے میں گئے جہاں میر حقّہ ایک مسل پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھے۔ شجّو نے فوراً جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔

"میر صاحب ۔۔۔!"

"ہاں۔ بھیّا!"

"یہ۔ گلنار بائی کتنی اچھی ہیں بے چاری!"

میر صاحب نے عینک ماتھے پر سرکا کر ان کو دیکھا اور بولے ۔۔۔ "بھیّا بس آپ کا شوق کافی سے زیادہ پورا ہو گیا۔ دو تماشے دیکھ آئے۔ ان سب لوگوں سے مل لیے۔ اب چلیے۔ اپنی پڑھائی شروع کیجیے۔ اسکول جائیے۔ آپ دو سال سے نویں کلاس میں فیل ہو رہے ہیں!"

یہی رابہ شجاعت حسین کی دکھتی رگ تھی۔ فوراً آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چند لمحوں بعد دل کڑا کر کے مدعا بیان کر ہی دیا۔ "میر صاحب ۔۔۔ گلنار بائی کو بنگلہ میں بلا لیں ۔۔۔؟"

میر حُقّہ چونک اٹھے "بھیّا کیوں اپنی شامت کو پکارتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ یہ نہایت نازیبا بات ہے۔ میاں کو جب معلوم ہو گا ۔۔۔"

"میاں ۔۔۔ میاں ۔۔۔ میاں نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے!" شجو نے یک لخت چلا کر کہا۔

"خاموش ۔۔۔" میر حُقّہ نے گرج کر ڈانٹا۔ شجو بھیا روتے، آنسو بہاتے تیر کی طرح سیدھے ماں کے کمرے میں پہنچے۔ وہ تخت پر بیٹھی کچھ کتر بیونت میں مصروف تھیں۔ جا کر ان کی گود میں سر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگے۔ ماں اکلوتے یتیم نورِ نظر کو اس طرح روتا دیکھ کر

بیتاب ہوگئیں۔ دہل کر بولیں "چاند ـــــ میرے لال ـــــ بھیا ـــــ کیا ہوا ـــــ خیریت ـــــ؟"
شجو اور روئے، جب چند منٹ بعد جی ہلکا ہوا۔ ماں کے دوپٹے سے آنسو خشک کر کے ساری داستان سنائی۔

والدہ خود رونے لگیں۔ پھر ناک سنک کر بولیں "آج تمھارے ابا زندہ ہوتے یا نانا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ تمھاری اتنی سی فرمائش پوری نہ ہوتی۔"

ماں کی یہ حمایت دیکھ کر راجہ صاحب فوراً شیر ہو گئے "امی جان! میر صاحب کو بلا لاؤں؟"

"بلاؤ ـــــ"

میر حقّہ کھنکار کر کمرے میں داخل ہوئے۔ مفلس زخروتن میر صاحب شاہان صفویہ کے خاندان سے تھے۔ ان کا پاس ادب تھا اور عمر میں بہت بڑے تھے ورنہ کوئی اور اہلکار ہوتا رانی صاحب کریم پور اس کی طبیعت صاف کر دیتیں۔

وہی مقدمہ دوبارہ پیش کیا گیا۔ رانی صاحب جو میکے میں بڑی بٹیا کہلاتی تھیں سب سن کر بولیں "میر صاحب ہماری طرف سے اجازت ہے۔ میاں کو ہم سمجھا لیں گے۔"

میر حقّہ نے تعجب سے ان کو دیکھا۔ ممتا ایسا اندھا اور اوندھا جذبہ ہے جس کی حد نہیں۔ میر صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کمرے سے باہر آئے۔ فتح مند و سرخ رو شجو بھیا نے پیچھے پیچھے آ کر پوچھا "ہم پسٹن جی کو کہلوا دیں؟"

میر حقہ برآمدے کے ایک ستون سے ٹک کر بولے "بھیا ذرا یہ تو سوچیے۔ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بیرسٹر صاحب تھیٹر بازی کے شدید مخالف ہیں تو وہ لوگ ادبدا کر انھیں کے مکان میں کیوں آ کے رہیں گی؟"

"ان کو یہ تھوڑا ہی بتائیں گے کہ بنگلہ ہمارا ہے۔ کہہ دیجیے ہمارے پڑوس میں ایک کاٹج خالی ہے۔ ان کو پتہ ہی نہ چلے گا۔ اس کا سب انتظام ہم اور للو کر لیں گے۔ آپ فکر نہ کیجیے۔"

میر حقّہ نے نظریں اٹھا کر تاسف سے صاحبزادے کی شکل دیکھی۔ جاسوسی ناول ـــــ

تعیٹر ـــ بڑے ہوں گے تو عیاشی ـــ

دوسرے روز مس گلنار، گلزار بائی، منوّا اور کندن مہری کا طائفہ مع ساز و سامان دو تانگوں پر سوار بیرسٹر رفاقت حسین کی کوٹھی واقع کلائیڈ روڈ کے عقبی پھاٹک میں داخل ہوا۔ وسیع احاطے کے ایک سرے پر پیونس کی وہ بنگلیہ کھڑی تھی جو کبھی کبھار کرائے پر اٹھا دی جاتی تھی ورنہ گیسٹ ہاؤس کا کام دیتی تھی۔ بنگلے کے صدر دروازے میں تالا پڑا تھا۔ گلنار باہر لان پر کھڑی خوشی سے باغ کا نظارہ کرتی رہی۔ کیسی پرفضا جگہ تھی۔ شجو اور للّو کا سکھایا پڑھایا مالی نمودار ہوا۔ دروازے کا تالا کھولا اور بندگی کر کے غائب ہو گیا۔ وہ سب اندر گئے۔ منوّا نے گول کمرے کی کھڑکیاں کھولیں۔ ہوا کا ایسا فرحت بخش جھونکا اندر آیا گویا جنت کی کھڑکی کھل گئی۔ کپتان جی نے صبح شام کھانا بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اپنی مالکنوں کی خانہ بدوشی کی عادی کندن نے اسٹو جلا کر چار کا پانی رکھا ـــ گلنار کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔ بنگلے کے پچھواڑے پپیتے اور سیتا پھل کے پیڑ لگے تھے۔ اس کے بعد ایک جافری پر مورننگ گلوری کی گھنی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ جافری کے سرے پر بانس کا چھوٹا سا پھاٹک۔ دوسری طرف بہت بڑی سفید رنگ کی کوٹھی۔ مرزا گڑگڑی نے بتلایا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پڑوس ہی میں ہے وہی ہوگی۔ وہ بید کے صوفے پر آ بیٹھی۔ کندن نے گلاس میں "کڑک" چار پیش کی۔ آپا دوسرے کمرے میں چیزیں بھگوا رہی تھیں۔

گلاس بہت گرم تھا۔ اسے نزدیک کے بک شیلف پر رکھ کر گلنار کتابوں کا جائزہ لینے لگی منصور موہنا۔ روز آلیمبرٹ حصہ اول و دوم۔ کلجگ کی کھونٹی عرف بازیچہ اطفال مترجمہ دوارکا پرشاد افق۔ قصہ عمر عیار ـــ اس کتاب کے سرورق پر بچکانی رائیٹنگ میں لکھا تھا سید شجاعت حسین جماعت پنجم۔ کالون تعلقدار ز اسکول لکھنؤ۔ گلنار چونک اٹھی۔ اچھا یہ بات ہے۔ مزید تجسس سے اس نے دوسری کتاب نکالی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھی بھورے

رنگ کے لاسوسائٹی جرنل میں سے ایک پوسٹ کارڈ نیچے گرا ــــ پتہ اردو میں تھا کسی موکل کا خط تھا۔ عالیجناب سید رفاقت حسین صاحب بیرسٹر کو ملے ــــ

گلنار کا سر چکرا گیا۔ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ وہاں دیوار پر وہی تصویر آویزاں تھی جو پرسوں ترسوں پانیر اخبار میں دیکھی تھی۔

اب کیا کروں اس گاؤدی چھٹنکو راجہ نے غضب کیا ــــ کیوں ــــ بے چارے نے اپنی طرف سے تو بھلائی ہی کی ــــ اب واپس کہاں جاؤں ــــ شہر میں انفلوئنزا کی وبا پھیلی جارہی تھی۔ اول تو ہوٹل تھے ہی نہیں جو اکا دکا تھے وہ مخدوش۔ خیر۔ لیسٹن جی خود کوچ کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چند روز کی بات اور ہے۔ ہرچہ بادا باد۔ بہرحال وہ خرد دماغ مولوی بیرسٹر ۲۶ تاریخ کو لوٹے گا اس سے پہلے روانہ۔ اس بھولے بچے شجو نے کم از کم چند روز کے لئے ایک آرام دہ پرسکون ٹھکانے کا بندوبست کر دیا۔ اس نے بیڈروم میں جاکر ماں کو بتایا۔

"ہوں ــــ" وہ کھل اٹھیں۔ "لائے مہاراجہ ہمیں چھل کر کے" کمر پہ ہاتھ رکھ کر گنگنانے لگیں، والدہ محترمہ کے اس قدر شدید بازاری پن سے بعض اوقات گلنار کی جان جل کر رہ جاتی تھی۔ پھر اسے خیال آتا تھا کہ وہ خود بھی گاہے بگاہے اسی قسم کی سستی حرکتیں کرتی ہے اور الجھ کر چپ رہتی تھی۔ والدہ نے فرمایا "گھبرائے کیوں ہے گلو۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی میں تو جب سے اس چھٹنکی راجہ سے ملاقات ہوئی ہے یہی سوچ رہی ہوں کہ نیک شگون ہے۔ پنا کا قصہ بھول گئی۔ اسی طرح نواب نے جاکر اپنے باغ میں اتارا تھا۔ تیرے ہی ماموں کی لڑکی ہے کوئی آسمان سے نہیں اتری۔ نہ سرخاب کے پر لگے ہیں ــــ لوجی ــــ مہینے کے اندر اندر رئیس نے نکاح کر لیا۔ ریاست کی چھوٹی بیگم بن بیٹھی۔ نواب الماس محل صاحبہ خطاب ملا ہے۔"

گلنار کو ہنسی آگئی۔ "آپا بے چارہ شجو بچہ تو مجھ سے نکاح کرنے سے رہا۔"

"اے شجو نہ سہی، کوئی اور رئیس سہی۔ اور نکاح کا ذکر کیا ہے ــــ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ یہ بہت پیسے والی تگڑی پارٹی ہے۔ اودھ کے نواب لوگ ہیں مذاق نہیں ــــ ہماری

طرف کے اجڈ دیہاتی زمیندار نا ہیں۔ ذرا بنگلہ تو دیکھو کیسا سجا رکھا ہے۔ وہ تو جب مالی قلعت کھول کر چپ چاپ لوٹ گیا جبھی میں تاڑ گئی کچھ دال میں کالا ہے۔"

والدہ جس قدر کھاتی تھیں اسی قدر لگاتار بے تکان بولتی تھیں۔ گلنار تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں بھی سب سامان قرینے کا۔ پیتل کی گنگام میں باغ کے کنوئیں سے نکلا تازہ تازہ پانی۔ کرنے میں اینٹوں پر دھرا حمام۔ اس کے نیچے بڑا قلعی دار لوٹا۔ سفید میز پر پھولدار چینی کا جگ، مگا اور چلمچی، نیلے کنارے والا سفید تام لوٹ۔

وہ غسل خانے میں دیر تک نہاتی رہی اور کاہلی سے چڑیوں کی چہکار سنا کی۔ پھر بال سکھانے کی خاطر سبزے پر نکل گئی۔ ہر دئی مالن گھاس کھودتے کھودتے حیرت سے اسے تکنے لگی۔ اتنی سندر نوٹنکی والی۔

امرود سے لدے درختوں پر طوطے بیٹھے تھے اور جافری پر پھیلی مورننگ گلوری کی بیل میں تیز نیلے بگل نما سیکڑوں پھول کھلے ہوئے تھے۔ جافری کے ادھر کوٹھی کی جھلک نظر آئی۔ سفید میلے میلے غرارے پہنے مامائیں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ مرغیاں چرتی چگتی پھر رہی تھیں۔ دور سے بھینسیں ڈکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ کس قدر پرسکون، محفوظ اور مامون جگہ تھی۔

بال سکھا کر ٹہلتی ہوئی وہ بنگلے میں واپس آئی اور کمرے کمرے پھرنے لگی۔ گلابی اور سبز پھولدار ٹائلوں سے مزین سنگھار میزیں، جوال پال، قلعے نما سائیڈ بورڈ، بارہ سنگھے کے سینگوں والا فرنیچر، سیاہ و سفید ٹائلوں پر کشمیری نمدے۔ دیواروں پر انگلستان کی سینری کی رنگین تصویریں جو ولایتی رسالوں سے تراش کر فریم کی گئی تھیں۔ وہ پھر کھڑکی میں جا بیٹھی اور سوچا۔ جب مہمان خانہ اتنا آرام دہ ہے تو گھر کیسا نہ ہوگا۔ پیدائش کے بعد سے ماں کے ساتھ اور پھر خود ہندوستان اور برما کے دوروں پر سرائیوں، خیموں اور ہوٹلوں میں زندگی گزاری تھی۔ بڑی آرزو اور رشک کے ساتھ آنکھیں بند کیں اور تصور کرنے لگی۔ اس سفید کوٹھی کے کمرے اندر سے کیسے ہوں گے۔ اس میں کیسی پردہ نشینیں رہتی ہوں گی۔ محفوظ و مامون اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔

شجّو کی والدہ رانی صاحبہ کریم پور اپنے کمرے میں تخت پر بیٹھی چھوٹے بھائی کی برسی کے لئے اودے فرشی پائجامے کی گوٹ پہ ماہی پشت کا جال بنانے میں مصروف تھیں۔ سارے گھر میں شادی کے انتظام کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ رشتے دار بیویاں اور باندیاں بے طرح مصروف تھیں۔ صبح سے ایک نئی دلچسپی یہ پیدا ہوئی تھی کہ طوطے والے بنگلے میں تھیٹر والیاں آکر اتری تھیں اور وہ بھی خفیہ۔ اس "خفیہ معاملے" میں سب گلے گلے یانی شجّو میاں کے ساتھ تھے کیوں کہ سب بیرسٹر صاحب کی خشک مزاجی سے شاکی تھے۔ اور اب ذرا تفریح کا موقع ملا تھا۔ خود بڑی بٹیا ــــ شجّو کی والدہ ــــ ایک بار پچھلے برآمدے سے جاکر جھانک آئیں جہاں سے طوطے والا بنگلہ نظر آتا تھا۔ باپ اللہ جنت نصیب کرے، اور مرحوم شوہر کے زمانے میں اسی طوطے والے بنگلے میں آئے دن راگ رنگ کی محفلیں جما کرتی تھیں ــــ مشاعرے۔ قوالیاں، ننوا، بجوا اور جانکی باتی یہاں آکر اتر چکی تھیں۔ کون انوکھی بات تھی۔ بے چارہ یتیم بچہ جس کی صورت دیکھ کر جیتی تھیں اور جو ماموں کے سامنے سہما سہما رہتا تھا، اس کی اتنی سی خوشی پوری ہو گئی کون غضب ہوا لیکن صبح سویرے ہی میر حقہ کو حکم دے چکی تھیں کہ بھیا وقت بے وقت بنگلے کی طرف نہ جانے پاویں جب جاویں آپ ساتھ جائیے۔ اب وہ اطمینان سے بیرسٹر صاحب کی برسی کے جوڑوں کی تیاری میں منہمک تھیں۔

گندن گٹّنی، وہ فخر پیشۂ دلالاں، سہ پہر تک شاگرد پیشے کی اصیلیوں میں رل مل کر ساری ٹوہ لے آئی۔ لہنگا گھماتی بنگلہ پر واپس پہنچی۔ گلنار جھپکی لے کر اٹھی تھی۔ گلزار فرش پر بیٹھی آئینہ سامنے رکھے اپنے جھاڑ فانوس بال سنوار رہی تھیں۔

"کہاں مر گئی تھی حرافہ۔ چار بجا"۔ گلنار نے جمائی لے کر کہا۔

"ہو آئی اپنے یاروں میں؟" گلزار بائی نے دریافت فرمایا۔

گندن نے اسٹو سلگاتے ہوئے ساری الف لیلہ سنا دی۔ میاں یعنی بیرسٹر رفاقت حسین کی

زمینداری ضلع بارہ بنکی میں ہے۔ ادھر بڑے سرکار نے ان کو پڑھنے بھیجا بلایت اور ادھر وہ خود اور ان کے داماد شجوؔ کے باپ —— پلیگ میں چٹ پٹ —— شجوؔ دس سال کے تھے۔ ان کا علاقہ کورٹ آف وارڈ نے لیا انتظام کی خاطر —— میاں بلایت سے لوٹے تو کنبے کی ساری ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ وہ بھی ماں باپ کے اکلوتے لڑکے۔ ماں زندہ ہیں۔ یہیں کوٹھی میں رہتی ہیں۔ اور ایک بڑی بہن —— شجوؔ کی والدہ۔ انھیں ان کے علاقے کریم پور سے اپنے پاس بلوا لیا۔ لڑکے کو اسکول میں داخل کرا باپ اور بہنوئی نے خوب رنگ رلیاں منائی تھیں۔ بہت دولت اڑائی۔ ان میاں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ کھیل تماشے، ناچ گانے سے للّھی۔ بس شام کو کلب جا کر گیند بلا کھیل آتے ہیں۔ عید کے چاند بیاہ ہوگا۔ منگیتر خالہ کی لڑکی ہے۔ اس کا قصہ بھی معلوم کر آئی۔ بلایت جاتے وقت خالہ خالو سے کہہ گئے تھے میرے پیچھے لڑکی کو انگریزی نہ پڑھائی تو لندن سے میم کر لاؤں گا۔ اس ڈر سے ان لوگوں نے لڑکی کو اسکول میں ڈال دیا۔ بیرسٹر دبنگ آدمی ہیں ——"

"خیر ——" گلزار بائی نے چوٹی کرتے ہوئے ہونٹ پچکا کر کہا۔" ان میاں جی کا تماشہ بھی ہم دیکھیں گے"۔ اور گلنار پر نظر ڈالی۔ ان ماں بیٹیوں کا ذاتی اور خاندانی تجربہ یہی بتاتا تھا کہ جو مرغا جتنا پارسا ہو سمجھ لو اتنی آسانی سے ہی دام میں پھنسے گا۔ گلزار بائی اس وقت نہ جانے کیا کیا STRATEGIES بنانے میں محو تھیں مگر گلنار کا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر چپکے سے بید مشک پیا اور باغ میں چلی گئی۔

پھر اسے بیرسٹر صاحب کی تصویر تکے جانے کا خبط سا ہو گیا۔ جب موقع ملتا جا کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ ناممکن خواب۔

۴۔ راگ دِل چمن

دوسرے روز صبح شجوؔ مرزا گڑگڑی کے ساتھ بنگلے پر پہنچے۔ سلام دعا کے بعد شجوؔ نے کہا ——
"ہم یہاں نزدیک ہی رہتے ہیں۔ سوچے آپ سے پوچھ آئیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

ان کی اس سادہ دلی پر گلنار کو بے ساختہ ہنسی آ گئی ۔ اس نے جواب دیا "شجو میاں ! وہ رازِ عشق درخفیہ پولیس والی کتاب آپ نے غور سے نہیں پڑھی لیکن گنجینہ سرآغر سانی میں نے ڈھونڈ نکالا ۔ آئیے دکھلاؤں ۔" گول کمرے میں لے جا کر اس نے کتابیں پیش کیں جن پر مالک مکان کے نام لکھے تھے ۔ اور مالک مکان کی تصویر دکھائی ۔ شجو جھینپ کر چپ ہو گئے ۔ گلنار نے مرزا گڑگڑی سے کہا "ہم نے نادانستہ اوکھلی میں سر دیا ۔"

"کیا کہیں بائی صاحب ۔ ان کی بال ہٹ تھی اور آپ کو مکان کی ضرورت ۔" مرزا گڑگڑی ندامت سے بولے ۔

طوطے والے بنگلے میں آئے اسے پانچ دن گزر گئے وہ بڑی شرافت اور خاموشی سے رہ رہی تھی ۔ صبح کو ریاض کرتی جسے شجو اور للو کوٹھی کے باغ میں بیٹھ کر سنا کرتے ۔ شاگرد پیشے والے بھی ادھر ادھر درختوں کے نیچے جمع ہو جاتے ۔ رات کو شجو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ناٹک لکھتے ۔ اسیر حرص کے مرزا حماقت بیگ، جھنجھٹ اور بی نحوست نے ان کو بہت انسپائر کیا تھا، سنیچر کی رات ہوم ورک کے بجائے (مجھے سمجھا ہے کیا ہر چرن داس ؟) بہت دیر تک لیمپ کے سامنے قلم کاغذ لئے بیٹھے رہے ۔ نب والا قلم نقرئی دوات میں ڈبو ڈبو کر بار بار ۸۶ ، لکھا ۔ دماغ پر بہت زور ڈالا پر کوئی پلاٹ سمجھ میں نہ آیا ۔ اچانک کاسٹ کے نام سوجھ گئے ۔ فوراً لکھنا شروع کیا ۔ ۸۶ ، زنانہ پارٹ : ویران جہاں بیگم ۔ ہونق بانو ۔ بربادی خانم ۔ بیہودہ خاتون ۔ مردانہ پارٹ : احمق نواز جنگ ، غبی الدولہ دہشت الزماں ، خوفناک سنگھ ۔ اب ان پر ایک الہامی کیفیت طاری تھی اور نام تھے کہ بارش کی پھوار کی طرح صفحۂ قرطاس پر گرتے چلے جا رہے تھے ۔ اپنی جودتِ طبع پر عش عش کرتے راجہ شجاعت حسین کچھ دیر بعد کاپی بک پر سر رکھ کر اونگھنے لگے ۔

صبح دس بجے ہی بٹو بھی ، للو جی اور ننھے کوٹھی پر آن دھمکے ۔ شجو میاں اس وقت ناشتہ کر رہے تھے اور طوطے والے بنگلے سے طبلہ کھڑکنے کی آواز آ رہی تھی ۔ للو جی بے صبری سے بولے ۔

"آج شاید یہودی کی لڑکی کی ریہرسلیں ہو رہی ہیں۔ چلو دیکھ آویں۔"

"میر حقّہ کو بلا لو۔" شجّو نے جواب دیا۔ ناشتہ ادھورا چھوڑ اپنے ناٹک (جو ابھی کاسٹ کے ناموں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا) کی کاپی بک لینے اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ پھر میر حقہ مرزا گڑگڑی اور تینوں دوستوں کے ہمراہ اور بڑی بٹیا کی اجازت کے ساتھ کالج کی سمت روانہ ہوئے۔

گلنار برآمدے میں کھڑی ہرودئی مالن سے اپنے لئے ہار گندھوا رہی تھی۔ "آ گئی چنڈال چوکڑی۔" اس نے لڑکوں کو دیکھ کر مسرت سے کہا۔ طوطے والے بنگلے میں اس وقت غیر متوقع طور پر بڑی رونق تھی۔ اسیر حرص کے دونوں مسخرے ان کے علاوہ ماسٹر اختر آفندی، ماسٹر فیروز، عطا محمد بیٹی ماسٹر، منّو۔ کندن مھری چار بنا بنا کر سب کو دے رہی تھی۔ گلزار بائی ایک کونے میں بیٹھی باقرخانیاں اڑا رہی تھیں جو صبح صبح منّو سائیکل پر جا کر چوک سے لائے تھے۔ ماسٹر فیروز صوفے پر اکڑوں بیٹھے گجراتی رسم الخط میں چھپی "راگ دل چمن" کی ورق گردانی کر رہے تھے جو تھیٹر کی قدیم ترین غزلوں کا مجموعہ اور ناٹک منڈلیوں کی بائیبل تھا۔ ماسٹر فیروز نیو الفریڈ کمپنی کے نمبرون گویے تھے۔ صبح سے شغل مے شروع کر دیتے تھے اور مستقل گنگناتے اور طرح طرح کی دل آویز دھنیں بٹھاتے رہتے تھے۔

کوٹھی سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد گلنار نے للّو جی سے پوچھا۔ "اسیر حرص کیسا لگا؟"

"نمبرون۔" للّو جی نے انگلی اٹھا کر رستم جی بیسٹن جی کے انداز میں جواب دیا۔ "اب یہودی کی لڑکی پریکٹس کریں گی؟"

"کون — ؟ میں؟ نہیں تو۔ تم لوگ کچھ سننا چاہتے ہو؟" گلنار نے پوچھا۔

"بیٹا۔ ہم تمھارے غلاموں کے غلام۔ جس کو جو حکم دو وہ خدمت کرے۔" گلزار بائی بولیں۔ آج وہ جادوگرنی یا گلابو شتابو کے بجائے اصل نسل نائیکہ لگ رہی تھیں۔

شجّو نے ذرا تکلف سے گلنار کو مخاطب کیا۔ "ہمیں ایک آدھ کومک سین سنوا دیجے۔"

گلنار نے دونوں مسخروں کو اشارہ کیا۔ پاسنگ شو کی ڈبیا جیب میں ڈال کر ان صاحب نے جو مرزا حماقت بیگ بنتے تھے جھک کر نو عمر راجہ صاحب کو تسلیم عرض کی۔ کھنکارے اور آستین چڑھا کر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ پھر یک لخت گرج پڑے "فکر۔ فکر۔ فکر۔ فکر۔ جتنی مجھ کو ہے اتنی اگر کوئی ساہو کار کرتا تو مفلس بنک کا حصہ دار بن جاتا۔ اگر کوئی ناٹک کا منشی کرتا اس کا نیا کھیل پاس ہو جاتا۔ اگر جنرل گوپر کرتا تو ٹرانسوال کا ستیاناس ہو جاتا۔"

چاروں نوجوان بہت ہو کر مسخرے کو دیکھا کئے۔ کندن مہری دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھی بکری کی طرح پان چبا رہی تھی۔ دوسرا مسخرا جو اسیر حرص میں جھنجھٹ بنتا تھا جھٹ اس سے مخاطب ہو کر گانے لگا "ارے واہ جی واہ ___ یہ لونا چماری ___ ہو صورت پہ واری ___ بڑھاپے کا ٹٹو۔ محبت پہ لٹو۔ ادھر ادھر زنگی جوانوں میں۔ جنگی گھرانوں میں ہو تا شمار۔ تو ہے میری جانی۔ تو ہے نانی۔ تو ہے میری خالہ جان۔ جان لے۔ ایمان لے۔ مکان لے۔"

گلزار بائی نے قہقہہ لگایا۔ للو جی خوشی سے بے حال تھے۔ میر حقہ اپنی جگہ پر کسمسائے۔

پھر ساری کمپنی نے گلزار بائی سمیت اسیر حرص کا مقبول گانا جو پچھلے تین چار دن سے لکھنؤ کے لونڈے گلی کوچوں میں گاتے پھر رہے تھے شروع کیا "صورت سیرت میں چندہ ___ ہر فن کامل ہے بندہ۔ شکل مچھندر۔ عقل میں بندر۔ خاصے قلندر۔ واہ جی واہ۔"

للو جی بھی تال دے کر ساتھ لگ گئے۔

"ممبر بن کر گھر گھر پھر کر ٹیکس لگائے گا بندہ۔

آہا ہا واہ واہ خوب نکالا یہ دھندا۔

یاروں میں غاروں میں کھنگی چاروں میں۔ دھوبی کہاروں میں پاؤں گا نام۔ کرسی پر بیٹھوں گا، یاروں میں اینٹھوں گا۔ دولت سمیٹوں گا میں صبح شام۔ خان بہادر بن کے چال چلوں گا تن کے۔"

اب سب موڈ میں آ چکے تھے۔ بنو جی، شبو اور مرزا اگرا گڑای کورس میں شامل ہو گئے۔ صورت سیرت میں چندہ۔ ہر فن کامل ہے بندہ۔

دفعتاً گلنار نے کھڑکی کے پاس جاکر بڑے جذباتی انداز میں کہنا شروع کیا —— "لو یار شوخ شنگ۔ چھیڑ چنگ کا سارنگ۔ جام کا جمادے رنگ۔ پھر کہاں یہ دوست ہوں گے اور کہاں یہ بزم چنگ۔ چلی ناؤ منجدھار میں۔" پھر سب کی نظریں بچاکر چھنگلیا کی نوک آنکھ کے گوشے تک لے گئی اور آنسو پونچھا۔

ماسٹر اختر آفندی برآمدے میں جاکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ بیڑی سلگائی اور سامنے امرود کے درختوں پر اڑتے طوطوں کی بہار دیکھنے لگے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ بڑی بٹیا میر حقّہ کے ذریعے گلنار کو کہلوا چکی تھیں کہ سب کے لئے خاصہ کوٹھی سے بھیجا جائے گا۔ ہیڈ خدمت گار کی قیادت میں ملازم کھانے کی کشتیاں اٹھائے آپہنچے۔ طبلہ بایاں، فرشی ہارمونیم اور فرنیچر ایک طرف کو کھسکا کر دسترخوان بچھایا گیا کوٹھی کے باورچی خانے میں رنگین پیڑھی پر بیٹھی، غرارے کے پائنچے پنڈلیوں تک چڑھائے بڑی بٹیا دیگچیوں میں سے کھانا نکلوا رہی تھیں اور سفید دوپٹے سے آنسو خشک کرتی جاتی تھیں۔ اللہ رکھے یہ پہلا موقع تھا کہ جوان بیٹے نے اصل خیر سے طوطے والے بنگلے میں محفل آرائی کی تھی۔ باپ اور شوہر بے طرح یاد آرہے تھے۔ ان کے زمانے میں اسی طرح کھانا اتروا اتروا کر بنگلہ بھجواتی تھیں۔

کھانے کے بعد سب نے ادھر ادھر آڑے ترچھے لیٹ کر قیلولہ شروع کیا۔ میر حقّہ نے شجو سے کہا "بھیّا اب کوٹھی چلئے۔"

بھیّا نے ملتجیانہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔ میر حقّہ خاموش ہوگئے۔ دیوار سے ٹیک لگاکر انھوں نے بھی آنکھیں موند لیں۔

"پی اور پلاتا جا ساقی ہو خیر تیرے میخانے کی۔" کوئی پون گھنٹے بعد میر حقّہ کو ماسٹر فیروز کے فلک شگاف نعرے نے نیند سے چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑاکر سیدھے ہو بیٹھے۔ دھاگے کی عینک ناک پر دوبارہ جمائی اور سامنے غور سے دیکھا۔ سرخ فراک میں ملبوس ایک سنہرے بالوں والی لڑکی

گلنار کے ساتھ بید کے صوفے پر بیٹھی بیئر پی رہی تھی۔ ماسٹر فیروز فرش پہ بادہ نوشی میں مشغول تھے۔ گلاب بائی کونے میں اب تک انٹا غفیل تھیں۔ میر حقہ نے گھبرا کر شجو میاں کو پکارا اور اطمینان کی سانس لی۔ شجو بجو للو ننھے چاروں دوسرے کمرے میں "مرزا حماقت بیگ" سے باتیں کر رہے تھے۔ میر حقہ نے مرزا گڑگڑی کو اشارے سے پاس بلایا اور چپکے سے دریافت کیا "یہ مسیا کون ہے؟"

"آپ پہچانے نہیں؟ کمپنی کی نمبر ٹو ایکٹریس ڈھیلا بائی۔"

"چہ خوب۔ نیلی آنکھیں۔ پیلے بال۔ نام ہے ڈھیلا۔ ڈھیلی چال۔ آیا نیا دبال۔" میر حقہ نے فوراً تک بندی کی۔ "یہ کب آئی؟"

"ابھی۔ جب آپ سنا رہے تھے۔" مرزا گڑگڑی نے جواب دیا۔ "اس کی ماں کلکتہ کی طوائف ہے۔ باپ کوئی گورا سولجر تھا۔ سنا ہے ماسٹر فیروز اس پر زہر کھاتے ہیں مگر گلنار کی طرح ان کا دماغ بھی ساتویں آسمان پر ہے۔"

گلنار اور ڈھیلا بائی پاؤں ہلا ہلا کر "سہیلیوں کا گیت" الاپ رہی تھیں۔ "جھولنے والی ہے رشکِ گلِ لالہ جھولا۔ جا کے بلبل تو رگِ گل کا بنا لا جھولا۔"

فیروز نے گا کر جواب دیا۔ "دیکھ اے پیاری فصلِ بہاری نہریں ہیں جاری کیوں ہے کیاری۔ ادھر ادھر یوں چلت سنانا آہاہا۔"

ڈھیلا بائی ناک بھوں چڑھا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ موتیوں کے بٹوے سے قینچی سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک خود لیا دوسرا گلنار کو دیا۔ چند کش لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا تانگہ باہر موجود تھا کسی کو سلام نہ دعا۔ روانہ۔

"بہت خوب۔ نام چاہے ڈھیلا بائی ہو مگر گوری چمڑی کا رعب۔ یہ بھی جماتی ہیں۔" میر حقہ نے مرزا صاحب سے کہا۔

کھانے کے بعد ماسٹر اختر آفندی پھر باہر جا بیٹھے تھے اور مستقل مزاجی سے طوطوں کی

بہار دیکھ رہے تھے۔ دل شکستہ ماسٹر فیروز نے بیٹی ماسٹر کے پاس جاکر زور سے کہا "سالی!" اور چپ ہو گئے۔

للّو نے بڑی لجاجت سے درخواست کی "کچھ سنائیے۔" واقعہ یہ تھا فیروز صاحب ماہرِ فن گلوکار تھے۔ چونک کر بولے "کیا سنائیے ہم سالا۔ ہمارا لک ڈاؤن ہو گیا۔ اسٹار گردش میں ہے۔" انھوں نے انگلی گھما کر گردش کی تشریح کی۔ بوتل اٹھائی اور جھوم کر بولے "ہم کیا سنائے گا سالا۔ نرگس کے اشارے ہوتے ہیں۔ پھولوں کا رنگ بدلتا ہے۔ غنچے کی صراحی ڈھلتی ہے۔ لالہ کا پیالہ چلتا ہے۔ سب رندانہ ہیں مست الست بنے۔ مے دست بدست اڑاتے ہیں۔ سب رنگ ترنگ امنگ میں ہو ہر ڈھنگ کے رنگ جماتے ہیں۔ ہاں کاگ اڑے بے لاگ اڑے۔ کچھ راگ اٹھے۔ کیا گانا ہو — ؟ کچھ دھرپت سرپت ٹپا ٹپی یا توم تنا در تانا ہو۔"

"کچھ دھرپت سرپت ٹپا ٹپی یا توم تنا در تانا ہو۔" گلزار بائی نے نیند سے چونک کر دہرایا اور پھر سو گئیں۔ چند منٹ بعد اٹھ بیٹھیں۔ آنکھیں مل کر حاضرین محفل کو غور سے دیکھا۔ یاد آیا کہاں ہیں۔ بولیں "جیسے خوشبو سے بیلا، لوگوں سے میلا، مجرم سے گھات۔ چاند سے رات کی بہار ہے۔"

"واہ واہ۔ سبحان اللہ۔" مرزا گڑ گڑی نے فوراً تعریف کی۔

اب گلنار ترنگ میں آچکی تھی اور گنگنا رہی تھی۔ لب جو ہو فرشِ آب ہو شب ماہ ہو بادہ ناب ہو۔ گلزار بائی کو شاید اپنی سگڑ نانیوں کے میدانِ جنگ کا خیال آیا۔ کان پر ہاتھ رکھ کر چلائیں۔ گوبھی کا تو قلعہ بنایا۔ گاجر کا دروازہ۔ شکر قند کی توپ بنائی لڑے فرنگی راجہ۔ ارے ترکاری لے لو۔ مالن آئی بیکانیر سے۔

فیروز نے ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ دہاڑ کر لڑکوں سے پوچھا "بادا لوگ بولو کیا سنیں گا۔ وہی سنائیں گا۔"

"ہمیں کومک گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔" شجّو نے فرمائش کی۔

"ہریش چندر کا گانا چلے گا؟"

"جی؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ ضرور چلے گا۔" بنّو فوراً بولے۔

فیروز نے شروع کیا۔ "من میل مٹے۔ تیج بڑھے۔" سازندوں نے فوراً ایک انگریزی دُھن چھیڑی۔ مسٹر بہرام فیروز جوش وخروش سے گاتے رہے۔ "من میل مٹے۔ تیج بڑھے۔ دے رنگ بھنگ کا گھوٹا۔ سور دگ ٹلے۔ سو سوگ جلے۔ اٹھ بھور نہا کے گنگ چڑھا کے بھنگ۔ جما لے ایک۔ نرالے ڈھنگ دکھادے۔ ہر بار بول بم بھولا۔" "بم بھولا" چلّاتے ہوئے فیروز اچک کر میز پر چڑھ گئے اور ٹیپ ڈانس کرنے لگے۔ پھر وہیں سے فرمایا۔ "اب مرید شنک ناٹک کا دادرہ سناتا ہوں۔ توا کٹورہ بیچ ڈال۔ دھر لوٹے پہ دھیان۔ سویرے پھر چھنے گی۔"

"ونس مور۔" للّو جی للکارے۔

"سویرے پھر چھنے گی۔"

اب ماسٹر فیروز نے "مرزا حماقت" کا مقبول گانا شروع کیا۔ "میری جانی شراب ارغوانی شراب۔ آجا تجھے ڈالوں پیٹ میں۔ جی میرا آیا تری لپیٹ میں۔ کوفتے پسندے منگا کر پلیٹ میں۔ تجھ کو پیوں سلیٹ میں۔ یارو خطا معاف کرو میں نشے میں۔ یوں کہتے ہیں مرزا حماقت بیگ۔ چوکو نہ یارو رانسلیٹ میں۔" پھر جفاکیش ڈھیلا بائی یاد آگئی۔ بولے۔ "ترے ہجر میں یار مر گئے سسرے سالے۔ آخر یہ کیا ہے گڑبڑ گھوٹالہ۔ تو عورت ہے یا عاشقوں کی ستیاناسی کا مسالہ۔" اور لڑکھڑا کر میز سے نیچے آرہے۔ میر حقہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ جیں بہ جبیں ہو کر گلنار سے کہا۔ "انھیں یہاں سے فوراً چلتا کیجیے۔"

منّو دوڑے دوڑے باہر گئے۔ سڑک پر سے خالی تانگہ پکڑ لائے۔ بے چارے ماسٹر بہرام فیروز کو پچھلی سیٹ پر لاد کر ان کے ہوٹل لے گئے۔ میر حقے نے بنّو سے کہا۔ "اب آپ بھی گھر چلیے۔"

"میر صاحب۔ ہم ایک ناٹک لکھ رہے ہیں۔ اس کی کاسٹ گلنار بائی کو سنا دیں ــــــ؟ بس پانچ منٹ ـــــ" شجّو نے التجا کی۔

"اچھا سنا دیجیے۔"

شجّو نے کاپی بک اٹھائی اور گلنار سے کہا۔ "ہم ایک ناٹک ..."

"ہاں ہاں سناؤ میاں۔" گلنار ہمت افزائی کے لہجے میں بولی۔

شجّو نے ذرا شرما کر پڑھنا شروع کیا ــــ "زنانہ پارٹ: ویران جہاں بیگم، ہونق بانو، بربادی خانم، بیہودہ خاتون۔"

"بے حجاب بائی مہ لقا اور شامل کر لیجیے۔" میر حقّہ نے ترشی سے کہا۔

شجّو کے اوپر سے گزر گئی۔ سنانے میں محو رہے۔ "احمق نواز جنگ، غبی الدولہ، خوفناک سنگھ۔"

"لالہ بے حساب رائے اور بھُرکس نکال سنگھ کا بھی اضافہ کر لیجیے۔" میر حقّہ بولے۔ سامعین نے شجّو کو زور شور سے داد دی۔ گلزار بائی نے بلائیں لیں۔

بنّو دروازے کے پاس فرش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔ معاً ان کی نگاہ باہر پڑی اور رنگ سفید پڑ گیا۔ جھک کر شجّو سے کہا۔ "ابے ہم سب کا بھُرکس ابھی نکلا جاتا ہے۔ آپ کے ماما تشریف لے آئے۔ ۲۶ تاریخ کو آنے والے تھے۔ پانچ دن پہلے ہی چلے آ رہے ہیں۔"

باہر سرخ بجری پر بوٹوں کی چاپ۔ چق اٹھی۔ سید رفاقت حسین بیرسٹر ایٹ لا دروازے میں موجود۔ مع گلنار و گلزار ساری کمپنی سرو قد کھڑی ہوئی۔ سب نے جھک جھک کر آداب عرض کیا۔ بیرسٹر صاحب نے سر خم کر کے سب کے سلام کا جواب دیا۔ بھانجے کو دیکھا جو نظریں جھکائے میر حقّہ کی پناہ اور آڑ میں ہو گئے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے گلنار پر نظر ڈالی۔ دوبارہ محفل کا جائزہ لیا۔ ایک کرسی پر ٹک گئے۔ گلنار سے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ آپ کی کمپنی آج کل شہر میں بڑے اچھے کھیل دکھا رہی ہے۔ ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔"

گلنار نے تسلیم عرض کی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ اس طرح دار نووارد کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اپنی تصویر سے زیادہ صورت دار اور مدمغ مجسم تکبّر و نخوت۔ خیر ٹھیک ہے جتنا بھی غرور نہ کریں کم ہے۔ اللہ نے انھیں کیا نہیں دیا۔ شرافت، دولت، عزت، وجاہت۔ اور ہم کون ہیں؟ خدائی خوار، اٹھائی گیرے، کنجر۔ اس نے خود ہی خود سر ہلایا۔ اور اپنی اور ان کی دنیاؤں کے تفاوت پر متحیر ٹکٹکی باندھے ان کی شکل تکتی رہی۔ بیرسٹر صاحب نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔ گلنار سے پوچھا "آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں؟"

"جی نہیں۔ آپ کی عنایت ہے۔"

گلزار بائی باچھیں کھلائے ہمہ تن توجہ بیٹھی تھیں۔ لیکن بیرسٹر صاحب گلنار کے بجائے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ للّو جی کے ہاتھ میں کاپیاں دیکھ کر پوچھا "کیا ہے؟" اور دونوں کاپیاں ان سے لے لیں۔

للّو جی کی کاپی کے اوپر انگریزی میں مرقوم تھا۔ لالہ گھنشام داس رستوگی۔ جماعت دہم۔ امیرالدولہ ہائی اسکول لکھنؤ۔ یوپی۔ انڈیا۔ برٹش ایمپائر۔ ورلڈ۔ نار دن ہمسفیر۔ اندر اردو میں لکھا تھا۔

۱۔ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ تماشا ہامان۔

اجی صاحب نتیجہ مل جائے گا

ماگارے گانی دھاپا ما گا

۲۔ تماشا جوہر شمشیر عرف قتل بے نظیر

ہوا حاصل وصال دلے جی ہے نڈھال نیا دل کو ملال کر دکیا میں بیاں وہ ہے نازک دماغ کہیں دیوے نہ داغ ہووے ٹھنڈا چراغ میرے دل کا یہاں کبھی ہو کر بیزاریاں سے ہووے فرار۔ میری مٹی ہو خوار اسے پاؤں کہاں۔

۳۔ کرزن تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی۔ تماشہ دلفروش

تمھیں دوں گا واکی کھبریا جان

گا رے گا ما پا دھا پا ما

۴۔ الگزنڈر تھیٹریکل کمپنی آف دہلی۔ تماشہ "چوں چوں کا مربہ"۔

(بطرز "میں باورچی کی بیٹی")

میں تو پھر نخرے آئی کرتی چھل اور ٹھٹھا

سا × ۲ رے گا رے سا گا ما × ۲ ۔ رے × ۲ ۔

۵۔ تماشہ لیلیٰ عرف ستارہ منگریلیا

مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش

کوئی مخل نہ ہو وہاں باعث حجاب کا

۶۔ غزل داغ ۴۴

بتان ماہوش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں

۷۔ تماشہ فسانہ عجائب عرف خورشید زرنگار

(طرز انگریزی)

دھوئیں کی گاڑی اڑائے لئے جائے۔ پیسے کالو کبھی فرنگیا رے بابو ذات نہیں دیکھے جمات نہیں دیکھے۔ ایک دم ہی سب کو بٹھائے لئے جائے۔ ہندو مسلمان، بھنگی چمار سے ٹکٹ کے پیسے کٹائے لئے جائے۔

۸۔ زبان انگریزی، دھن دیس۔ تال کہروا۔ دوگن۔ اگین۔ اگین۔ اگین۔ وین آئی واز سنگل۔ مائی پاکٹ واز ڈنگل۔

۹۔ امروز دیگرم بفراق تو شام شد۔

(دھن بہاگ)

بیرسٹر صاحب کا سر گھوم گیا۔ انھوں نے کاپی بک بند کی۔ بھانجے کی کتاب کھولی۔

سید شجاعت حسین جماعت ہفتم ۔ کالون تعلقدارز اسکول ۔ لکھنؤ ۔ یو۔پی ۔ انڈیا ۔ برٹش ایمپائر۔ زنانہ پارٹ: ویران جہاں بیگم ۔ ہونق بانو ۔ بربادی خانم ۔ بیہودہ خاتون ۔ آنکھوں پر انگلیاں پھیر کر دریچے سے باہر دیکھا اور کھڑے ہو گئے ۔ حاضرین جلسہ فوراً اٹھے ۔ بیرسٹر صاحب نے گلنار سے مخاطب ہو کر کہا ”معاف کیجئے گا ۔ سفر کی تکان ہے ۔ ورنہ تھوڑی دیر اور بیٹھتے “ بھانجے سے بولے ” ذرا میرے ساتھ تشریف لائیے “ اور چق اٹھا کر باہر۔

اب شام کے پانچ بج رہے تھے ۔ کوٹھی کی برساتی میں ایک فٹن آکر رکی ۔ بڑھیا سوٹ پہنے ، مونوکل لگائے ، چرٹ پیتے ، نوکیلی مونچھوں والے ایک نیٹو جنٹلمین نے باہر جھک کر برآمدے میں منتظر اور سراسیمہ جمنا مہری کو آواز دی ” میاں کو اطلاع کر دو —— لاٹ صاحب آئے ہیں “

” میاں آپ کا اندر سے بلاوت ہیں “ مہری نے جواب دیا ۔

کوٹھی کے پچھلے گول چبوترے پر ” عدالت “ لگی تھی ۔ بیرسٹر صاحب متردد انداز میں سگار پیتے آرام کرسی پر نیم دراز تھے ۔ لالہ درگا داس رستوگی ، شیخ رشید احمد ، سب اڈیٹر اودھ پنچ ، میر حقہ اور مرزا گرگٹی نیم دائرے میں کرسی نما مونڈھوں پر بیٹھے تھے ۔ چاروں مجرمین شجو ، ننھے ، بنو اور للو سامنے کھڑے تھے ۔

مونوکل والے مہمان کو آتا دیکھ کر بیرسٹر صاحب نے ہاتھ پھیلا کر ” آؤ بھائی لاٹ صاحب آؤ بیٹھو “ کہا اور ایک گہرا سانس لیا ۔

لاٹ صاحب یعنی کنج بہاری لعل ماتھر بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے نور نظر لخت جگر برج بہاری لعل ماتھر عرف بنو کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورا اور خود بھی آہ سرد کھینچ کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے ۔ بہت انگریز آدمی تھے اس وجہ سے حلقۂ احباب میں ” لاٹ صاحب “ کہلاتے تھے ۔

"بیٹھ جائیے۔" صاحب خانہ نے کڑک کر دونوں کو حکم دیا۔ وہ ہڑبڑا کر مونڈھوں کے چرمی کناروں پر ٹک گئے اور سر جھکا لیے۔

چند سکنڈ خاموشی چھائی رہی۔ پھر صاحب خانہ بولے "ایں لاٹ صاحب۔ تم کو خوب معلوم ہے اسی شوق نے میرے گھرانے کو برباد کیا۔ دادا جان اور ابا جان ہمیشہ مقروض رہے۔ دولہا بھائی کا علاقہ کورٹ ہوا۔ اور یہ۔ لالہ جی۔ ذرا اپنے سپوت کے کارنامے بھی دیکھئے۔" انھوں نے للّو کے گانوں کی کاپی ان کے والد درگا داس رستوگی کے ہاتھ میں دی۔ اور کہتے رہے "شجاعت حسین صاحب کو تم از کم ایف۔اے۔ میں ہونا چاہئے تھا۔ دو سال سے ساتویں کلاس میں فیل ہو رہے ہیں۔ اور سُنئے کن علوم میں برق ہیں ــــ ویران جہاں بیگم۔ بربادی خانم۔ بیہودہ خاتون"۔ غم و غصے سے سرخ ہوکر دوسری کاپی بک انھوں نے چبوترے سے دور گھاس پر پھینکی اور ننھے کے والد شیخ رشید احمد سب اڈیٹر اودھ پنچ کو مخاطب کیا "شیخ صاحب قوم کی نئی پود تھیٹر کے شوق میں غارت ہوئی جا رہی ہے۔ آپ اس کے خلاف قلم کیوں نہیں اٹھاتے ؟"

اس وقت تک لاٹ صاحب کا دماغ پوری طرح بھنّا چکا تھا۔ انھوں نے سید رفاقت حسین کی بات کاٹ کر اپنے فرزند دلبند کو مخاطب کیا "کیوں بے۔ گھر چل کر ایسی مرمت کروں گا تجھ کہ ــــ ایں جناب عالی اس کا نام لیجئے ہم تو یہ کوشش کرتے کرتے گھسے جا رہے ہیں کہ اولاد سالی جو ہے وہ انگریزی تہذیب سیکھے۔ آدمی بنے۔ متمدن کہلائے۔ اور یہاں وہی تاک دھنا دھن تاک دھنا دھن" طیش میں آکر انھوں نے اپنی چھڑی کو زور سے چبوترے پر پٹخا۔

"کیوں مرزا صاحب۔ تھیٹر کا اور کون کون ڈوم دھاڑی یہاں آتا تھا ؟" بیرسٹر رفاقت حسین نے سوال کیا۔

مرزا گٹاگڑی دست بستہ گڑگڑائے "صاحب میں تو اس قوم سے زیادہ واقف نہیں۔

بھائی بھی کم دیتا ہے۔ رتوندی آتی ہے۔ میر صاحب سے دریافت فرمائیے۔"

میر حقہ نے عرض کی "میاں۔ ایک تو وہی دونوں ہیں۔ جی ہاں۔ اور ان کے خان صاحب پیٹی ماسٹر۔ اور ...."

"پیٹی ماسٹر کیا ہوتا ہے؟"

"حجور وہ جون ہر مونیا بجادت ہیں۔" آرام کرسی کے پیچھے کھڑے منہ چڑھے بانکے کوچوان نے تفسیر بیان کی۔

میر حُقّہ بولے "مگر حلفیہ، جناب امیر کی قسم۔ بڑی بٹیا کی اجازت سے۔"

"جی ہاں معلوم ہے۔ باجی بیگم اپنے لاڈ پیار میں صاحبزادے کو دو کوڑی کا کر کے چھوڑیں گی۔ ان کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ میں کہاں تک اس ڈوبتی ناؤ کو بچا سکتا ہوں۔ لالہ جی۔ کل سویرے دس بجے تک بنگلہ خالی کروائیے۔"

"بہت بہتر۔"

"اور عزیزی شجو میاں۔ آپ بھی اپنا اسباب باندھنا شروع کیجئے۔ میں کل ہی آپ کے نام کالونی سے کٹاتا ہوں اور آپ کو علی گڑھ روانہ کرتا ہوں۔"

عدالت برخاست ہوئی۔ چبوترے پر شیخ رشید احمد اور لاٹ صاحب بیٹھے رہ گئے۔ لالہ درگا داس رستوگی، مرزا گڑگڑی اور میر حقہ کچھ فاصلے پر جا کر نیم تلے مسکوٹ میں مصروف ہوئے۔ چند منٹ بعد مرزا صاحب چبوترے پر واپس آئے اور کہا "میاں گستاخی معاف ہو تو کچھ عرض کر دوں۔"

"فرمائیے۔"

"میاں بات یہ ہے کہ یہ مس گلنار جو ہیں یہ کوئی گشتی، کسبی، خانگی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ نیرالقمر ڈرامیٹک کمپنی کی مشہور...."

"مرزا صاحب۔ آپ تو کہتے تھے اس قوم سے واقف نہیں۔"

"جی ہاں، مگر ہم نے ان کے بارے میں ایسا ہی سنا ہے۔ اور میاں۔ یہاں یہ از خود تو آئی نہیں۔ بلایا تو آئیں۔ اور پیشگی کرایہ ادا کیا۔ ڈبل۔ اور بنگلہ کرائے پر اکثر اٹھتا ہے۔"

"درست۔ تو پھر؟"

"تو میاں۔ ان سے کن الفاظ میں ـــــ یعنی کس طرح کہا جاوے کہ کل صبح دس بجے تک مکان خالی کر دو۔"

"کہہ دیجئے ابھی دلی سے تار آیا ہے۔ چند اہم موکل صبح کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس ان کے لئے چاہئے۔ اور ہماری طرف سے معذرت کر دیجئے۔" زچ ہو کر سٹرماتھر سے کہا۔ "لاٹ صاحب! للہ آپ ہی بتائیے! اس گلنار بائی کے قیام و طعام کا میں کس طرح ذمہ دار ہوں؟"

گلنار مورننگ گلوری کی آڑ میں چھپی "عدالت" کی پوری کارروائی دیکھ اور سن رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب کے چہرے پر نظریں جمارکھی تھیں اور غصّے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایسی توہین۔ ایسی ناقابلِ یقین بے عزّتی۔ حقّہ گڑگڑی کو سر جھکائے بنگلے کی سمت آتا دیکھ کر سرپٹ بھاگی اور اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اگر میرا بس چلے۔ اگر میرا بس چلے اسی وقت پر لگا کر اڑوں اور یہاں سے دفان ہوں ـــــ کالا منہ کروں۔

۵۔ بلبلِ بیمار

گڑگڑی اور حقّہ کے سامنے گلنار بائی ہاتھ چلا چلا کر چلائیں "ہم۔ ہم بڑے بڑے والیانِ ریاست کے شاہی مہمان خانوں میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے راجوں نوابوں نے ہم پر اپنے خزانے لٹا دیئے۔ ذرا جا کر اپنے خر دماغ بالسٹر سے پوچھو۔ میاں تمھاری اوقات ہی کیا۔ دو ٹکے کے وکیل۔ ذرا ذہور زمینداری۔ ارے۔ ابھی کل کلاں کو میری اماں دے کی جائداد املاک کا کوئی مقدمہ کھڑا ہو وے۔ میں ان کی فیس ادا کروں تو دوڑے آئیں۔ اور اب ہم سے ہیکڑی کی لیتے

ہیں جیسے ان کی نبض ان کے کام کی۔ ہماری فیس ہمارے کام کی۔ ہم میں ان میں فرق کیا ہے؟"

"خدا کے لئے آپا چپ رہو۔" گلنار نے شرم سے پانی پانی ہو کر التجا کی۔

اس سے قبل گلزار بائی جو نشے میں آ رہی تھیں، زیادہ فحش کلامی پر اترتیں، حقہ گڑگڑاتی وہاں سے کھسک گئیں۔ ندامت اور غصے کی وجہ سے گلنار کی حالت غیر تھی اور وہ پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے منہ کر فورا لیسٹن جی کے پاس پام کورٹ ہوٹل دوڑایا کہ رات کے شو میں ڈھیلا بائی سے جوڑ کی اسے ٹنڈا ان کتی کام کر ڈالیں اور خود جا کر پلنگ پر گر گئی۔

شام ہوئی چراغ جلے بڑی بٹیا نے بڑا معذرت کے ساتھ کھانا بھجوایا جو گلنار نے واپس کر دیا۔ باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ اماں دن بھر کی تھکی ماندی اور نشے میں لیون ڈرائنگ روم کے غالیچے پر لڑھک رہیں۔ گلنار سگریٹ جلا کر دریچے میں جا بیٹھی۔ رفتہ رفتہ رات کی خاموشی چھائی۔ کوٹھی میں پہلے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

روشنیاں گل ہوئیں۔ رات کی رانی نے باغ معطر کیا۔ مورننگ گلوری کی بیل جہاں ختم ہوتی تھی، وہاں سے بیرسٹر صاحب کا بیڈ روم دکھلائی دے رہا تھا۔ اس کی روشنی گیارہ بجے تک جلا کی۔

اچانک گلنار کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے جو عمل وہ کبھی کبھار کرتی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹول کر والدہ کی وہسکی سوڈا تلاش کیا۔ گلاس بنایا۔ پھر کھڑکی میں آ بیٹھی۔ ایک گھونٹ بھرا۔ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ذلت کی زندگی۔ ذلت کی موت۔ ہوا کا جھونکا رات کی رانی کی مہک ساتھ لایا۔ مے ہو وے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش۔ کوئی مخل نہ ہو وہاں باعث حجاب کا۔ بے حجابیہ بائی رہ لقا۔ اس جل ککڑے میر حقہ نے فقرہ کسا۔ اس دو ٹکے کے منشی کی یہ ہمت۔ ذلت کی زندگی ذلت کی موت تیرے کوچے سے۔ تیرے کوچے سے۔ اتنا غرور۔ اللہ مجھے جہاں پیدا کیا وہاں پیدا ہو گئی۔ اس میں میرا کیا قصور۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ اماں بے خبر سو رہی تھیں۔ اٹھ کر پھر منہ دھویا۔ آنکھوں پر چھپکے مارے۔ بیڈ روم کی بتی جلا کر آئینے میں صورت دیکھی۔ جوڑے کے گرد

لیٹی سفید نقلی موتیوں کی مالا اتارنے۔ کہتے ہیں ایک بار ایک بہت پڑھے لکھے عاشق نے کہا تھا "میڈم
تم تو بالکل زردی ورمائی پینٹنگ کے موافق معلوم دیتی ہو" تو آپا یہ کہہ کر پلٹیں۔ پر اوندھی گر گئی مجبوروں
نے ستایا تو پھر اٹھی۔ برآمدہ میں نکل آئی۔ سامنے ایک کھدی ہوئی کیاری۔ درختوں کے اندھیرے
میں قبر کا گڑھا سا معلوم ہو رہی تھی۔ جب بڑھیا ہو جاؤں گی تو کفن کیا پڑے گا۔ کسی واہیات آدمی،
کسی بوڑھے بدقوارہ میں شاگرد کا سہارا۔ شاید وہ بھی نہ ملے۔ آپا کی حالت۔ اس بے تکے جوبک مرزا
گڑگڑی ہی کو غنیمت سمجھ رہی تھیں بے چاری آپا۔ اور جب میں مروں گی، مروں گی۔ وہ سیڑھیوں پہ
بیٹھ کر یاد کرنے لگی۔ جب مونگا خالہ مری تھیں۔ اٹھارہ برس۔ ان کے جنازے کے ساتھ قبرستان
کے راستے میں ڈھیروں روٹیاں بانٹنے گئے تھے۔ مجھے اماں نے بتایا تھا۔ ہماری برادری کا دستور ہے۔
مرنے والی کی بخشش کے لئے گناہوں کی معافی کے لئے روٹیاں بانٹتے ہیں۔ جھرجھری سی آئی بہت
ڈر لگا۔ کیاری کے گڑھے سے نظر بچا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ غالیچے پہ اکڑوں بیٹھ کر ماں کو جھنجھوڑا
گلنار بائی آنکھیں بند کئے کئے ہنکاریں "اری نابکار۔ مردی سونے دے۔ اوندھی قسمت۔
آگ لگے۔"

"آپا۔ آپا۔ جب مونگا خالہ مری تھیں۔ ان کے جنازے کے ساتھ روٹیاں کیوں بانٹی گئی
تھیں۔ جب میں مروں گی میرے جنازے کے ساتھ کتنے من روٹیاں...؟"

والدہ کھلا کر اٹھ بیٹھیں جھبڑے کھچڑی بال سمیٹے۔ اندھیرے میں چڑیل معلوم ہو رہی تھیں۔
"جنازہ؟ کس کا؟ آگ لگے۔ کل جیبی۔ حرامزادی۔ مردار۔ کرموں جلی۔ ارے ٹیڑھے منہ کی بیٹا تو بن
جانے نواب الماس محل۔ اور تو کم بخت تیرے یہ نصیب۔ ایک ٹٹ پونجیے وکیل نے کمپنی کے سامنے
تیری بے عزتی کر دی۔ اپنے نوکروں سے جوتے لگوائے کتیا کے سر پر۔"

"اچھا۔ اچھا۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ" گلنار نے کہا۔ وہ پھر فی الفور فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ اور کروٹ
بدل خراٹے لینے لگیں۔

اب چاند نکل آیا تھا۔ باغ سو رہا تھا۔ تاریک گھنے درختوں میں گھری سفید کوٹھی چاندنی میں

چھکنے لگی۔ دروازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر باہر آگئی اور روش پر ٹہلنے لگی پھر بے اختیار اس کے قدم بیرسٹر صاحب کے بیڈ روم کی سمت اٹھے۔ نیچی کرسی کی کوٹھی تھی۔ دبے پاؤں چلتی وہ کمرے کے کھلے دریچے کے نیچے پہنچ گئی اور سائے میں ہو کر اندر جھانکا۔ کمرہ چاند کی روشنی سے منور تھا۔ چاندنی بیرسٹر صاحب کے حسین و جمیل چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ دریچے کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر دلہن بنا سے اندر جھانکنے لگی۔ پھر ہٹ کر بوگن ولا کے سائے میں کھڑی ہو گئی اور سوچنے لگی۔ قسمت کی ستم ظریفی۔ پیدائش کے اتفاقات۔ میں کون ہوں۔ وہ بھولی معصوم پردہ نشین شریف زادی کون ہے جو مولوی صاحب کے مدرسے میں پڑھ رہی ہے اور اس گلفام کی دلہن بننے والی ہے۔ اور وہ خود کون ہیں۔ ہم سب کون ہیں۔ کیا ہیں۔ یہ سارا ماجرا کیا ہے۔ گورکھ دھندا۔ میر جعفر معذرت کر رہے تھے۔ بیرسٹر صاحب اپنے تیز مزاج اور اپنے حالات سے مجبور ہیں۔ تو میں بھی اپنے حالات سے مجبور ہوں۔ لو ناحق ہم مجبوروں پر ——

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ اسی طرح دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اندر جھانکا۔ مہاراجہ کوڑیاں کھولو۔ رس کی بوندیں پڑیں۔ بیرسٹر صاحب نے کروٹ بدلی۔ خواب میں بڑبڑائے۔ قربانت شوم۔ سوتے میں بھی حضور کا مزاج سیدھا نہیں ہوتا۔ آواز دے کر جگاؤں۔ پھر ممکن ہے۔ ممکن ہے قسمت بدل جائے۔ جیسے پینا کی قسمت بدلی۔ صرف ایک پل میں۔ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان ادھر یا اُدھر۔ جگاؤں۔ اجی صاحب کچھ اپنے دل کی کہو۔ کچھ ہمارے دل کی سنو۔ یہ اعتبار نہیں، ہم رہے، رہے، نہ رہے۔ اس لمحے اسے اپنی حالت پر شدت کا رونا آیا۔ اچانک بجری پر ادھوڑی کے جوتوں کی چاپ سنائی دی۔ چوکیدار ڈنڈا بجاتا پھاٹک کی سمت چلا آرہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بھاگی اور بنگلے پر آکر دم لیا۔ تیز دوڑنے سے سانس پھول گیا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ چوکیدار "ہوہو" کرتا دوسری طرف نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ والدہ جاگ گئی تھیں۔ وہ بھی ناک سُٹک سُٹک کر روتی جاتی تھیں اور کمرے کی بتی جلا کر سامان سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ باہر چاند کا اجالا پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ کوئی دم میں مرغ بانگ دیں گے۔ کوچ کا وقت قریب تھا۔ ایک بار

پھر کوچہ گردی۔ برٹش انڈین ایمپائر کے چھوٹے شہروں میں کمپنی کی چھولداریاں۔ شوقین رؤسا کے مردانخانے۔ بڑے شہروں میں ہوٹل۔

۶۔ گُلِ زرریز

سرائے ہوٹل۔ سوری ۱۹۲۵ء۔

زعفرانی ڈریسنگ گاؤن میں ملفوف، ہز ہائی نس بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آئے اور زیرِ لب اشلوک پڑھتے ہوئے دریچے سے باہر دیکھنے لگے۔ جہاں ہوٹل کی سُرخ چھتوں کے پرے برف پوش چوٹیاں اپریل کے آخری دن کی سرد دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ چند منٹ بعد مہاراجہ صاحب صوفے پر دھم سے بیٹھ گئے اور برابر کے کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی "ڈارلنگ — ڈارلنگ"

جواب ندارد۔ عمر رسیدہ مہاراجہ صاحب اتنے فربہ تھے کہ چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ ان کا خادم نمودار ہوا۔

"مہاراج۔"

"میم صاحب کہاں ہیں ؟"

"منروا ہوٹل گئی ہیں۔"

"اس وقت ؟"

"ان کی مدر کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی۔ ٹیلی فون آیا تھا۔ سرکار اشنان کر رہے تھے۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ سرکار کو بتا دوں۔"

"ہمیں تیار کرو۔"

"حکم۔"

خدمت گار نے سہارا دے کر مہاراج دھیراج کو پھولدار صوفے سے اٹھایا۔ اندر لے جا کر نفیس اسکاٹش کوٹ پتلون زیبِ تن کروائی۔ چار خانہ کیپ لگائی۔ راجہ صاحب ملازم کے سہارے

باہر آکر زینہ اترے۔ کورٹ یارڈ سے نکل کر رکشہ میں بیٹھے۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ہوٹل کا لان کیا بنا ہوا تھا۔ ان کی منظر نظر
پاسی اسٹیج اور خاموش سینما کی نامور اداکار گلنار بانی کی ضعیف العمر والدہ بانی گلزار بانی صاحبہ،
تیرہ سالہ بیٹی گلرو، چھوٹا بھائی اور بمبئی کی فلموں کا ڈائرکٹر ناصر مٹو، ملازمہ کنیز
اور گلرو کی دیسی عیسائی استانی مس ناس مقیم تھیں جس وقت یہ ہائی لنس ہوٹل کی نچلی منزل کے
کونے والے ٹاور میں پہنچے بانی گلزار بانی صاحبہ کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ وہ عنابی بنارسی شال
اوڑھے پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی بریک فاسٹ اڑا رہی تھیں۔ پائیں وانی ٹرے گلابی ساٹن
کے لحاف پر ان کے سامنے دھری تھی۔ گلنار ان کا بے حد خیال رکھتی تھی ٹوسٹ پر مکھن اور جام
لگا لگا کر انہیں دیتی جا رہی تھی لیکن دونوں ماں بیٹیاں بہت غمگین نظر آتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا
کہ بہت رو چکی ہیں۔ دریچے کے سامنے میز پر بیٹھی گلرو اور فراک میں ملبوس گلرو انگریزی کی
تیسری کتاب کا ایک سبق اٹک اٹک کر پڑھنے میں مصروف تھی۔ ادھیڑ عمر کی کالی میم نیلا سا سفید فراک
اور سرخ کارڈیگن پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

مہاراجہ کمرے میں داخل ہوئے۔ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ گھبرا کر گلنار سے دریافت
کیا "کیا ہوا ہے ــــ خیریت؟"

گلنار ٹیشو سے انگلیاں پونچھ کر اٹھی کرسی پر ٹکی، خاموش رہی اور گہری سوچ میں ڈوبے
رہی اور پھر ہلایا۔ مہاراجہ صاحب نے پریشان آواز میں کہا ــــ "ڈارلنگ ــــ!" وہ گلنار پر
جان دیتے تھے۔

"آغا صاحب جنت کو سدھارے" گلنار بانی نے منہ چلاتے چلاتے بھرائی ہوئی آواز میں
کہا: "میں تو صبح سے کراچی جا رہی تھی کہ مس صاحب نے اخبار پڑھتے پڑھتے خبر سنائی۔ لاہور میں انتقال
ہوا۔"

"نانی کو غش آگیا ــــ" گلرو نے اپنی کتاب بند کر کے حاشیہ آرائی کی۔ "میں نے گھبرا کر ممی کو
فون کیا۔"

"آغا صاحب گزر گئے ــــ از مائی گاڈ" مہاراجہ نے دلی افسوس کے لہجہ میں آہستہ سے کہا ــــ "وہ بڑا جینیس آدمی تھا۔ انھوں نے استانی کو مخاطب کر کے اظہار خیال کیا۔

"یس یور ہائی نس" کالی میم نے منہ بنا کر کے جواب دیا "ہم سنا ہے انڈین لوگ ان کو انڈین شیکسپیر بولتا تھا۔"

گلزار اور گلنار نے اپنے اپنے کانوں کی لویں چھوئیں اور آہ سرد کھینچی۔

"آغا صاحب کی موت ــــ" راجہ صاحب نے اپنے آپ سے انگریزی میں کہا "انڈین تھیٹر کے تابوت میں آخری کیل ہے ــــ ڈارلنگ ــــ" اب وہ اردو میں گلنار سے مخاطب ہوئے "اتنا غم نہ کرو۔ تمہاری صحت پر برا اثر پڑے گا۔"

گلنار اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔ دبیز ریشم کی فیروزی ساری میں ملبوس۔ شانوں پر بیچ کی جالی کا کوٹ ڈالے بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ مہاراجہ صاحب کے موروثی خزانہ کا ایک انتہائی بیش قیمت اور نایاب نیلم اس کی انگوٹھی میں جگمگا رہا تھا۔

"ہم نے آغا صاحب کے اتنے ڈراموں میں کام کیا" گلزار نے مس ٹامس کو بتانا شروع کیا۔ "اسیر حرص ــــ صید ہوس ــــ"

"نہیں۔ سب سے پہلے خوبصورت بلا ــــ" گلزار بائی نے تصحیح کی ــــ "اس وقت تو میری عمر صرف بارہ سال کی تھی ــــ"

مس ٹامس نے منہ پھیر کر زیر لب مسکرائیں۔

گلزار بائی کہتی رہیں ــــ "خوبصورت بلا ــــ پھر یہودی کی لڑکی ــــ"

"یہودی کی لڑکی کا بولتا فلم بھی بن گیا" گلنار نے جھک کر کہا۔

"ارے ہاں۔ آگ لگے بولتے فلموں کو۔ کیا ہمارے ناٹکوں کا مقابلہ کریں گے۔ پھر تم سمجھو اسیر حرص ــــ صید ہوس ــــ سلور کنگ۔ ترکی حور۔ بن دیوی۔ وہ زمانے ختم ہوئے۔"

وہ زمانے ختم ہوئے۔ اسٹیج کے پرانے ساتھی چھوٹ گئے۔ ماسٹر فیروز نے شراب پی کر جان

دے دی۔ اختر آفندی کی آواز بیٹھ گئی۔ ریس کورس پر سارا جمع جتھا ہار گئے۔ فقیری لے لی اجمیر شریف کی درگاہ پر جا پڑے۔ ڈھیلا بائی خاموش بائیسکوپ کی مقبول ایکٹریس بن گئی تھی فلمی نام مس ڈولی۔ ناکامی کے نئے دور میں گلنار کی طرح وہ بھی ناکام رہیں۔ گلنار دو تین ناکامی فلموں کی ہیروئن بن لی تھیں مگر ریٹائر ہو گئیں۔ اب کام کرنے کی نہ عمر ہے نہ ضرورت۔ اللہ نے بہت دھن دولت دی۔ صندوقچے ہیرے جواہرات سے بھٹے پڑے ہیں۔ بڑی محنت کی کمائی ہے۔ بس کفن کا چونگا کر لیا۔

اب اللہ گلرو کو اسی طرح کامیاب کرے۔ گلنار نے سر اٹھا کر بیٹی کو دیکھا جو پھر انگریزی کا سبق یاد کرنے میں جٹ گئی تھی "جاؤ تمہارے ریاض کا وقت ہے" گلنار نے اس سے کہا۔ لڑکی کا دیدہ پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا۔ مگر آج کل کے زمانے میں انگریزی کی تھوڑی سی شد بد بہت ضروری ہے لڑکی فوراً اٹھی دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ گلنار نے فوراً ڈانٹا۔ "ہز ہائی نس سے اجازت لو۔ تسلیم عرض کرو۔" اس عمر میں قدم قدم پر تربیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ ڈیرے دار طوائفوں کی شائستگی اور تہذیب کے محض افسانے ہی باقی رہ جائیں گے۔

گلرو ماں کی طرح حسین نہیں۔ سانولی رنگت معمولی ناک نقشہ۔ یاد ہی نہیں پڑتا اس کا باپ کون تھا۔ شاید کوئی مارواڑی تھا۔ مگر پاک پروردگار نے شکل کی کسر آواز سے پوری کر دی۔ ماشاء اللہ کوئل۔ گانے کی باقاعدہ تعلیم لے رہی ہے۔ پانچ چھ سال بعد بمبئی کی سینما انڈسٹری پر آواز کے بل پر چھا جائے گی۔ انشاء اللہ۔ جب پیدا ہوئی، کلکتہ میں ایک یہودی تھیٹر کمپنی کے مشہور ناٹک گل و زرینہ کو پیش ہی کیا جا رہا تھا۔ وہ معاملہ تو نہ پٹ سکا۔ گلنار نے لڑکی کا نام گلرو زرینہ البتہ رکھ لیا۔ اللہ مبارک کرے۔

مہاراجہ صاحب اٹھنے کے لئے کسمسائے۔ گلنار نے فراش کے جیمبرلین کو بلایا۔ مالک کو خدا حافظ کہا۔ باہر نکل کر خود دوسری رکشا میں سوار ہوئی۔ دونوں رکشائیں سوائے کی طرف چلیں شام کو ہز ہائی نس نے کہا۔ "ڈارلنگ تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔ چلو ہیک مینز

آئیں۔ چنانچہ ایک میز گھیر لی۔ بال روم ناچنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں پچھلے چبوترے پر جا بیٹھے۔ ایک نوجوان ہندوستانی جوڑا والٹس کرتے کرتے باہر نکل آیا۔ گلنار نے چونک کر انھیں دیکھا۔ اور سوچا یہی تو اللہ نے جہاں پیدا کر دیا وہاں پیدا ہو گئے۔ مگر اب یہ شریف زادیاں کیا کر رہی ہیں۔

چبوترے پر لوگ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ "اچھا مسٹر جسٹس حسین بھی مسوری آئے ہوئے ہیں۔" بہار صاحب اچانک بولے۔

"کون ہے"

"۔۔۔ جو سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ سلور گرے بالوں والے۔"

گلنار نے سر اٹھا کر ادھر نظر ڈالی۔ سید رفاقت حسین۔ اب آنریبل مسٹر جسٹس حسین ایک کونے میں بیٹھے اپنے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔

بہار صاحب پیارے پیارے موٹاپے کے باوجود رقص کر سکتے تھے۔ وہ چل قدمی بال روم میں بیٹھ کر رقص ملاحظہ کرنا ہی ان کے بس کی بات تھی۔ "آؤ اندر چلیں۔" انھوں نے تھوڑی دیر بعد گلنار سے کہا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ چوبدار جو اب تک کونے میں موجود تھا سامنے آیا۔ بہار صاحب کی نشست کو اندر لے گیا۔ وہ پیچھے پیچھے تھی۔ سید رفاقت حسین کی میز کے پاس سے گزری۔ وہ اسی طرح احباب کے ساتھ مصروف گفتگو رہے۔ اچٹتی نگاہ سے بھی اسے نہ دیکھا۔

۷۔ چلتی نشانی

لکھنؤ ۱۹۴۱ء۔ وہ چوک میں گھن گھن جی کی دکان سے نکل رہی تھی۔ برآمدے میں ایک کمر خمیدہ بوڑھا جاتا نظر آیا۔ سیاہ ایرانی ٹوپی۔ سیاہ شیروانی۔ شانے پر شہدی رومال۔ بے حد چوڑے پائنچے کا میلا سا پاجامہ۔ کمانی دار عینک۔

"مرزا صاحب۔ مرزا صاحب!" گلنار نے لپک کر زور سے پکارا۔ مرزا گرگٹی نے پیشانی

پر ہاتھ کا سایہ کر کے آنکھیں چندھیائیں۔ غور سے دیکھا۔ "گلنار بائی صاحب آپ!"

"تسلیم مرزا صاحب۔ مزاج شریف۔"

"جیتی رہیے۔ جیتی رہیے۔ آپ یہاں کہاں؟ آپ تو سنا ہے اب بمبئی میں رہتی ہیں۔"

"میری لڑکی استاد مدن خاں صاحب سے تعلیم لے رہی ہے۔ اس لیے یہاں آگئی ہوں۔ سبزی منڈی میں گھر لیا ہے۔ بے نظیر کے گھر کے برابر۔ آپ کے یہاں سب خیریت ہے۔ آپا آپ کو اکثر یاد کرتی ہیں۔ میر تقی کیسے ہیں؟"

"وہ غریب تو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ہمارے جوڑی دار تھے۔ ہم اکیلے رہ گئے۔ پانچ چھ برس ہوگئے انھیں بھی مرے۔"

"چچ چچ چچ چچ ——— بڑا افسوس ہوا۔ اور سنائیے بڑی بیاں تو اچھی طرح ہیں؟"

"آپ نے خوب یاد رکھا۔ جی ہاں۔ اللہ کا کرم ہے۔ راجہ صاحب نے علی گڑھ سے ایف اے پاس کر لیا۔ بیاہ ہوگیا۔ اب ماشاء اللہ سے تین بچوں کے باپ ہیں۔ اپنے علاقے پر رہتے ہیں۔ ہو جی میں۔ بڑی بٹیا ان کی والدہ ——— بھی وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ ہمارے کے ہاں ——— کلائیڈر روڈ پر بھی سب خیریت ہے۔ میاں ——— جج صاحب ——— کے ہاں لے دے کا ایک ہی لڑکا ہے۔ میاں کو بڑی فکر تھی کہ بھیا لکھنؤ میں رہے تو کہیں بری صحبت میں نہ پڑ جائیں۔ ہمارے ... میاں نے انھیں ولایت لے جا کر بورڈنگ اسکول میں ڈال دیا۔ لیکن بیگم بہت روئیں پیٹیں مگر میاں کس کی سنتے ہیں۔ اب ہر دوسرے سال جا کر بھیا سے مل آتے ہیں۔ بھیا خود چھٹیوں میں ولایت سے تشریف لے آتے ہیں۔ آج کل بھی آئے ہوئے ہیں۔ اب خدا کے فضل سے اٹھارہ بیس سال میں ہیں۔ ہم نے سب نسبت ٹھہر گئی ہے بلکہ کل ہی اس کی تقریب ہے ——— ہم اسی سلسلے میں یہاں کچھ خریداری کے لئے آئے تھے۔"

پھر مرزا گڑگڑی گلنار کو خدا حافظ کہہ کر اسی طرح جھکے جھکے ایک دکان کی طرف بڑھ گئے۔

نج رفاقت حسین کے خلف الرشید سید شفاعت حسین عرف شفّو (جو ونچسٹر پبلک اسکول میں شِفّی کہلاتے تھے) انگلینڈ سے جب بھی دو ماہ کے لئے لکھنؤ آتے یہاں کے ماحول کی ہر چیز کو حیرت سے دیکھتے۔ بڑے ہو کر ان کے تحیر و استعجاب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے "لاٹ صاحب چاچا" ان پر بہت نازاں تھے اور کفِ افسوس ملتے تھے کہ آہ کہ اپنے بیٹے بتّو جی لا مارٹینیر کالج کی تعلیم کے باوجود اجڈ نکل گئے۔ جنابِ عالی! ہم نے تو چاہا تھا اسے آدمی بناتے تہذیب سکھاتے۔ شفّو میاں کو دیکھئے بات چیت، چال ڈھال، طور طریقے سے بالکل انگریز معلوم ہوتے ہیں مگر ہمارے بتّو رہے وہی نیٹو کے نیٹو۔ (لاٹ صاحب کے صاحبزادے بتّو جی یعنی برج بہاری لال ماتھر ڈپٹی کلکٹر اضلاع میں بیوی بچوں کے ساتھ گھاسٹر یا سٹر زندگی گزارتے تھے۔ جاڑوں میں لڑکپن کے ساتھی راجہ شجاعت حسین کے ساتھ ترائی کے جنگلوں میں شکار کھیلنے جاتے اور اپنے حال میں مگن تھے۔)

منگنی کی تقریب کے چند روز کے بعد شفّو بھیا بمبئی جا کر اسٹریتھ مور جہاز سے انگلستان روانہ ہونے والے تھے۔ ماہ جون کی ایک تپتی شام کلائیڈ روڈ کی کوٹھی کے پچھلے چبوترے پر اپنے چند ہم عمر رشتے داروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ گرمی سے برا حال تھا اور رشتے داران کو لکھنؤ کے عجائب و غرائب سے روشناس کرانے پر تلے ہوئے تھے۔

"چوک میں" شفّو کے خالہ زاد بھائی اچّھو نے کہا "آج کل بہار آئی ہوئی ہے۔ اگلے وقتوں کی ایک ایکٹریس ہے گلنار بائی ۔۔۔ اس کی لڑکی ہے جناب ۔۔۔ گل بانو ۔۔۔ کیا کمال کی ہے۔ بس قیامت ہے ۔۔۔ چلتے ہو۔ اس کا گانا سنوا لائیں۔"

"جی ہاں۔ اور ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو ہمیں اللہ شکر کر کے پہلے ہماری کھال کھنچوائیں گے پھر اس میں بھوسہ بھر دیں گے۔" شفّو نے جواب دیا۔

"یار عجب بزدلے ہو ۔۔۔ یعنی ان کو دیکھئے۔ انگلستان میں رہتے ہیں سات آٹھ برس سے اور چلے کب تلک رہیں گے۔ روم اور پیرس میں گھوم آئے۔ یہاں چپکے سے چوک تلک نہیں جا سکتے۔

اماں تمہارے انگلستان پر نین حرف۔ وہاں مرد آدمیوں کو ہی بزدلی سکھلائی جاتی ہے۔"

"اٹاری پر گرا کبوتر آدھی رات" گلرُو نے دادرہ شروع کیا۔ گلنار بائی ٹھسّے سے مسند پر بیٹھی تھیں۔ سامنے پاندان رکھا تھا۔ گلنار بائی گاؤ تکیے سے لگی پوپلے منہ میں مُرمُرے چبا رہی تھیں۔ کمرہ خوب ہوادار تھا اور چھت کا برقی پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا مگر گرمی کے مارے شفاعت حسین کی حالت تباہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک دادرے کے بول سنتا رہا پھر چپکے سے اجّو سے پوچھا ــــ "کبوتر گرا آدھی رات کیا مطلب؟"

"PIGEON FELL AT MID NIGHT" اجّو نے سمجھایا۔

"ہاؤ سِلی" اس نے زیر لب کہا اور اکتا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یاد آیا۔ تہذیب کا تقاضا ہے جب کوئی گا رہا ہو بے دھیانی یا اکتاہٹ ہرگز ظاہر نہ کرو۔ مغنیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اب اجّو نے غزل کی فرمائش کی۔ گلرُو جب اس مصرعہ پر پہنچیں گی۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل

اجّو نے خود ہی چپکے سے شفّو کے کان میں ترجمہ کیا "DO NOT BURY ME IN YOUR LANE AFTER MURDERING ME"

"گڈ لنس گریشس ــــ" شفّو بڑبڑایا۔ یہ کھسر پُسر آداب محفل کے بالکل خلاف تھی۔ گلنار بائی نے گھور کر دیکھا۔ شفّو جھینپ کر باہر تاکنے لگا۔ نجی محفل تھی اور ان دونوں لڑکوں کے علاوہ کمرے پر اور کوئی موجود نہ تھا۔

گلرُو ریں ریں کرتی رہی۔ شفّو نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پرانا دھرانا فرنیچر، چھت میں جالے۔ باہر شکستہ سی بالکنی۔ چوک کے ان ہی بالاخانوں کے اتنے افسانے ہیں۔ پیرس کا پگال، لندن کا سوہو اور اپنے لکھنؤ کا یہ بوسیدہ گندہ مندہ چوک۔ اس نے اداسی سے سازندوں پر نظر ڈالی۔ بونا سارنگی نواز، بھُچھے نما طبلچی۔ ایک منحنی مخنث سا آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا۔ اجّو نے بتایا تھا کہ گلرُو کا ماموں ہے۔

غزل کے بعد ٹھمری۔

ارے پی کو ملن کیسے جاؤں ـــــ

ہمارے معاشرے میں اتنی افسردگی اتنا رونا پیٹنا کیوں ہے۔ شفق سوچتا رہا۔

ـــــ پیّاں پڑت ہوں بنتی کرت ہوں

ہندوستانی عورت گاتی ہے تب بھی بسورتی ہے۔ غزلیں ہیں تو ان میں نالہ و فریاد، آہ و بکا، خونِ دل دردِ جگر، لاشیں، قتل، خون، کفن، دفن، مزار، قفس، صیاد، جنون، دیوانگی، وحشت، صحرا، بے چارے لاٹ صاحب چاچا ٹھیک تو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اہلِ یورپ جیسی بشاشت، جو نچالی، صحت مندی، جوشِ حیات، ولولہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ گلرو شفق کی ہم عمر تھی مگر زردی صورت۔ ان کے چہرے پر بے پناہ حزن، سازندے سب مصیبت کے مارے۔ نانی البتہ اس بڑھاپے میں ہشاش بشاش ہنستی کتنی بیٹھی ڈبرے کے پھنکے لگا رہی تھیں۔ اسے نانی بہت دلچسپ لگیں۔ کونے میں بیٹھی چیل کی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

شفق اب بے طرح اکتا چکا تھا۔ خدا خدا کر کے گانا ختم ہوا۔ دونوں نوجوان اٹھے۔ اجو نے گلنار بائی سے پوچھا "بائی صاحب چند سال ہوئے ایک فلم آئی تھی جلتی نشانی۔ سنا ہے اس میں آپ نے بھی کام کیا تھا۔"

"ہاں بیٹا" گلنار نے وقار کے ساتھ جواب دیا "ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔ سینما سے تو میں ریٹائر ہو چکی ہوں۔"

دروازے کے قریب رکھے ہوئے بوٹ پہننے کے بعد شفق نے خالص انگلش پبلک اسکول بوائے اسٹائل میں ایک خفیف سے جھٹکے سے سر خم کر کے گلنار بائی، گلرو اور گلزار سے مصافحہ کیا۔ سازندوں کا شکریہ ادا کیا اور سب کو گڈ نائٹ اور گڈ بائی کہہ کر دروازہ کی طرف بڑھا۔ اجو نے گلنار بائی کے خاصدان میں کچھ رقم رکھنا چاہی۔ انھوں نے بڑی آزردگی سے کہا "میاں تمھارے گھرانے سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ ہمیں کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔"

تنگ و تاریک زینہ اترتے ہوئے شف نے اپنے کزن سے دریافت کیا۔ "اچھو یہ بے چاری لڑکی جو گا رہی تھی اس نے ناک میں اتنی بڑی زنگ کیوں پہن رکھی تھی۔ اس رنگ سمیت اس نے گانا تو گا لیا۔ مگر کھانا کیسے کھاتی ہوگی؟"

"یار" اچھو نے جواب دیا۔ "اب تم سیدھے اپنے ونچسٹر واپس جاؤ۔"

نوجوانوں کے نیچے اترتے ہی گلنار اور گلرو بام پر گئیں اور بنگلے پہ جھک کے نیچے دیکھنے لگیں۔ وہ دونوں موٹر میں سوار ہوئے۔ موٹر گلی سے نکلی اور نکڑ پر جا کر غائب ہوگئی۔ گلنار نے آہستہ سے کہا۔

"بالکل باپ کا ہم شکل ہے۔ اور وہی مزاج۔"

گلرو نے چونک کر ماں کو دیکھا

۸۔ گرد باد

لکھنؤ ۔ ۱۹۶۷ء ۔ ماہ جون ۔ صبح گیارہ بجے کا وقت ۔ بوڑھے ریٹائرڈ جسٹس رفاقت حسین صاحب اور ان کے صاحبزادے سید شفاعت حسین کلائیڈ روڈ پر اپنی کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں چپ چاپ بیٹھے سامنے تک رہے تھے جہاں ویران باغ میں اینٹوں سے لدے ٹرک کھڑے تھے سیمنٹ کی بوریوں کی گرد اڑ رہی تھی اور راج مزدوروں کا شور مچ رہا تھا —— دور دھوپ میں چمکتی سنسان کلائیڈ روڈ پر سے اکا دکا سائیکل رکشا یا کار نکل جاتی تھی۔ پھر ایک بگولہ تیزی سے گھومتا سڑک پر سے گزرا۔

زرد تیز گرد کے اس رقصاں بھنور میں چکر کاٹتے جا رہے تھے۔ سید شفاعت حسین نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا کہ بگولہ کتنی دور جا کر کہاں معدوم ہوتا ہے لیکن پل کی پل میں وہ غائب ہو گیا۔

تفو میاں دوبارہ اپنی سیاسی تقریر کے مسودے کی طرف متوجہ ہوئے جو وہ تیسرے پہر کو اپنی پارٹی کے ماہانہ جلسے میں پڑھنے والے تھے۔ اے لیجئے۔ کمبخت بال پوائنٹ کا ریفل بھی ختم ہو گیا۔

جھنجھلا کر قلم باہر پھینک دیا۔ پھر باہر باغیچے کو تکنے لگے جہاں نئی نئی سرخ اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔

ان کے والد جج صاحب نے آپ ہی آپ کھولتے ہوئے ایک ہنکارا بھرا اور نیشنل ہیرلڈ اٹھا کر اپنی آنکھوں کے بے حد قریب لے گئے۔

"ڈیڈی ـــ پھر پڑھنے لگے۔ کتنی بار آپ کو منع کیا ہے کہ آنکھوں پر زور نہ ڈالئے۔"

"شٹ اپ!" ڈیڈی نے ڈانٹ بتائی اور لرزاں ہاتھوں سے اخبار کے ورق کھڑکھڑائے۔

جج صاحب ہمیشہ کے غصیلے تھے۔ پیرانہ سالی نے اور زیادہ کٹ کھنا اور ضدی کر دیا تھا۔ صاحبزادے بھی تند مزاج تھے۔ اکثر دونوں باپ بیٹوں میں بات بے بات جھوڑ ہوا کرتی۔

سید شفاعت حسین عرف شفو (جن کو باپ اب بھی کبھی کبھی پیار سے شفن پکارتے تھے) ان لوگوں میں تھے جنھیں امریکن اصطلاح میں NON-ACHIEVER کہا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بہت شاندار تھا۔ آگے چل کر ٹائیں ٹائیں فش۔ باپ نے گیارہ برس کی عمر میں انگلینڈ پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ ۳۹ء کے موسم گرما میں جب لکھنؤ آکر واپس گئے اس کے ایک مہینے کے اندر جنگ چھڑ گئی۔ جج صاحب نے گھبرا کر براہ آئرلینڈ گھر واپس بلالیا۔ یہاں پہنچ کر شفن جھلائے جھلائے رہے۔ اس ملک اور اس شہر کی ہر چیز دقیانوسی۔ فرسودہ، پھٹیچر۔ یونی ورسٹی میں داخل کئے گئے۔ باقی وقت محمد باغ کلب میں انگریزوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں گزارتے۔ منگنی ہو چکی تھی۔ ماں نے اس خیال سے کہ بیٹے کا دل لگ جائے بیس برس کی عمر میں ہی شادی رچا دی۔ لیکن دولہا انگلش پبلک اسکول بوائے۔ دلہن مٹی کا مادھو، موم کی مریم۔ اللہ کا جی۔ شفن کا دل ان سے کیا لگتا۔ ادھر ادھر دو تین عشق کئے وہ بھی ناکام۔ اس ملک کی لڑکیاں تمام جھینپو، کم ہمت، کوڑھ مغز۔

جس بے دلی سے شادی کی تھی اسی بے دلی سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کر ڈالا۔ وکالت شروع کی وہ چلی نہیں۔ دراصل تحصیل معاش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ باپ بڑے آدمی۔ دولت

دافر۔شفق اس انتظار میں کلبوں اور پہاڑوں پر وقت گزارتے رہے کہ انگلستان کے حالات ذرا بہتر ہوں تو واپس چلے جائیں۔ مگر بعد از جنگ انگلستان نے اٹھا کر ہندوستان کو آزاد کر دیا۔ باپ ریٹائر ہو چکے تھے۔ تعلقہ ضبط ہوا۔ آمدنی گھٹنا شروع ہوئی۔ شفق اب پولیٹکس کی طرف متوجہ ہوئے۔ صوبائی الیکشن لڑا۔ باقی ماندہ روپیہ اس میں پھونک دیا۔ الیکشن ہار گئے یعنی ایک، تو نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ باپ اور دوستوں نے بہتیرا سمجھایا تھا۔ یہاں سیاست تمہارے بس کا روگ نہیں۔ مگر باپ ہی کی طرح ضدی۔ کہاں مانتے۔ اب خود اپنی پارٹی بنائی اس میں لگ گئے۔ گردشِ زمانہ نے ساری صاحبیت نکال دی تھی۔ شیروانی پہنے تانگے پر سوار جگہ جگہ تقریریں کرتے پھرتے تھے۔ آمدنی جس رفتار سے کم ہوئی اسی تیزی سے بچوں کی تعداد میں اضافہ۔ بیوی اتنی زرخیز اور اولاد کی شوقین کہ آٹھ نونہال پیدا کر کے ہی ریٹائر ہوئیں۔ گرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات، دائم المریض والدین کا مہنگا علاج۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ بنائے رکھنے کی فکر، مجبوراً کوٹھی کا آدھا حصہ کرایہ پر اٹھانا پڑا۔ بقیہ پانچ کمروں میں سب خاندان منتقل ہوئے۔ پھر طوطے والا بنگلہ فروخت کیا۔

جس روز طوطے والا بنگلہ بکا ہے مرزا گڑگڑی نے پیلے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بیعنامہ خاموشی سے لاکر ان کی میز پر رکھا۔ ایک پرچے پر صرف اتنا لکھ کر چھوڑ گئے ——— ب۔ ٹ۔ ت۔ ر۔ ط۔ ت۔ ب۔ ج۔ یہ مرزا گڑگڑی کے ساتھ ان کے بچپن کا ایک لطیفہ تھا۔

جب کوٹھی کا شمالی قطعہ زمین فروخت کیا گیا مرزا گڑگڑی پیوندِ خاک ہو چکے تھے۔ کوٹھی کا نصف احاطہ خرید کر اس کے نئے مالک نے "ملٹی اسٹوری اپارٹمنٹ بلاک" بنوانا شروع کر دیا۔ پچھلے دو تین مہینے سے کمپاؤنڈ میں دن بھر ہنگامہ رہتا۔ اینٹوں کے ٹرک۔ راج مزدور ہاکر۔ اجنبی چہروں کا ہجوم، بیرونی برآمدے کے آدھے حصے کے علاوہ بیٹھنے کے لئے اب اور کوئی جگہ باقی نہیں تھی۔ بحالت مجبوری دونوں باپ بیٹے وہیں کرسیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔

بہت دنوں تک جیتے رہنے کی ایک سزا یہ ہے کہ بیشتر دوست احباب اور رشتے دار پہلے

مرکر تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ جج صاحب کے دکھ سکھ کے ساتھی لاٹ صاحب کو سورگ باشی ہوئے دس برس ہونے آئے۔ وفادار جاں نثار۔ سابق منیجر لالہ درگا داس رستوگی کو بیکنٹھ سدھارے ہندو سال ہو گئے۔ باجی بیگم کی وفات کو مدتیں گزر گئیں۔ میر حقہ، مرزا گڑگڑی داستانِ پارینہ میں شامل ہو چکے۔ اور بہت سے اسی طرح ایک ایک کرکے چل بسے۔ خود اگر دو سال کے اور ہو لئے تو اسّی کے ہو جائیں گے۔ اتنی طویل عمر عذاب ہے۔ خصوصاً جب دماغ اسی طرح حسب سابق کام کر رہا ہو۔ جج رفاقت حسین اپنی آنکھوں کے تارے شفق کی مایوس بے رنگ زندگی اور سب سے بڑے پوتے مجّو کی نالائقی دیکھ دیکھ کر بیٹھے کڑھا کرتے اور زیادہ جھنجھلاتے۔ سید شفاعت حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے پہلوٹھی کی اولاد مجّو میاں کی عمر اب ماشاء اللہ سے پچیس برس کی تھی تعلیم سے بے نیاز، سینما کے شوقین، گھس گھس کر تھرڈ ڈویژن میں بی۔ اے۔ کیا۔ ڈنڈے بجاتے پھرے۔ آنجہانی لالہ درگا داس رستوگی کے نمک حلال بیٹے گھنشام داس رستوگی عرف للّو جی نے ضلع بریلی میں فیکٹری قایم کی ہے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ بے چارے آڑے وقت میں کام آئے۔ پرانی وفاداری نبھائی۔ مجّو میاں کو بریلی بلا کر اپنے کارخانے میں ٹیکنکل ٹریننگ دلوا رہے ہیں۔ وہیں ملازمت بھی دے دیں گے۔

مجّو کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں حمیدہ۔ وہ ۲۳ برس کی ہو چکیں۔ بیاہ کا کوئی بندوبست نہیں۔ خیر۔ ابھی کالج میں پڑھ رہی ہیں —— شجّو میاں کب کے ہردوئی سے پاکستان جا کر ناظم آباد کراچی میں رچ بس گئے۔ انھوں نے اپنے ایک لڑکے کا جو لاہور میں اعلیٰ افسر ہے حمیدہ کے لئے پیغام بھیجا تھا مگر بے چارے جج صاحب پوتی پر عاشق، اس کی صورت دیکھ کر جیتے ہیں۔ اسے اتنی دور دوسرے ملک بھیجنا گوارا نہ کیا۔ اب تو خیر ۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بعد وہاں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حمیدہ شکل صورت میں باپ اور دادا پر گئی ہے اور بے حد تیز طرّار، خود سر، خود رائے۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں وہ کبھی پھسڈّی۔ سینما اور سیر سپاٹے کی شوقین ان دنوں کالج کی لڑکیوں کے ساتھ کشمیر گئی ہوئی ہے۔

سید شفاعت حسین نے گھڑی دیکھی ۔ لنچ کا وقت قریب تھا۔ کرسی سے اٹھے ۔ اتنے میں سمینٹ کی بوریوں سے لدا ایک ٹرک عین برآمدے کے پاس آکر رکا۔ گرد و غبار کا بادل باپ بیٹوں کو سفید کر گیا۔ جج صاحب نے بڑبڑا کر اخبار سے اپنا سر چھپا لیا۔

"ڈیڈی اب اندر چلیئے۔"

"دیکھیے ـــــ یہ دیکھ لیجیے۔" جج صاحب اخبار بیٹے کے سامنے کر کے برافروختگی سے بولے۔ "آپ قوم کی حالت سدھارنے کی غرض سے تقریر لکھ رہے ہیں؟ قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اسے آپ کی تقریروں کی پرواہ نہیں ـــــ ملاحظہ کیجیے۔ یہ آپ کے احباب ڈوم دھاڑیوں کے ساتھ فخر سے دانت نکوسے کھڑے ہیں۔ استغفراللہ ـــــ"

شفو نے اخبار میں چھپی تصویر پر نظر ڈالی ۔ شہر کے ایک عصرانے میں بمبئی سے آئے ہوئے تین نامور فلم اسٹار چند صوبائی وزرار کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"ڈیڈ ـــــ یہاں بہت دھول اڑ رہی ہے ۔ اندر چل کر آرام کیجیے۔" شفاعت حسین نے نرمی سے کہا۔

"چلے جائیں گے۔" جج صاحب نے جھلا کر جواب دیا۔ "اب آرام ہی آرام ہے ۔ خدا کرے جلد قبرستان پہنچ کر اپنی گور میں آرام کریں۔"

شفاعت حسین نے نکرے باپ کو دیکھا۔ چراغ سحری ہیں۔ جانے کب تک ان کا سایہ سر پر رہتا ہے۔ سہارا دے کر انھیں آرام کرسی سے اٹھایا۔

اچانک جج صاحب نے پوچھا۔ "حمیدہ کی خیریت کا خط آگیا؟"

"جی ہاں۔ ڈیڈی کل ہی تو آیا تھا۔ آپ کو سنا دیا تھا۔"

"ہوں ـــــ کب تک واپس آئے گی؟"

"کالج کی ٹیم کے ساتھ گئی ہے۔ کشمیر جیسا مقام۔ ایک مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔"

جج صاحب نے مرتعش ہاتھوں سے بیٹے کا بازو تھاما۔ "حمیدہ کو واپس بلا لو۔ اسے خط

لکھو کہ جلد واپس آجائے ۔"

"بہت اچھا۔ ڈیڈی ۔"

شفاعت حسین احتیاط سے چلاتے ان کی خواب گاہ میں لے گئے ۔ تخت پر بیگم رفاقت حسین ململ کے ہلکے گلابی دوپٹے سے منہ لپیٹے بے خبر سو رہی تھیں ۔ بیٹے نے جج صاحب کو احتیاط سے مسہری پر لٹایا۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پرانے بدرنگ پردے برابر کئے اور باہر آئے ۔ بیوی حسب معمول باورچی خانے میں مصروف تھیں ۔ چھوٹے بچے سب اسکول گئے تھے ۔ کوٹھی پر بڑا وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔

شفاعت حسین اپنے کمرے میں گئے ۔ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے ۔ دوسرا قلم تلاش کیا۔ دراز میں سے دبیز نیلے کاغذ کا رائیٹنگ پیڈ نکالا جس کی پیشانی پر مرحوم تعلقے کا طغرا ثبت تھا۔ اس آخری پیڈ میں اب تھوڑے سے کاغذ باقی رہ گئے تھے ۔ ٹورسٹ ہوٹل گلمرگ کے پتے پر بیٹی کو انگریزی میں خط لکھنا شروع کیا ـــــ "میری پیاری بیٹی حمیدہ ـــــ میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنی چھٹیوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوگی ـــــ لیکن بیٹی تمھارے گرینڈ پا تمھیں بہت یاد کر رہے ہیں ۔ جلد از جلد واپس آجاؤ ۔"

۹ - دِلرُبا

اردو کے مقبول اور کثیر الاشاعت فلمی ماہنامے فانوس کے "سیاح" کی ڈائری سے ایک اقتباس :

"فلمستان سے نکل کر سیاح اپنی کار میں بیٹھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی لیکن سیاح نے تہیّہ کر لیا تھا کہ آج دلرُبا کا انٹرویو ضرور حاصل کرے گا۔ چنانچہ اپنی کار میں گلنار بانو کی عالی شان کوٹھی گلستان پر پہنچا۔ گلستاں پر ان دنوں بہار آئی ہوئی ہے ۔ گلاب کے پھولوں سے پُر باغ لہلہا رہا تھا۔ روشوں پر ولایتی کتے کھیلتے پھر رہے تھے ۔ اندر برساتی میں ، پانچ مرسڈیز گاڑیاں کھڑی تھیں ۔ پھاٹک

پر ہی گورکھے نے سیاح کو بتایا کہ میم صاحب ابھی شوٹنگ سے واپس نہیں آئی ہیں۔ لہذا وہاں سے گلنار اسٹوڈیوز کا رخ کیا۔

"فانوس کے پتنگوں کو سب سے پہلے سیاح ہی نے یہ اطلاع دی تھی کہ گلرد پکچرز کی تازہ فلم میں نئی دریافت دلربا کام کر رہی ہے۔ جب سیاح اسٹوڈیوز کے گیٹ کے اندر پہنچا تو بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ فلور ۲ پر شوٹنگ چل رہی تھی۔ سیاح نے اپنا کارڈ میڈیم گلنار کو بھیجا۔ انھوں نے فوراً اندر بلوا لیا۔ وہ اپنے خوبصورت ایرکنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھی اپنے چھوٹے بھائی کتھک استاد منو صاحب سے باتیں کر رہی تھیں۔ وسیع و عریض بلوری میز کے پیچھے دیوار پر ان کی والدہ بائی گلنار بائی مرحومہ کا بڑا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ گلنار بانو کچھ بدلی بدلی سی نظر آئیں۔ پچھلی مرتبہ جب ان کو دیکھا تھا ان کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ آج نیلے۔ سیاح کا استعجاب دیکھ کر مادام ہنس پڑیں اور بتایا کہ چند ماہ قبل اپنے منجھلے نواسے سے ملنے امریکہ گئی تھیں۔ وہاں اپنی امریکن بہو کے اصرار پر بال نیلگوں کروائے۔ گلنار بانو نے سیاح کو بتایا کہ مغرب میں "گولڈن ایج" والی خواتین اکثر اپنے بال نیلے یا کاسنی رنگوا لیتی ہیں اور بہت ELEGANT معلوم ہوتی ہیں۔

"گلنار بانو کی گفتگو ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ کہنے لگیں۔ اس دفعہ لندن میں مارلین ڈیٹریخ کا نائٹ کلب شو دیکھ کر میں نے سوچا اے ہے۔ یہ بڑی بی اس سن میں یوں جلوے دکھا رہی ہیں میں نے تو سیانی لومڑی کی طرح فقط بال ہی نیلے رنگوائے!

"سیاح نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ مادام نے مزید بتایا کہ وہ ہر سال یورپ یا امریکہ جا کر کچھ عرصہ کسی ہیلتھ فارم پر گزارتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی صحت قابلِ رشک ہے۔ اس وقت بھی سُرمئی رنگ کا امریکن ٹراؤزر سوٹ پہنے خفیف سے امریکن لہجے میں انگریزی بولتی مادام گلنار ایک شاندار شخصیت معلوم ہو رہی تھیں۔ سیاح جس غرض سے آیا تھا اسے فراموش کر کے ان سے باتیں کرنے میں محو رہا۔ تب خود گلنار بانو نے کہا۔ آپ بے بی سے ملنا چاہتے ہیں۔ آئیے اس کے ڈریسنگ روم میں چلیں۔

" ڈریسنگ روم میں نئی ہیروئن سے ملاقات ہوئی ۔ گلنار بانو نے تعارف کراتے ہوئے سیاح کو بتایا کہ یہ فلمی نام بھی انھوں ہی نے رکھا ہے ۔

" دراصل دلرُبا میڈیم گلنار ہی کی دریافت ہے ۔ اسی سال ماہ جون میں میڈیم اور ان کی بیٹی گُلرُبا بانو اپنی کمپنی کی ایک فلم کی آؤٹ ڈورز کے لئے گلمرگ گئی تھیں ۔ یہ لڑکی اپنے کالج کے گروپ کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی ۔ ایک روز شوٹنگ دیکھنے آئی ۔ گلنار بانو سے ملاقات ہوئی انھوں نے اسے فلم میں کام کرنے کی دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی ۔

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں اتنی آسانی سے ایک بڑے BANNER کی پکچر میں لے لی گئی " دلرُبا نے سیاح سے کہا ۔

"گلنار بانو نے سیاح کو بتایا کہ وہ نصف صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ سے شو بزنس میں ہیں ۔ پہلے تھیٹر، پھر خاموش بائیسکوپ، پھر ٹاکی ۔ اب کلر سینما اسکوپ ۔ اور پچھلے پندرہ سال سے خود فلم پروڈیوس کر رہی ہیں ۔ لیکن دلرُبا جیسی باصلاحیت اداکارہ انھوں نے اب تک نہیں دیکھی تھی ۔

" دلرُبا نے شرما کر کہا ۔ ممی یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے "

"اتنی دیر میں میڈیم گُلرُو بھی کمرے میں آگئیں ۔ ان کے تینوں لڑکوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے ۔ سب سے بڑا بیٹا ہالی وڈ میں فلم ڈائرکشن سیکھ کر آیا ہے ۔ دلرُبا کی پکچر وہی ڈائریکٹ کر رہا ہے ۔

" دلرُبا نے انٹرویو کے دوران سیاح کو بتایا کہ وہ شمالی ہند کے ایک معزز اور بے انتہا قدامت پرست گھرانے سے تعلق رکھتی ہے ۔ بلکہ اس اچانک اطلاع پر کہ اس نے کشمیر سے بمبئی جا کر فلم لائن اختیار کر لی دلرُبا کے دادا پر فالج کا اثر ہو گیا اور والد کو دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں ۔

" میں ان کو دیکھنے گھر جانا چاہتی تھی لیکن انھوں نے آنے کی اجازت نہیں دی ۔ مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے ۔ گرینڈ فادر اور ڈیڈی کی علالت کا مجھے بہت افسوس ہے ۔ مگر میں آرٹ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں اور آرٹ کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں ۔ اتنے میں اسسٹنٹ

ڈائریکٹر نے آکر کہا کہ شاٹ تیار ہے۔ اور دلرُبا سیاح کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئی۔

"گلنار بانو باتوں کی موڈ میں تھیں۔ بتایا کہ دلرُبا ان کے ساتھ گلستان ہی میں رہتی ہے۔ میں اور گلرو اسے اپنی اولاد کی طرح رکھتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں میری بیٹی گلرُو کے ہاں تین لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے۔ میری والدہ مرحومہ اپنی پرنواسی کا جشنِ ولادت دھوم دھام سے منانے کا ارمان دل میں لئے لئے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے گلرُو کو ایک بنی بنائی بیٹی اور مجھے نواسی عطا کی اور اس کارسازِ حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔"

سیتا ہرن

(۱)

وہ دوپہر بھی ہمیشہ کی طرح بڑی عام سی دوپہر تھی جب ڈاکٹر سیتا میرچندانی کو معلوم ہوا کہ جمیل نے دوسری شادی کر لی۔ گھڑی اسی طرح ٹک ٹک کر رہی تھی۔ نومبر کے آسمان پر پرندے اسی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔ ایشین تھیٹر انسٹی ٹیوٹ میں لڑکیاں اور لڑکے "بچوں کے تھیٹر" کی کلاس میں اسی طرح کٹھ پتلیاں بنانا سیکھ رہے تھے۔ وہ للتا سے ملنے یہاں آئی تھی تین بجے اسے ہما کے یہاں پہنچ کر شہزاد کے ہمراہ "مدرا راکھشش" کے ریہرسل میں جانا تھا۔ رات کو ماڈرن تھیٹر کے اراکین نے اسے مسز ڈوولی سین کے یہاں کھانا کھانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ زندگی کتنی مصروف تھی (اور کتنی خالی تھی) ڈھائی بجے وہ متھرا روڈ سے بس میں بیٹھ کر ملی پور لین کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ کمشنر لین میں آ کر "پیلی کوٹھی" کی سرخ بجری والی طویل سڑک پر پہنچی تھی۔ "پیلی کوٹھی" کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو ہلو ہلو کرتی "نیلی کوٹھی" کے گارڈن ہاؤس کی گیلری میں داخل ہوئی تھی۔ دروازے کے برابر شہزاد کا کمرہ تھا۔ اس نے جھانک کر کمرے میں سے دیکھا تھا کہ شہزاد ابھی تک مزے سے سو رہا تھا۔ وہ ہما کے

کمرے کی طرف جا رہی تھی جب گیلری کے دوسرے فون کی گھنٹی تھرانا شروع ہو گئی۔ فون بہت دیر سے بج رہا تھا اور بیچ میں چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا تھا۔ اس وقت تین بجا تھا۔ دوسرے سرے پر بلقیس زور زور سے کہہ رہی تھی "ہما کیا سیتا تمھارے یہاں پہنچ گئی ہے؟"

"ہاے۔ بلقیس —— میں سیتا بول رہی ہوں۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"ارے تم بڑی جلدی پہنچ گئیں، خاص بات ——؟ اوہ —— ارے ہاہاہا —— آج بڑا مزا آیا —— پردیپ نے کامران سے کہا۔"

"بلقیس —— تم نے اس وقت مجھے کیوں فون کیا ہے؟"

"کچھ نہیں —— ایسے ہی ——" بلقیس کی آواز معمول سے زیادہ پرسکون تھی۔ "ہی ہی ہی۔ میں نے سوچا ذرا معلوم کرلوں آج کی خبریں کیا ہیں؟ تم نے للتا کو حمیدہ کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟" اس کے بعد کوئی بیس منٹ تک بلقیس نے شہر کی تھیٹر گوسپ کی تھی۔

اب ساڑھے تین بجا تھا۔ سیتا نے عاجز آکر کہا تھا —— "بلی ڈیر —— کیا تم نے مجھے یہی سب بتلانے کے لئے فون کیا ہے؟"

"ارے بھئی —— وہ ——"

"نیویارک سے کوئی خط آیا ہے؟"

"ہاں" بلقیس کی آواز کا مصنوعی جوش یک لخت مدھم پڑ گیا۔

"کیا بات ہے بلقیس؟"

"جمیل بھیا نے —— جمیل بھیا نے شادی کر لی۔"

گھڑی کی ٹک ٹک۔ شہزاد نے زور سے کروٹ بدلی اور اس کے پلنگ کے اسپرنگ بج اٹھے۔ باہر عنابی گلاب کی کیاریوں کے پاس ہما کا بچہ ٹھوں ٹھوں کر کے رویا۔ کھانے کے کمرے میں

بشن سنگھ نے کھٹاک سے الماری بند کی۔

"کس سے ——؟" سیتا نے اس طرح پوچھا گویا اندھے کنویں میں سے بول رہی ہے۔

"کوئی کونٹیننٹل لڑکی ہے ——" میلوں دور جانکیہ پوری میں بلقیس کے گھر کی زندگی بھی معمول کے مطابق جاری تھی۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ چار کے برتن کھڑکھڑاتے تھے۔ چھوٹی خالہ رام اوتار پر بگڑ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں بلقیس کی بڑی بھانجی فرش پر اکڑوں بیٹھی ٹیپ ریکارڈر چلا رہی تھی —— تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار —— دروازہ بھیڑ دو۔ خاموش! ارے بولے مت چلے جاؤ بھئی۔ واہ واہ بہت خوب۔ کیا بات ہے —— کہ غمزہ و ادا کیا ہے —— ارے بھئی دوبارہ پڑھئے گا —— تمام عمر رہا ——" یہ غزل بلقیس کے یہاں چند روز ہوئے کسی شاعر نے ترنم سے پڑھی تھی۔ اور سیتا کو بہت پسند تھی۔

ان سب آوازوں میں مل کر بلقیس کی آواز صاف سنائی نہیں دی۔

" ذرا زور سے بولو بھئی۔ تمھارے یہاں بہت رولا بج رہا ہے۔" سیتا نے تقریباً چلا کر کہا تھا۔

" ایک کونٹیننٹل لڑکی سے تفصیل معلوم نہیں۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ یو۔ این۔ میں اُن کے دفتر میں کام کرتی ہے —— کوئی ہوگی —— ارے مُظفر بھیا —— میرے سر پر کیوں جھول رہے ہو۔ باہر جا کر کوُدو۔ ارے ہاں کوئی ہوگی ویٹرس یا ٹائپسٹ کمبخت۔"

"وہ میری طرف سے ایلزبتھ ٹیلر سے بیاہ کرلیں مجھ سے مطلب ——" سیتا نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ وہ فون کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر ٹک چکی تھی۔ گیلری بہت تاریک تھی۔ اور غیر معمولی طور پر سرد۔

"اس میں صرف ایک قباحت ہے سیتا ڈیر —— ایلزبتھ ٹیلر تو بیاہ رچا چکی ہے اور سنا ہے پرنسس مارگریٹ کے بھی آج کل میں ہاتھ پیلے ہونے والے ہیں۔ ساری دنیا میں یہی دو لڑکیاں انھیں پسند تھیں اور تیسری نرگس تو وہ بھی حال ہی میں اپنے گھر بار کی ہو چکی۔"

بلقیس انور علی ملک کی چوٹی کی اسٹیج ایکٹرس ہونے کے ناتے اب پھر بڑی نارمل آواز میں بات کر رہی تھی ۔ اس سال اسے دہلی ناٹیہ سنگھ کی طرف سے بہترین ایکٹرس ہونے کا ایوارڈ ملا تھا ۔ ماڈرن تھیٹر کی اگلی پیش کش میں وہ غضب کی المیہ اداکاری کرنے والی تھی ۔ پھر وہ اپنی آواز سے کس طرح ظاہر ہونے دیتی کہ دراصل کیا سوچ رہی ہے ۔

"بلقیس ــــ"

"ہاں بھائی، بیتا ــــ"

"اچھا میں ذرا ہما سے مل لوں ۔ شام کو ملاقات ہوگی ــــ بائی ــــ"

"بائی ــــ بیتا ــــ"

(۲)

بلقیس نے ریسیور رکھ دیا اور لاؤنج میں سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی ۔ درمیان والے کمرے میں چھوٹی خالہ فالسئی شال میں سر سے پاؤں تک لپیٹی تلسی پورے آئے ہوئے کسی رشتے دار سے باتوں میں مصروف تھیں ۔ پچھلے لان پر بچے کرکٹ کھیل رہے تھے ۔ اواخر خزاں کا سورج بہت دھندلا دھندلا لاؤنج کے شیشوں میں سے جھانک رہا تھا ۔ اپنے کمرے میں جا کر بلقیس نے سنگھار میز سے خط اٹھایا جو کلینکس کے ڈبے پر آدھا کھلا پڑا تھا ۔ اسٹول پر ٹک کر اس نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا ۔ اس کے چہیتے خالہ زاد بھائی نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آخر میں صرف ایک پیرا اور لکھا تھا ۔

"ــــ میں نے پچھلے اتوار کو ایک اسپینش لڑکی سے شادی کر لی ۔ وہ میرے ہی سیکشن میں کام کرتی ہے ۔ بہت معقول لڑکی ہے ۔ انٹلکچوئیل نہیں ہے ۔ اسمتھ کالج کی تعلیم یافتہ ہے جو یہاں کا بڑا سخت ارسٹوکریٹک کالج ہے ۔ چنانچہ اطمینان رکھو ۔ تمہاری بھاوج

"شاپ گرل" نہیں جو تم نیٹو لڑکیوں کا راسخ عقیدہ ہے کہ تمہارے ناخلف بھائی لوگ مغرب میں آکر شاپ گرلز اور بقول تمہارے دھوبنوں کو سمیٹ لاتے ہیں ـــــ واقعی!!! تم لوگ کس قدر زبردست اسنوب ہو۔ بہرحال تصویر آیندہ بھیجوں گا۔ کارمن خوبصورت نہیں مگر ساری پہن کر بالکل ہندوستانی لگے گی۔ کیوں کہ جو آج بھی اس دیش میں عام ہے چشم غزال وغیرہ۔ یہ بات اماں کو بتلا دینا۔ راہل اچھی طرح ہے۔ کارمن سے ابھی سے بہت ہل گیا ہے اور خوب موٹا ہو رہا ہے ماشاءاللہ سے۔ میں کل ہی کارمن کے ساتھ اس کے اسکول گیا تھا۔

تم اگلے سال فال کے زمانے میں یہاں آؤ۔ جب مشرقی ساحل کے شاندار جنگل سرخ پتوں کی آگ سے بالکل دہک اٹھتے ہیں۔ سنا ہے تم کو یہاں آکر ایکٹنگ سیکھنے کے لئے اسکالرشپ مل گیا ہے۔ کب تک آرہی ہو ــــ؟ ہم لوگ کرسمس کے لئے بوسٹن جائیں گے۔"

سیتا کے متعلق اس نے ایک لفظ نہیں لکھا تھا۔

سیتا جو اس کے بیٹے راہل کی ماں تھی۔

۱۹۵۱ء میں بلقیس کے پاس جمیل کا خط اسی نیویارک سے آیا تھا۔ (اس روز بھی وہ اسی طرح ایک ریہرسل کے لئے باہر جانے والی تھی۔ یہی سب لگے تھے۔ یہی دنیا۔ یہی مصروفیتیں) اور چند گھریلو باتوں کے بعد اس نے لکھا۔

"ــــ اور کوئی خاص بات قابلِ تحریر نہیں۔

ہاں ایک چیز البتہ بتلانا بھول گیا۔ میں نے پچھلے ہفتے ایک سندھی لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ کولمبیا میں سوشیولوجی پڑھ رہی ہے۔ ذات کی عامل ہے جو سندھیوں میں بڑی اونچی ذات سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اماں کو کم از کم یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ میں نے کسی "نیچ فرنگن" کو پلّے نہیں باندھ لیا۔ اب بٹیا تم اس اشتیاق میں مری جارہی ہوگی کہ اس کی شکل کیسی ہے۔ تو بھئی بے حد گوری ہے۔ ایک دم سرخ و سفید اور کافی خوبصورت ہے۔ عورتوں کے حسن کی تعریف کے معاملے میں ہمیشہ کا کنجوس ہوں (کیوں کہ ذراسی تعریف سے ان کا دماغ خراب ہوجاتا ہے۔) مگر یہ واقعی اچھی خاصی

قبول صورت لڑکی ہے ۔ قد میں تم سے ذرا نکلتی ہے ۔ اردو بہت صاف نہیں بولتی مگر بڑا پائینچہ پہن کر عین مین چاند پور موضع تلسی پور ضلع فیض آباد کی سیدانی معلوم ہوگی ۔ اطمینان رکھو۔

ہم نے ابھی سے طے کر لیا ہے کہ بچے کا نام راہل رکھیں گے ۔ راہل ـــــ چوں کہ تم جاہلِ مطلق ہو اس لئے بتانا پڑے گا کہ گوتم بدھ کے بیٹے کا نام تھا۔ اب تم کو زبردست شوک پہنچا ہوگا کہ میری بیوی ایسی فروڈ ہے کہ ابھی سے اس طرح کی باتیں ڈسکس کرتی ہے ۔ تو بٹیا قصہ یہ ہے کہ تم ہو اب تلک ایک نمبر کی دقیانوسی اولڈ انڈین پھیچر ۔ باوجود اپنی ساری اعلیٰ تعلیم اور ترقی پسندی کے، اب تک سخت فیوڈل بھی ہو۔ سیتا ایک دم ہی عورت ہے۔ تم لوگوں کی طرح قصباتی نہیں ـــــ بہر حال تو بچے کا نام راہل ہوگا اور اگر لڑکی ہوئی تو اس کا نام گل رخ رکھیں گے ۔"

بلقیس نے خط میز پر رکھ دیا۔ بڑی لرزہ خیز بات تھی ۔ دونوں خط ایک تھے ۔ ایک ہی آدمی نے لکھے تھے ـــــ پھر اس نے آہستہ سے اٹھ کر الماری کھولی اور ساریاں نکال نکال کر الٹتی پلٹتی رہی ۔ ابھی اس کو تیار ہو کر " مدرا راکھشش " کی رہرسل لینے جانا ہے ۔ اگلے آدھ گھنٹے میں وہ سب اکٹھے ہوں گے ۔ وہ سب پرانے دوست ـــــ للتا ـــــ راکیش ـــــ کامران ـــــ حمیدہ ـــــ شہزاد ـــــ جانے پہچانے چہرے، مانوس ہستیاں ۔ زندگی اسی طرح جاری رہے گی ۔

(۳)

گیلری کی دوسری طرف ہما کے ڈریسنگ روم میں کوئی چیز گرنے کی آواز آئی ۔ ہما اب تولیہ سر پر لپیٹ کر غسل خانے کے دروازے سے باغ میں اتر چکی تھی ۔ اس کے کمرے کا جو دروازہ جمنا کی طرف کھلتا تھا اس پر زرد گلاب کی بیلیں جھک آئی تھیں ۔

وہ فون بند کر کے اٹھی اور دروازے میں جا کر سکتے کے عالم میں باہر دیکھتی رہی ۔ پھر پردہ ہٹا کر ہما کے کمرے میں گئی ۔ کمرہ خالی تھا ۔ وارڈروب پر بہت سے پکچر پوسٹ کارڈ اور ہما

کے مرہٹہ شوہر کی تصویر سجی تھی جو کسی اعلیٰ ٹریننگ کے لئے لندن گیا ہوا تھا۔ بچے کی بید کی ٹوکری مسہری کے برابر رکھی تھی۔ صوفے پر نیلے رنگ کی کٹک کی ساری پڑی تھی جو ہما اسی صبح کوکو ٹینزروے سے خرید کر لائی تھی۔ کونے کی میز پر چغتائی کی "انڈین پینٹنگز" کی جلد پر دودھ کی بوتل دھری تھی۔ سرخ روغنی فرش پر خزاں کے مدھم سورج کی مدھم کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ گارڈن ہاؤس کے سارے دروازے باغ میں کھلتے تھے جہاں زرد پتے اڑاڑ کر کواڑوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔ بڑا سناٹا تھا۔

چند لمحوں بعد برابر کے کمرے میں کھٹر پٹر ہوئی۔ ہما کا چھوٹا بھائی شہزاد کود کر پلنگ پر سے اترا اور پھر غسل خانے کے شاور میں سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی جو بیڈ روم "بیلی کوٹھی" کے رخ پر تھا اس کے دروازے پر ہما کی اماں مونڈھا بچھائے بیٹھی گیتا پڑھ رہی تھیں۔ کس قدر دقیانوسی مذہبی عورت تھیں۔ اتنے تعلیم یافتہ روشن خیال بچوں کی ایسی اولڈ فیشن ماں۔ اس کی اپنی ماں بھی اتنی ہی مذہبی تھی۔ اس کی ساس بھی۔ بلقیس کی ماں بھی۔ شالوں اور ڈوپٹوں میں لپٹی لپٹائی گڑیا ایسی چھوٹی چھوٹی کمزور عورتیں جو ہر سمے اپنے بچوں کے لئے دعائیں مانگتی تھیں، اچھے اور برے شگون دیکھتی تھیں، برت اور روزے رکھتی تھیں۔ مائیں مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ وہ خود ماں تھی۔ ہما بھی اب ماں بن چکی تھی۔ جو اپنا سارا جرمن فلسفہ بھول کر کل سے اپنے بچے کی معمولی سی بیماری کی وجہ سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور ڈاکٹروں کو فون پر فون کر رہی تھی۔

وہ گیلری کی سیڑھیاں اتر کر باہر آگئی۔ لان کے اس پار "بیلی کوٹھی" کے چبوترے پر بان کی کھری کھاٹ بچھائے اوماجی اپنے لڑکے کو ہندی پڑھا رہی تھیں۔ روش کے دونوں طرف بڑے بڑے گلاب روشن تھے۔ وہ روش پر سے گزر کر چبوترے پر آئی۔ اوماجی نے اس کی آہٹ پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خاموشی سے مسکرائیں اور پھر کتاب پر جھک گئیں — "ہاں پڑھو ——

بندیلے ہر بولوں سے یہ ہم نے سنی کہانی تھی خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

لیکن بچّے نے پڑھنے کے بجائے اپنی ماں سے جھگڑنا شروع کیا ــــ "ممی ــــ میں تو نہیں پڑھتا ــــ اچھا ایک روپیہ لاؤ تو آگے پڑھوں گا ــــ"

"چلو شرارت مت کرو ــــ پڑھو آگے" ادا جی نے ڈانٹا ــــ

"یہ مردانی کیا ہوتا ہے ــــ؟"

"بہادر ــــ" ادا جی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

بچّے نے ہل ہل کر پڑھنا شروع کیا۔ سیتا چند لمحوں تک ٹھٹھک کر یہ پرسکون منظر دیکھا کی۔ پھر بھابھی کے پرانے کمرے میں داخل ہوئی جس میں وہ اپنے بیاہ سے پہلے رہا کرتی تھی۔ الماریوں میں اس کی کتابیں بے کسی کے عالم میں پڑی تھیں۔ دیواروں پر مانی پوری گڑیاں اور جگن ناتھ جی کے چوبی بت آویزاں تھے۔ برابر کے کمرے کی ایک الماری بھی دیوی دیوتاؤں سے بھری ہوئی تھی۔ درمیانی تختے پر دیوی کی ننھی سی مسہری تھی۔ منگل کے منگل دیوی کو نئی "پوشاک" پہنائی جاتی تھی۔ اس گھر میں دیوی دیوتاؤں کی اس قدر بھرمار تھی کہ سیتا کا جی ہولا جاتا تھا۔ بھابھی ان مورتیوں کو فرنیچر کا ایک حصہ سمجھ کر ان کی طرف سے بالکل بے نیاز تھی۔ وہ مذہبی یا غیر مذہبی کچھ بھی نہیں تھی ایک نارمل قسم کی لڑکی تھی۔ یہ تو سیتا ہی کے دماغ میں فتور تھا کہ وہ مذہب، سیاست، زندگی، موت، دنیا بھر کی ہر چیز کے متعلق سوچ سوچ کر دیوانی ہوئی جاتی تھی ــــ مگر اب بھابھی بھی اپنے نوزائیدہ بچّے کو لے کر ہر منگل کو اپنی ماں اور پھوپھیوں کے ساتھ کالیکا جی کے مندر جایا کرتی تھی۔

سیتا ڈرائینگ روم سے نکل کر سامنے کے برآمدے میں آگئی۔ جدھر سے پرائیویٹ روڈ بل کھاتی ہوئی علی پور روڈ کی سمت مڑتی تھی۔ سامنے سے بھابھی کی ایک اور کزن پرمیلا اپنے دفتر سے واپس آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر سیتا کو ہیلو کہا اور امرتیوں میں غائب ہوگئی۔ سیتا پھر اندر لوٹی اور سارے کمروں میں گھومتی پھری۔ اسے یہ کوٹھی ہمیشہ سے پسند تھی۔ اس گھر میں آکر اس کے مکینوں سے مل کر اسے ہمیشہ ایک عجیب سی راحت اور حفاظت کا احساس ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کتنی پرامن تھی۔ ان کے یہاں کوئی دماغی یا نفسیاتی یا جذباتی الجھنیں نہیں تھیں۔

ساٹھ ستر برس سے یہ خاندان پانچ چھ بڑی بڑی کوٹھیوں میں اسی طرح رہتا آیا تھا۔ ان کے پرکھ اورنگ زیب کے زمانے سے مغل دربار میں وقائع نویس اور منشی تھے اور مغل بادشاہوں نے ان کو رائے راجہ کا خطاب دیا تھا۔ ہما کے دادا صاحب دیوان تھے پردادا نے لغت تصنیف کی تھی۔ نگڑدادا نے فارسی شعراء کا تذکرہ لکھا تھا۔ ہما کی اماں بعض دفعہ ایسے ایسے محاورے استعمال کر جاتیں جو سیتا کی سمجھ میں نہ آتے۔ جب پردہ کہتیں ــــ اری لکھنؤ میں تیری سسرال ہے۔ اب تو زبان سیکھ لے ۔۔۔۔ پھر خود ہی ناک بھوں چڑھا کر کہتیں ــــ "اور لکھنؤ والے نگوڑے بھی اردو کیا جانیں ــــ پوربیے نہیں تو ــــ"

یہ اس قدر شائستہ، مہذب، نستعلیق وضعدار اور غیر سیاسی قسم کے لوگ تھے کہ سیتا کو حیرت ہوتی تھی۔ اتنا بڑا ہنگامہ آکر گزر گیا۔ دنیا تہ وبالا ہوگئی مگر یہ لوگ اسی سکون سے ان کوٹھیوں میں بیٹھے رہے۔ وہ خود بے خانماں ہو کر ہندوستان کے مختلف رفیوجی کیمپوں میں ہوتی ہوئی، ۱۹۴۸ء میں دلی آئی تھی۔ یہاں اس کی ملاقات ہمارے بلقیس کی بڑی بہن فرخندہ باجی کے گھر پر ہوئی تھی، جو لوک سبھا کی ممبر تھیں۔ ان کے وہاں صبح سے شام تک شرنارتھیوں اور ہراساں مسلمانوں کا تانتا بندھا رہتا اور وہ انتہائی دردمندی اور صبر کے ساتھ ان سب کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہتیں۔ ہما جو اسی سال آئی۔ اے۔ ایس میں کامیاب ہوئی تھی وزارت آبادکاری میں کام کر رہی تھی۔ اس روز فرخندہ باجی کے ڈرائینگ روم کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک خوفزدہ سی لڑکی کو بلقیس نے اپنے قریب بلا کر ہما سے کہا تھا ــــ (جو اسی وقت اپنی لمبی عنابی رنگ کی نیش ڈرائیو کرتی ہوئی آکر اتری تھی) "ہما اوما جی کل سندھی کرلھت کی ساری بنوانے کو کہہ رہی تھیں۔ سیتا کی والدہ بڑی خوبصورت ساریاں کاڑھتی ہیں۔"

"او ــــ ہاؤ ونڈرفل ــــ" ہما نے کہا تھا۔ "ایک کاٹن ساری کا پلو اور بیل آپ کتنے میں بنوا دیں گی ؟"

"دس روپے ــــ" سیتا نے کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس وقت یہ محسوس

کرکے کہ وہ مفلس اور قابلِ رحم شرنارتھی ہے، اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا — پھر ایک روز وہ بلقیس کے ساتھ ہی ہما کے گھر گئی تھی۔ اس کے کمرے کے دوسرے افراد کی کوٹھیاں پاس پاس تھیں اور اپنے رنگوں کی مناسبت سے مشہور تھیں۔ ہما اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ "نیلی کوٹھی" میں رہتی تھی۔ اس کے تایا "پیلی کوٹھی" میں، منجھلے چچا "لال کوٹھی" میں اور چھوٹے چچا "ہری کوٹھی" میں رہتے تھے۔ یہ سب بے حد زندہ دل، خوش باش، دوست نواز اور پُرخلوص قسم کے لوگ تھے۔ ان کی ان گنت لڑکیاں کالجوں اور اسکولوں میں پڑھ رہی تھیں۔ لڑکے بھی زیادہ تر زیرِ تعلیم تھے۔ شہزاد، مہتاب، اقبال، گلزار، نہال، خشونت اور جانے کون کون — غرور ان لوگوں میں نام کو نہیں تھا۔ اس کے باوجود سیتا شروع شروع میں ان سے کھنچی کھنچی رہتی۔ وہ اس وقت بہت کم عمر اور حساس تھی۔ فرخندہ باجی اور ہما اس سے بڑی بہنوں ایسا برتاؤ کرتیں تو اس کی آنکھوں میں فوراً آنسو آجاتے۔

یہ اس کے ساتھ کیسی مصیبت تھی کہ دردمندی اور اخلاص کی ایک ایک ذرا ذرا بات اس کے دل پر لکھی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ گرمیوں میں جب وہ سب نرگس کی نئی فلم کا ایک سیکنڈ شو دیکھنے کناٹ سرکس گئے تھے اور برآمدے کے ستونوں کے پاس ایک پھول والا جوہی کے گجرے بیچ رہا تھا۔ سیتا نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ نعمت ماما نے فوراً اس کے لیے گجرا لا دیا تھا۔ اس کے بعد جب دوبارہ سینما دیکھنے اس جگہ پر گئے تو نعمت ماما کار سے اتر کر خود ہی لپکے ہوئے جا کر گجرا خرید لائے تھے — "مجھے معلوم ہے تمھیں سفید پھول پسند ہیں —" نعمت ماما اب اتر پردیش میں کہیں فارمنگ کر رہے تھے۔ ان کا بیاہ ہوگیا تھا۔ شہزاد بھی اب بڑا ہو چکا تھا۔ بلکہ اسے تو آئی۔ اے۔ ایس۔ میں آئے بھی سات آٹھ سال ہونے آئے تھے۔ اب تک وہ مغربی بنگال کے اضلاع میں تعینات تھا اور حال ہی میں تبدیل ہو کر مرکز میں آگیا تھا۔ ہما کے والد کے انتقال کو اب تین سال ہو چکے تھے۔ ہما نے شادی کر لی تھی اور شوہر کے لندن جانے کے بعد وہ گارڈن ہاؤس میں اپنے والد کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اب وہ اپنے بچے میں

اس قدر مصروف تھی کہ سیتا کی طرف توجہ کرنے کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ شہزاد تندہی سے تھیٹر مومنٹ میں جٹا ہوا تھا۔ ہما کی ساری چچازاد بہنیں تعلیم سے فراغت پاکر ملازم ہوگئی تھیں۔ چند ایک اپنے اپنے گھر سدھار چکی تھیں۔ لڑکے بڑے ہوگئے تھے۔ اقبال اور مہتاب فوجی افسر تھے اور کشمیر میں تعینات تھے۔

پچھلے نو سال میں اس خاندان میں کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ یہ گھر جو ہمیشہ امن و سکون کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا ذرا بدلا بدلا سا الگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود یکسر بدل چکی تھی۔

لیکن یہ کمرے۔ قالین، پرانا فرنیچر، تصاویر، پردے، فرش کے ٹائل، باغ کے پھول، ہر چیز وہی تھی۔ یہ گھر اب بھی بندرگاہ میں ٹھہرا ہوا ایک محفوظ خاموش جہاز تھا جس میں کبھی کبھی آکر وہ یہاں کے سکون سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ نیچے بل کھاتی ہوئی طویل خاموش سڑک کے پرے جمنا جی اسی سکون سے بہہ رہی تھیں۔ کیا واقعی اتنا سکون ممکن ہو سکتا ہے؟ کمروں کا چکر لگا کر وہ پھر ہما کے پرانے کمرے میں واپس آگئی۔

"اری سیتا ـــــ کہاں گھومتی پھرے باؤلی سی۔ باہر آجا۔ اندر بڑی سیلن ہے ـــ" چبوترے پر سے ہما کی اماں کی آواز آئی جو کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتی اپنے دیوی دیوتاؤں والے کمرے کی طرف جا رہی تھیں ـــــ وہ ان کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں آگئی اور ذرا سہم کر دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"اری ان کو پرنام تو کرلے۔ تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ بھگوان تو ہر شے میں ہیں۔ اری باؤلی ڈرے کیوں ـــــ میری بھی دو بھتیجیوں نے مسلمانوں سے بیاہ کرلیا۔ آج کل یہی ہوا چلی ہے۔ اب ان کو گھر سے نکال تھوڑا ہی دیا۔ باپ نے اتنا بڑا ایٹ ہوم دیا تھا ـــــ کیا نام ہے اس کا۔ مجھے نگوڑے کا نام ہی یاد نہیں رہتا۔ میری اپنی ہمانے غیر کفو میں شادی کرلی۔ اتنی دور مرہٹواڑے چلی گئی ـــــ پھر اب کیا ہو ـــــ زمانہ ہی ایسا ہے۔" اماں نے الماری کھول کر مٹی سے دیپ مجلی میں

چراغ جلاتے ہوئے کہا۔

وہ الماری کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی جہاں گمر وندے کی طرح دیوی دیوتا سجے تھے۔ پیچھے مہنتوں اور سادھوؤں اور جوگیوں کے فوٹوگراف رکھے تھے اور ان پر گیندے کے ہار پڑے ہوئے تھے۔

ہما کی اماں سے سیتا کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس وجہ سے وہ ان سے ذرا سی خائف رہتی تھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں وہ دلّی میں تھی تب یہ اپنے بھائی کے پاس لکھنؤ گئی ہوئی تھیں۔ تین سال قبل جب وہ امریکہ سے چند مہینے کے لئے دلّی آئی تھی تب ہی ان سے پہلی دفعہ مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ یہ حسب معمول گھاس پر مونڈھا بچھائے گیتا پڑھ رہی تھی۔ ہما نے آگے بڑھ کر کہا تھا "اماں — یہ سیتا ہے"۔

"آداب عرض —" سیتا نے حسب عادت ایک ہاتھ سے سلام کرتے ہوئے کہا تھا۔

انھوں نے عینک پیشانی پر چڑھا کر اپنی بڑی بڑی شربتی آنکھیں جھپکتے ہوئے اسے غور سے دیکھا تھا اور ذرا مسکرا کر کہا تھا۔

"نام تو تمھارا سیتا ہے اور جے رام جی کے بجائے آداب عرض کہتی ہو — !"

اور باہر آکر کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے غصے سے کہا تھا۔ "ہما تمھاری اماں بھی خوب ہیں۔ میں جے رام جی کیوں کہوں؟ آئی ایم ناٹ اے سلی ہندو"۔

اماں ایک بڑی شدید مقناطیسی آنکھوں والی جوان سنیاسن کی تصویر پر سے ہار بدلنے میں مصروف ہوگئیں۔ گلے میں تلسی مالا پہنے، بال بکھرائے اور بغیر بلاؤز کی ساری لپیٹے یہ سنیاسن اک مرگ چھالا میں بیٹھی کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور سامنے وچتر دنیا رکھی تھی۔ دوسری تصویر میں وہی سنیاسن اور بھی زیادہ مقناطیسی آنکھوں والے نوجوان سنت کے ساتھ تخت پر بیٹھی تھی — سنت بڑا سخت ہینڈسم تھا۔

"اماں — یہ کہاں رہتے ہیں؟" سیتا نے آہستہ سے سوال کیا۔

"یہ — اپنا شریر چھوڑ چکے"۔

اوہ ـــــ واٹ اے پٹی۔ اتنا خوبصورت تھا بے چارہ۔

"اور یہ ـــــ؟" اس نے سنیاسن کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ـــــ؟ رادھاجی ـــــ یہ بھی دو برس ہوئے اپنا شریر چھوڑ چکیں۔"

"یہ دونوں ـــــ؟"

"ہاں ـــــ یہ دونوں دنیا کی نظروں میں میاں بیوی تھے۔ بچپن میں رادھاجی کا ان سے بیاہ کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ کبھی میاں بیوی کی طرح رہے نہیں۔"

نان سنس ـــــ سیتا نے دل میں کہا۔ اماں اب دیوی کی پوشاک بدل رہی تھیں۔

"اماں۔ آپ کو سادھوں سنتوں کی سنگت میں بڑے بڑے طاقت ور سنت ملے؟" کچھ دیر بعد سیتا نے پوچھا۔ اس نے اپنی دانست میں SPIRITUAL POWER کا ترجمہ طاقت ور کیا تھا۔ آخر دس سال سے وہ اردو پڑھ رہی تھی ـــــ "مجھے جو سنت ملے بڑی اونچی روحانی طاقت کے ملے۔" انھوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ ـــــ"

"آج دیوی کو ہما کی پھوپھی کے یہاں جانا ہے۔" اماں نے مورتی پر مکٹ سجا کر کہا۔

"اچھا ـــــ"

وہ باہر آ گئی۔

بے معنی ـــــ بے معنی ـــــ زندگی کس قدر بے معنی تھی۔

اب لان پر ہما کے تین چار کزن جمع ہو چکے تھے۔ ہما گلابی ہاؤس کوٹ میں ملبوس ٹہل ٹہل کر بچے کو سلا رہی تھی۔ شہزاد بھی نہا دھو کر اندر سے نکل آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھا کہ سیتا اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ بہت کم عمر تھا۔ حد سے حد چھبیس ستائیس برس کا رہا ہوگا اور کمبخت کی قیامت کی آنکھیں تھیں اور کس قدر خوبصورت بال۔

"ہلو سیتا۔ دس از کیلاش"۔ شہزاد نے کہا۔

"ہلو—"

"مسز جمیل آپ آج ہماری ریہرسل دیکھنے آرہی ہیں—؟" نوجوان نے بڑی یگانگت اور بے ساختگی سے بات شروع کی۔ ان ڈرامہ گروپ والوں کی بڑی عجیب جتھہ بندی تھی۔

"ڈاکٹر میر حیدانی—" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ—آئی ڈونٹ نو یور پارڈن—" پھر اس نے شہزاد سے چپکے سے پوچھا—"یار میں نے اینٹ تو نہیں گرادی—؟"

"ارے نہیں یار— سب چلتا ہے—" شہزاد نے جواب دیا۔ پھر اس نے مڑ کر سیتا سے پوچھا—"تم ابھی چلتی ہو یا بعد میں آکر پک اپ کرلوں؟" وہ بے اختیار ہو کر کیلاش کی آنکھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر کیلاش گھبرا گیا اور زیادہ تندہی سے پرمیلا کے ساتھ بات کرنے لگا۔

"سیتا—!" شہزاد نے دوبارہ کہا۔

"اوہ—" وہ چونکی "میں ہما کے ساتھ آجاؤں گی۔ تم لوگ جاؤ"۔ ہما بچے کی فکر میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کا بخار کم نہیں ہوتا تھا اور کسی طرح سوتا نہیں تھا۔ اس نے سیتا کی بات نہیں سنی۔

"ہما—" سیتا نے کہا۔

فضول—فضول—ہر چیز فضول—

"اوہ سوری— ہاں سیتا۔ نہیں میں کیسے جا سکتی ہوں۔ آنند کی یہ حالت ہے"۔

"اچھا تم چھ بجے کافی ہاؤس آجانا—کیلاش تم کو وہیں سے پک اپ کرلے گا"۔ شہزاد نے کہا اور دونوں لڑکے گھاس پر سے گزرتے کار کی طرف چلے گئے۔

سامنے "پیلی کوٹھی" کے چبوترے پر ساری لڑکیاں نٹنگ میں مصروف تھیں اور چلغوزے

کھا رہی تھیں اور بڑی آرام دہ نارمل باتیں کر رہی تھیں۔
ہما آیا کو بلوا کر دودھ کی بوتلیں صاف کروانے میں مصروف ہوگئی۔
"ہما — میں ذرا اپنے گھر ہو آؤں — " سیتا نے مونڈھے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"گھر — ؟"
"ہاں — قرول باغ — وہیں سے ان لوگوں کے یہاں چلی جاؤں گی۔ گڈ نائٹ۔"
"گڈ نائٹ سیتا۔"
وہ اپنا بیگ اٹھا کر سرخ بجری والی سڑک پر آئی اور بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگئی۔

(۴)

کامران ایک ستون کے پیچھے چھپا کچھ کھٹر پٹر کر رہا تھا۔ پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے تاروں کے گچھے پر جھک کر سوئچ دبا دیا۔ اسٹیج پر مدھم سفید اجالا پھیل گیا — "اسٹیج ڈائرکٹر" نے خالی اوڈیٹوریم کو مخاطب کیا۔
"قصہ[1] مختصر کرتا ہوں — مجھے اکادمی کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے — تم کو چاہئے کہ "راکھشش کی انگشتری" نامی ناٹک جو مہاراجہ بھاسکر دت کے بیٹے اور سامنت وائیشور دت کے پوتے تمثیل نگار وساکھ دت نے لکھا، آج پیش کرو — میں بھی بہت مطمئن ہوں کہ ایک ایسے مجمع کے سامنے یہ ناٹک کھیلا جائے گا جو ایک ادبی تخلیق کی خوبیاں سراہ سکتا ہے۔
کیونکہ —
دھان کی اچھی فصل کا انحصار بونے والے کی ذاتی خوبیوں پر نہیں ہوتا — اب میں گھر جاتا ہوں تاکہ اپنی گھر والی کے ساتھ سنگیت کی تیاری کرسکوں — " پھر اس نے اسٹیج کا ایک چکر لگایا — "یہ رہا ہمارا مکان — اب میں اندر جاتا ہوں — " اس نے چاروں طرف

[1] "مدرا راکھشش" کے پہلے منظر کا اولین مکالمہ۔

دیکھا" آہا۔ کیابات ہے ! ایسا لگتا ہے جیسے کسی تہوار کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ نوکر اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ایک داسی پانی لارہی ہے۔ دوسری خوشبودار جڑی بوٹیاں کوٹتی ہے۔ یہ لڑکی ، رگوندھنے میں جٹی ہے۔ اور اس داسی کو دیکھو جو کوٹنے چھاننے کے ساتھ گنگناتی جاتی ہے۔ اب میں گھر کی بی بی کو بلاتا ہوں۔"

کھٹاک ـــــ پلائی ووڈ کا بڑا تختہ ایک طرف کو سرکا اور سردار پردیپ سنگھ اوورال پہنے ہاتھ میں ہتوڑا لئے نمودار ہوئے۔

"پردیپ تم کو بھی اسی وقت ہلّہ کرنا ہے۔" بلقیس نے ہال میں چلاکر کہا:" میرا تو بیڑا غرق ہوگیا ـــــ شہزاد کدھر ہے ؟" پردیپ نے غصہ سے کہا۔

" ارے رے رے یہ تخت ادھر گھسیٹو بھائی ـــــ"

" اے پاک باز عورت سگھڑ اور خوش تدبیر ـــــ میرے گھر کی سیاست کی ماہر ـــــ اے میرے گھر بار کی مالک ـــــ ادھر آ ـــــ" راکیش بولے جارہا تھا۔ اب" ایکٹرس" سامنے آئی۔

"مہاراج میں یہاں ہوں۔ اپنی ہدایات سے مجھے سرفراز کیجئے۔"

بلقیس نے پھر آواز دی ـــــ" راکیش اس کے آگے جہاں 'ظالم حملہ آور' والا جملہ ہے اسے ذرا پھر سے کہو ـــــ"

" اچھا ـــــ دیکھو! ظالم حملہ آور، کیتو کے ساتھ چندرماں کو زیر کرنا چاہ رہا ہے ـــــ ہا کون ہے !! جب کہ میں یہاں کھڑا ہوں اور ـــــ"

اب سات بجا تھا۔ سیتا اب تک نہیں آئی۔ بلقیس نے گھڑی پر نظر ڈال کر سوچا ـــــ اب پاٹلی پتر کے نندراجہ کے وزیر راکھش کا دوست " چندن داس" کہہ رہا تھا۔

میرے سر پر بادلوں کی گھن گرج ہے۔

میرا پریتم بہت دور ہے۔ یہ کیا ہوا ـــــ؟

امربوٹیاں برفیلے پہاڑوں پر ہیں۔

اور سر پر کنڈلی مارے ناگ بیٹھا ہے ۔"

اب ــــ اب "چندر گپت" کہہ رہا تھا۔

وہ مغروروں سے جھجکتی ہے۔ ڈرپوکوں کے پاس نہیں رہتی۔ کیوں کہ اسے بے آرامی سے ڈر لگتا ہے۔ اسے احمقوں سے نفرت ہے۔ وہ بڑے بڑے گنوانوں سے بھی بے تکلف نہیں ہوتی۔ بہادروں سے گھبراتی ہے۔ دیش کی ناری کی مانند اسے بھی بڑی مشکل سے رام کیا جائے گا۔

"سیتا جی آگئیں" کامران نے "چانکیہ کے مکان" کی کھڑکی میں سے منڈیا نکال کر للتا کو بتایا۔ سیتا ہال میں سے گزر کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی جہاں اندھیرا تھا۔

کامران نے دوسرا سوئچ دبایا۔ اسٹیج پر اداس زرد روشنی پھیل گئی ــــ اب "چندر گپت" کہہ رہا تھا ــــ

"افق کا منظر خزاں نے کتنا خوبصورت بنا دیا ہے۔
کیوں کہ ــــ
آہستہ آہستہ خشک ہوتی ہوئی ندیوں کے دونوں طرف
ریتیلے کنارے جگمگا رہے ہیں ــــ
سارسوں کے ہجوم اور کنول کے جھنڈ
اور چاندی کے بادل اور اڑتے ہوئے بگلے۔
اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے ــــ"

"ــــ سیتا ــــ" بلقیس نے برآمدے میں نکل کے پکارا۔

"ہائے ــــ بلّی ــــ"

بلقیس اس کے نزدیک جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی: "یہاں کافی خنکی ہے۔ اندر چلو ــــ"

"نہیں ــــ یہیں ٹھیک ہے ــــ"

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ ہم لوگ کافی بنا رہے تھے۔ اس وقت تمہارا بہت انتظار

کیا۔ تمھارے لئے دو تین فون بھی آئے تھے ـــ"

"کس کے ـــ؟"

"معلوم نہیں۔ سنو سیتا ـــ اس وقت تم نے میری بات پوری نہیں سنی اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔"

"اب کون سی بات بتانا رہ گئی تھی تم کو؟"

"وہ تو ٹھیک ہے سیتا ڈیر ـــ مگر ـــ" بلقیس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "اصل میں کل رات منجھلی خالہ نے کراچی سے ٹرنک کال کیا تھا۔ قیصر کی شادی ہے نا اگلے ہفتے تو منجھلی خالہ نے سخت اصرار کیا ہے کہ تم اس میں ضرور شریک ہو۔ بڑی خالہ تلسی پور سے نہیں جا سکتیں۔ اصغر بھیا کی بیماری کی وجہ سے۔ ان کی بہو کی حیثیت سے ان کی نمائندگی تمھیں ہی کرنا ہے وغیرہ وغیرہ ـــ" اس نے حلق صاف کیا۔ سردی کے باوجود پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

"کراچی ـــ" سیتا کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کراچی ـــ"

"ہاں ہاں۔ اور کیا ـــ" بلقیس نے دفعتاً خود کو سنبھالا اور پھر ایکٹنگ شروع کر دی۔ "چلی چلو بڑا مزا آئے گا۔ سب پاکستانی رشتہ داروں سے ملیں گے۔ ان سب کو تو میں نے نو سال سے نہیں دیکھا ہے۔ آٹھ دس دن بعد چلے آئیں گے۔ باجی کے ہاں لاہور ٹھہر کر واپس دلی ـــ کیا خیال ہے؟" پھر وہ سیتا سے نظریں نہ ملا سکی اور جلدی سے تمثیل کا فائل الٹنے پلٹنے لگی۔ "چلی چلو واقعی پھر اگلے مہینے مجھے تھیٹر سیمنار کے لئے بمبئی جانا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم بہت مصروف، بہت اہم آدمی ہو۔ ہندستان کا سارا تھیٹر موومنٹ تمھارے ہی دم سے چل رہا ہے۔"

"بکو مت ـــ ارے ارے ـــ رو کیوں رہی ہو کریک داس ریکی ـــ چلو ہمارے ساتھ کراچی۔" پھر اس نے خوش دلی کی سعی کی۔ "ذرا سوچو۔ میں آج تک کسی نارن کنٹری نہیں گئی۔ ایک فارن کنٹری تو دیکھ آؤں بقول مجاز ـــ"

سیتا خاموش رہی۔

"چلو یہاں سے مسز سین کے ہاں جانے کے بجائے سیدھے گھر چلیں گے اور کھانے کے بعد بیٹھ کر، اسکربل، کھیلیں گے۔ اب کی دفعہ لیٹن لفظ بنائے جائیں۔ اتنی دیر میں کیوں آئیں؟ کیا اپنے گھر چلی گئی تھیں؟"

"ہاں — میں — کچھ دیر ممی کے پاس چپ چاپ بیٹھنا چاہتی تھی۔"

"تم نے — تم نے ان کو بتلا تو نہیں دیا؟"

"ہاں — بتا دیا —"

"کیا کہتی تھیں —؟"

"کچھ نہیں — کہنے لگیں۔ سب کرموں کا پھل ہے۔"

اندر سے "چندر گپت" کی آواز پھر بلند ہوئی۔ وہ اپنا مکالمہ دہرائے جا رہا تھا۔

"اور چاندی کے بادل اور اڑتے ہوئے بگلے۔

اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے —"

"منجھلی خالہ کا خط میرے پاس بھی آچکا ہے۔" سیتا نے آہستہ سے کہا۔ "بڑے بھیا کا بھی۔ ابھی میں نے ممی سے یہ بھی کہا کہ منجھلی خالہ نے مجھے کیسر کے بیاہ کے لئے کراچی بلایا ہے۔ کہنے لگیں ضرور جاؤ۔ تمھارا اصل گھر تمھاری سسرال ہے۔ کراچی میں تمھارے جیٹھ رہتے ہیں اور جیٹھ سسر کے برابر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہرگز مت ٹالو — اینڈ سو اون اینڈ سو فورتھ۔"

بلقیس برآمدے کے نیچے لگے ہوئے پھولوں کو دیکھتی رہی۔ اب کہرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس نے ایک فرض شناس ڈائرکٹر کی حیثیت سے اندر سے آتی ہوئی "چندر گپت" کی صاف اور گہری آواز پہ کان لگا دیئے۔ وہ کہہ رہا تھا —

"اور شام کے آسمان پر سلگتے ستارے

اور پھر —

ندیوں کی اٹھتی لہریں موسم کی بات مان کر اپنے اپنے دھاروں میں سمٹ گئیں۔
دھان فرطِ انکسار سے جھک گئی۔
مور اپنا غرور چھوڑ چکے ہیں۔
اچنبھے کی بات ہے کہ کس طرح ساری دنیا کو
خزاں نے معقولیت کے راستے پر چلنے کے لئے دھیما کر لیا۔
ایسی کٹنی کی مانند جو محبّتوں کے قصّے بڑی مہارت سے سناتی ہو۔
بت جھڑ نے گنگا کو دریاؤں کے خدا کے پاس پہنچا کر
اس کے سکون کو بحال کر دیا۔"

اب "بھاٹ" کہہ رہا تھا۔
"آسمان پر اس کے پھولوں کی پیلی روشنی
شیتو کے جسم کی راکھ کی ایسی پھیلی ہے۔
ٹھنڈی کرنوں والے چاند نے بادل بکھیر دیئے جو
شیو کی ہاتھی کی کھال کی مانند گرد آلود تھے۔
تیز چاندنی اس کی کھوپڑیوں کی مالا کی طرح چمک رہی ہے۔
ہوا میں اڑتے راج ہنس
اس کی ہنسی کی مانند جگمگاتے ہیں۔
خدا کرے خزاں جو شنو کے بدن کی طرح زرد ہے۔
تمہاری مشکلیں دور کرے ــــ"

ــــ اب "چانکیہ" کہہ رہا تھا ــــ
"چاروں ساگروں کے ریتیلے ساحلوں تلک جن پر تاڑ کے پتّوں سے تاریک جنگل سایہ کئے ہوئے ہیں۔ جن کے گہرے پانی ہیبت ناک مچھلیوں کے تیرنے سے مضطرب ہیں۔

تمھارا حکم تازہ پھولوں کے گجرے کی مانند
ایک سو راجاؤں نے اپنے اوپر لیا ہے ــــ"

"بلقیس ــــ" پیچھے سے کیلاش کی آواز آئی۔ وہ ہال کے آخری دروازے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آیا۔

"ہاں بھئی"۔ بلقیس نے پیچھے مڑ کر دریافت کیا۔ "واٹ از اِٹ ؟"

"تعارف میں کیا کیا لکھا جائے گا ؟" وہ فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ "آؤٹ لائن بنا دو میں اندر جا کر لکھ لوں گا۔"

"ارے بس بھئی لکھ دو کہ یہ ماڈرن تھیٹر کی چوتھی کلاسیکل پیش کش ہے۔"

"یہ تم نے کس قدر نئی اور پُرو فاؤنڈ بات بتائی ہے۔ مانتا ہوں۔"

"اور یہ لکھو کہ ــــ" بلقیس نے سوچتے ہوئے سر کھجایا۔

"ساتوں ایکٹ کا الگ الگ خلاصہ ؟ اور شروع میں کیا لکھوں ؟"

بلقیس نے فائل کھولا۔ "یہاں کچھ ٹپ ہی نہیں رہا، اندھیرے ہیں۔ یہ لکھ دو کہ یہ ناٹک چوتھی صدی عیسوی میں گپتا عہد میں لکھا گیا۔ ڈراماٹسٹ وساکھ دت اس کا مصنف تھا۔ لاؤ مجھے دو ــــ میں پڑھتی جاتی ہوں۔" دروازے میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی کی طرف جھک کر اس نے کاغذات پلٹے۔ "وساکھ دت اس کا مصنف تھا۔ شہنشاہ چندرگپت دوئم کے عہد میں پاٹلی پتر میں پہلی بار اسٹیج ہوا۔ چندرگپت دوئم کا زمانہ شاید ۳۷۵ء سے ۴۱۳ء تک ہے۔ کتاب میں سے چیک کر لینا۔"

سیتا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ذرا باہر جاتی ہوں۔"

بلقیس نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہو چکی تھی۔ ہما کی طرح اس کے پاس بھی سیتا کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ کہتی رہی ــــ"اور یہ لکھو کہ بڑا سخت سیریس اور سیاسی قسم کا پلے ہے۔ سنسکرت ڈرامے اور پیور آرٹ تھیٹر کا ذکر کر دو اگلے

پیراگراف میں ـــ رتنو نے آؤٹ تیار کر دیا؟"

"گیلی پریس سے آجائے تب ہی تو وہ لے آؤٹ بنائے گی۔" کیلاش نے جواب دیا۔

اندر "چانکیہ" کہہ رہا تھا:

"چیلیں اور گدھ دھوئیں کے مرغولوں کی طرح آسمان پر چکر کاٹ رہے ہیں۔ دوران پرواز میں ان کے پر بالکل ساکن ہیں۔

گھوڑے آسمان کو اپنی ٹاپوں سے اڑائے دے رہے ہیں۔

فوجوں کے آگے آگے چلنے والے ہاتھی ساکت کھڑے ہیں اور

جوار بھاٹا کے نشانوں کے مانند ان کی گھنٹیاں خاموش ہیں ـــ"

سیتا پوری عمارت کا چکر لگا کر پھر برآمدے میں آگئی۔ بلقیس اور کیلاش اسٹیج کی طرف جا چکے تھے۔

وقت ہے کہ اڑا چلا جا رہا ہے۔ وہ پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

اندر پانچویں ایکٹ میں شہزادہ ملایا کیتو کا جعلی دوست بھاگو رائین شہزادے سے مخاطب تھا۔

"راجکمار! وہ جو سیاست میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں۔ سیاسی مقاصد کی ضرورت دشمنوں، ساتھیوں اور غیر جانبدار فریقین کی گروہ بندی کا تعین کرتی ہے۔ غیر سیاسی انسانوں کی طرح محض ذاتی پسندیدگی کی بنا پر یہ دوستیاں استوار نہیں کی جاتیں۔ شہزادے ـــ سیاسی مقاصد کی وجہ سے دوست دشمن میں اور دشمن دوستوں میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ حکمت عملی سارے پرانے بندھنوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے۔ جس طرح انسان اپنی موجودہ زندگی میں اپُورب جنم کی باتیں بھول جاتا ہے۔"

ـــ "ایک افسر" اسٹیج پر آیا۔

"مہاراج کی جے ہو!" اس نے کہا۔ "حفاظتی چوکی کے نگراں درگھ رکش کی عرضداشت

ہے کہ ایک شخص جس کے پاس پروانہ راہداری نہ تھا، ایک خط کے ساتھ شاہی خیمہ گاہ سے فرار ہونا چاہتا تھا — اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

اب "بھاگورائین" کہہ رہا تھا —

"ہمارا اجکمار بکسم پورہ پر ہلّہ بول دینا چاہئے۔

تاکہ —

لودھرا کے پھولوں کے غازے سے سجے رخساروں والی گوڑ کی عورتوں کے چہرے خاک آلود ہو جائیں اور ان کے بھنورا ایسے گھنگھریالے بالوں کی چمک ہمارے شہ سوار دستوں کی ٹاپوں سے اڑائی ہوئی دھول کے ستونوں میں چھپ جائے اور خاک کے بگولوں کے یہ ستون ہمارے جنگی ہاتھیوں کی سونڈوں سے برستے پانی سے کٹ کر دشمنوں کے سروں پر جا گریں۔"

برآمدے میں سے ایک گروہ باتیں کرتا گرین روم کی طرف چلا گیا۔ برساتی میں ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ چاند املتاس کی اوٹ میں سے نکل آیا۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ مسز ڈولی سین کے یہاں جائیں گے اور سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے ڈرائنگ روم کے قالینوں پر بیٹھ کر زیادہ جوش و خروش سے اپنی پروفیشنل گفتگو میں مصروف ہوں گے۔

پیچھے سے اسے کیلاش کی آواز سنائی دی۔ وہ گیلری سے نکلتے ہوئے پردیپ سے کہہ رہا تھا۔ "مسز سین کے ہاں جانے سے پہلے باہر جا کر تھوڑا حلق تر کر لیا جائے —"

یہ حلق تر کرنا اسے بھی بہت پسند تھا۔ ان لڑکوں کو یہ بات معلوم نہیں ورنہ وہ اسے فوراً مدعو کر لیں۔ ان کے گروہ کی کوئی لڑکی ڈرنک نہیں کرتی تھی۔ اب گیارہ بج رہا ہے۔ بارہ بجے گا۔ آدھی رات ہوگی۔ فقط ڈرنک کر کے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت معدوم ہو گیا۔ کیلاش کتنا خوبصورت ہے۔

ڈرامہ قریب الختم تھا اور "سمیدھر" کہہ رہا تھا۔

" ان دوستوں سے جدائی بن کی جگہ دل میں ہے۔
راگ رنگ میں مصروف اور شراب خانوں میں مے نوشی کرتے ہوئے بھی دل میں کھٹکتی ہے۔"

کیا حسبِ حال مکالمہ ہے! وہ مسکرائی۔ کس سے جدائی؟ — کس کی جدائی —؟ کس کس کی جدائی —؟ اور کھٹک کیسی —؟؟ ڈیم — ڈیم — ڈیم —
اب آخری ایکٹ کے شروع میں " راکھشش" آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔
" یہ باغ کتنا سنسان ہے۔
کیوں کہ یہاں —
بارہ دری جو ایک طاقت ور شاہی خاندان کی طرح تعمیر کی گئی تھی ٹوٹ کر گر چکی ہے۔
بغیر پھولوں کے درخت نا اہل بادشاہوں کی سیاسی کارروائیوں کی طرح اجاڑ ہیں۔ زمین پر جھاڑ جھنکار بے وقوف انسانوں کے دماغ کے ناقابلِ عمل منصوبوں کی طرح اگ رہا ہے۔
اور —
کلہاڑیوں سے کٹی ہوئی شاخیں فاختاؤں کی کوکو کی وجہ سے گویا درد سے کراہ رہی ہیں۔ سانپ اپنے پیارے دوستوں کے اس دکھ کو دیکھ کر ان کی ڈالیوں سے اس طرح لپٹے ہیں جیسے ان کے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوں۔
پتیوں سے عاری درخت اس طرح کھڑے ہیں جیسے کسی کی ارتھی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔"
اسٹیج کی روشنیاں بجھنے لگیں۔ کامران نے ہال میں سے اسے پکارا — " سیتا جی "
وہ چونکی
" آپ کا فون — مسٹر چودھری —"
وہ اٹھ کر اسٹیج کے پچھلے کمرے میں گئی۔ بلقیس اور کیلاش میز پر جھکے تندہی سے تعارفی

کتابچے کا مضمون لکھنے میں مصروف تھے۔

"آج تمھارے بہت فون آئے ہیں بھئی ـــــ" للتا نے اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر کہا۔

"ہلو ـــــ" اس نے رسیور اٹھایا۔

"ہلو ـــ سیتا ـــــ"

"ہلو یس ـــــ"

"سیتا ـــــ ہم قمر بول رہے ہیں۔ ہم آج ہی صبح کلکتے سے آئے ہیں۔ فیسٹول کے لئے اپنا پلے کر ـــــ تم کو صبح سے کئی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی ـــــ آخر معلوم ہوا کہ تم ادھر بلقیس کی ریہرسل میں آنے والی ہو ـــــ بلقیس کیسا پروڈیوس کر رہی ہے ـــــ؟"

"ہاؤ آر یو ـــــ قمر ـــ؟"

"فائین ـــــ تم بتاؤ ـــــ نیویارک سے کب آئیں ـــ؟"

"کافی دن ہو گئے ـــ تم تو بہت عرصے سے یہیں ہو ـــــ"

"ہاں لیکن مارچ میں ہم ماسکو جا رہے ہیں یہی پلے کے ساتھ۔ اور کچھ پرانی باتیں کرو سیتا ـــــ نیویارک ہمارے آنے کے بعد اداس تو نہیں ہو گیا؟ ہاؤ از اولڈ جمیل ـــ؟ بعد میں اس سے ملنا ہوا؟ ـــــ تمھارا کیا پروگرام ہے؟ ـــ سیتا تمھیں دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے ـــ سنو تم ایسا کرو ـــ کہ تم ابھی کونسٹی ٹیوشن ہاؤس آجاؤ۔ یہاں سے اکٹھے اشوکا ہوٹل چلیں گے۔ پروجیش بابو نے پارٹی میں بلایا ہے۔ نہیں تم گیٹ کریشنگ بالکل نہیں کرو گی۔ پروجیش کو نہیں جانتیں، پھر تم نے اب تک دنیا میں کیا کیا ہے؟ میں تمھاری "نہیں" نہیں سنوں گا۔ آرہی ہو نا؟ گڈ ـــ ابھی فوراً آجاؤ ـــــ"

سیتا ہنس ہنس کر اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اور بلقیس لکھتے لکھتے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا کی۔

(۵)

سیتا سے بات کرنے کے آدھے گھنٹے بعد ابوالفصاحت قمرالاسلام چودھری اشوکا ہوٹل کی طرف رواں تھا۔ چند منٹ قبل مادھوری رنگاراؤ اپنی کار میں اسے لینے آ پہنچی تھی اور کہا تھا جلد جلدی پارٹی میں تمھارا بہت دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔ اور اس وقت تک وہ بھول چکا تھا کہ اس نے سیتا کو کونسٹی ٹیوشن ہاؤس بلایا ہے۔

قمرالاسلام چودھری مرشد آباد کا رہنے والا تھا۔ اس کی بہت خوبصورت آواز تھی۔ لانبی لانبی پلکیں، سانولا رنگ، خالص رومینٹک شکل اور ایسا آدمی تھا جس پر کالجوں کی شاعر پرست لڑکیاں زہر کھاتی ہیں۔ کلکتہ سے ایم۔اے۔ کرنے کے بعد کئی سال تک وہ ترقی پسند ڈرامے پر ریڈیو کرتا رہا۔ فلموں میں کام کیا، بنگالی اور انگریزی میں شاعری کی۔ فن کاروں کے ڈیلی گیشن کے ساتھ روس، مشرقی یورپ اور عوامی چین کے چکر لگائے۔ پھر امریکہ چلا گیا۔ وہیں اس کی انگریزی شاعری کو "ڈسکور" کیا گیا۔ حال ہی میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ لندن سے شائع ہوا تھا جس نے انگریزی ادب میں دھوم مچا دی تھی۔ ڈوم موریز کے بعد یہ دوسرا ہندوستانی تھا، نیو اسٹیٹس مین اور ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ میں جس کے متعلق مضامین لکھے جا رہے تھے۔ بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ لڑکیوں کی نظروں میں اور زیادہ گلیمرس ہو گیا تھا۔ مگر قمرالاسلام کافی لپاڑیا اور غیر ذمہ دار تھا۔ دوستوں سے پیسے لے کر واپس نہ کرتا تھا عموماً بے کار رہتا تھا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جسے عورتوں پر خود عاشق ہونے کی زحمت گوارا کرنا ہی نہیں پڑتی۔ عورتیں اسے اپنا محبوب بنانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

بلقیس کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور وہ اسے ابوالحماقت قمرالاسلام چودھری کہتی تھی۔ اس کی غیر پروفیشنل حرکتوں سے جلتی تھی اور اس کے پوز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ان دنوں مادھوری رنگاراؤ اس پر بری طرح فدا ہو چکی تھی۔ وہ جنوبی حسن کا مکمل

نمونہ تھی اور سیتا سے زیادہ دلکش اور فرمانبردار تھی اور اس کو سیتا سے کہیں زیادہ گرم جوشی سے چاہ رہی تھی۔ سیتا کے متعلق اسے یقین نہ تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرے گی۔

اور قمرالاسلام چودھری انگریزی زبان کے اس مقولے میں یقین رکھتا تھا کہ ہاتھ پر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا جھاڑیوں میں چھپی ہوئی دو چڑیوں سے بہتر ہے۔

(۶)

دلہن رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ منجھلی خالہ کونوں میں منہ چھپا کر روتی پھر رہی تھیں۔ بڑے بڑے بھیا بار بار آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگوں کے اٹھنے کے بعد شامیانے کے نیچے صوفے اب ذرا بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کارچوبی مسند پر جہاں نکاح اور بعد میں آرسی مصحف ہوا تھا اب بچے کود رہے تھے اور پھولوں کے ہار بکھرے پڑے تھے۔ میراثنیں گاتے گاتے تھک چکی تھیں۔ شہر کی "اونچی سوسائٹی" کے افراد میزبانوں کو خدا حافظ کر کے موٹروں میں سوار ہو رہے تھے۔ بلقیس رشتے داروں کے ہجوم میں اندر بیٹھی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس اس کا کزن نادر مہمانوں کو سگریٹ پیش کرتے کرتے اکتا کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی بھابی جان شامیانے کے ایک کونے میں اس کے دوستوں کے ہجوم میں کھڑی مسئلہ کشمیر پر دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں۔ یہ ہمارا بیڑا کرواٗیں گی۔ نادر نے ذرا پریشانی سے سوچا اور پھر کافی منگوانے کے لئے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

وہ اسی طرح کھڑی بحث میں الجھ رہی تھی جب ایک شاندار شخص ہاتھ میں کافی کی پیالی لئے اس کے قریب سے گزرا اور اسے دیکھ کر بڑی اداسی سے مسکرایا۔ گویا اس کی آنکھوں میں تیرتے بے پایاں الم کو سمجھتا ہو یا سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بالوں کے انداز میں جبل کی ہلکی سی جھلک تھی جس نے ایک لمحے کے لئے اسے بہت مضطرب کیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے

دیکھا تھا کہ وہ کار چوبی مسند کے قریب کھڑا بلقیس سے بڑے اخلاق سے گفتگو کر رہا تھا اور وہ بھی اسی اخلاق سے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

ایک رشتہ دار لڑکی کافی کی ٹرے لے کر اس کی طرف آئی "یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"ارے یہی تو عرفان بھائی ہیں" لڑکی نے جواب دیا اور آگے چلی گئی۔

پھر نادر خشک میوے کی پلیٹ لے کر اس کے نزدیک آیا۔ اس نے ذرا جھجک کر پھر وہی سوال کیا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

"ارے! — آپ ابھی ان سے نہیں ملیں؟ ٹھہریئے ابھی بلاتا ہوں —" وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس شخص کے پاس پہنچا — "عرفان بھائی! ادھر آئیے۔ آپ ہماری بھابی جان سے اب تک ملے ہی نہیں۔ واہ —" وہ اسے اپنے ساتھ لے کر پھر واپس آیا "جناب عالی! ہمارے جمیل بھائی کی دلہن ہیں۔ ڈاکٹر سیتا جمیل"

اس نے بڑی ادا سے حسبِ عادت آداب عرض کیا۔

"آداب" اس شخص نے جواب دیا "آئیے یہاں بیٹھ جائیں — آپ اتنی دیر کھڑے کھڑے تھک تو نہیں گئیں؟ میں آدھ گھنٹے سے آپ کی تقریر سن رہا ہوں" وہ تینوں دور ایک کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

"میں اپنے کیس کا نقطۂ نظر بتانے کی کوشش کر رہی تھی مگر آپ لوگ دوسری پارٹی کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ہونہہ — ذرا تو منطق استعمال کیجئے۔ فوراً EMOTIONAL ہو جاتے ہیں آپ لوگ — میں نے دیکھا کہ آپ کے یہاں بہت پڑھے لکھے لوگ بھی بہت بھولے بھالے ہیں"

"EVERY CASE IS EMOTIONAL, THE REST IS ARGUEMENT"

عرفان نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ ذرا تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ اتنے میں اس کے ایک اور سسرالی رشتہ دار ناصر بھائی قریب آکر بیٹھ گئے۔ "بھابی جان کافی منگواؤں؟" نادر نے پوچھا۔ "آپ کو کراچی کیسا لگا؟" عرفان نے پوچھا (کیسا شدید احمقانہ سوال محض سوشل گفتگو کی خاطر مجھے بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔)

اب نادر، ناصر اور عرفان تینوں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ عرفان نے اس سے پوچھا ـــ "آپ کیسی ڈاکٹر ہیں ـــ؟ دواؤں والی یا دوسری ـــ؟"

"نہیں صاحب۔ یہ دوائے دردِ دل بیچتی ہیں ـــ" ناصر نے دیور کے رشتے سے اس سے مذاق کیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی یہ لوگ اس کے لئے بچھے بچھے جا رہے تھے، رشتے کے دیور اور نندیں ہر وقت اسے چھیڑتے۔

تلسی پور کی میراثنیں جو اس خاندان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے کراچی آگئی تھیں اور یہاں لالوکھیت میں رہتی تھیں، رات کو قیصر اور بلقیس کو سنا سنا کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

ساس ہماری یوں کہہ گئی تھیں　　　بہو جوگی کو جھنگی دیے دینا ناری

میں البیلی بھول گئی تھی　　　میں نے جوگی کو نندی دے ڈاری رے

نادر اس کے لئے طرح طرح کے پروگرام بناتا۔ خصوصاً اس خیال سے کہ جمیل نے اسے طلاق دیئے بغیر دوسری شادی کر لی۔ یہ لوگ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے۔

"دلہن ہم تو تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں" منجھلی خالہ بار بار کہتیں۔

"نہ ہوئے صاحبزادے میرے سامنے ورنہ مارے جوتوں کے فرش کر دیتا ـــ ان کو میرا غصہ معلوم ہے ـــ" بڑے بھیا نے اس سے کہا تھا۔

منجھلی خالہ راہل کی تصویریں ہر آئے گئے کو دکھلاتیں ـــ "دیکھو کیسا چاند ایسا ہے۔ بالکل ہمارے جمیل بھیا ایسا ـــ"

" ہماری بھابی جان بے حد قابل ہیں ـــــ" نادر نے بڑے فخر سے عرفان کو اطلاع دی۔
عرفان نے نظریں اٹھا کر سیتا کو دیکھا۔ وہ ذرا گھبرا سی گئی۔ اتنے میں بڑے بھیا وہاں آئے۔ سیتا نے فوراً ساری کے پلّو سے سر ڈھانپ لیا۔ تینوں نوجوان تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

" بھائی دلہن " بڑے بھیا نے اسے مخاطب کیا " بلقیس کہہ رہی ہیں کہ اگلے اتوار کو واپس جانا چاہتی ہیں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے ؟"

اگلے اتوار کو ـــــ وہ سہم سی گئی۔ اتنی جلدی ـــــ اتنی جلدی وہ یہاں سے چلی جائے گی اور پھر شاید اس شخص کو کبھی عمر بھر، دوبارہ نہ دیکھ سکے ـــــ " ہم تو چاہتے تھے کہ ابھی کچھ دن تم یہاں رہو۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ مگر بیٹیا جلدی مچا رہی ہیں کہ ان کو جلد از جلد بمبئی پہنچنا ہے۔" بڑے بھیا کہہ رہے تھے۔

" بڑے بھیا ہم نے سوچا تھا کار سے لاہور جائیں گے۔" نادر نے کہا " آئیے بھابی جان اندر چل کر بلقیس سے بات کر لیں۔"

وہ عرفان کو شب بخیر کہہ کر نادر کے ساتھ کوٹھی میں گئی۔

اس رات جب وہ جہیز کے کمرے میں چیزیں سنگوانے میں دوسری لڑکیوں کی مدد کر رہی تھی تو منجھلی خالہ نے اچانک اس سے پوچھا۔

" دلہن ـــــ تم عرفان کا دیکھ لیو ؟"

" جی ہاں "

" ان کی ماں بلقیس بِٹیا کے لئے دلّی ان کا پیغام بھیجن ہیں۔ ہم بلقیس کا ای لئے یہاں بلائے ہن کہ ای عرفان کا دیکھ لیئیں۔ مگر وہ ایسی الٹی عقل کی ہیں کہ دیکھو جو ان کے جی پر بیٹھیں۔"

" اچھا ـــــ" سیتا نے ایک سعادت مند بہو کی طرح خاندانی مسائل میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا " مجھے تو خاصے معقول آدمی دکھے۔"

" معقول تو ہیں۔ مگر بلقیس بھی تو سمجھیں۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"بہت اونچی نوکری ہے۔ ڈیڑھ دو دو ہزار پاوت ہیں۔ لڑکین کا اور کیا چہئے۔ ذات بات بھی اچھی ہے۔" منجھلی خالہ نے تخفوں کے ڈبے اوپر تلے چنتے ہوئے جواب دیا۔ "ہر دوئی کے رہنے والے ہیں۔ ہر دوئی جانت ہو؟"

"جی نہیں ـــــ جی ہاں ـــــ" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"ہمری بلقیس کے دماغ کا کیڑا ایک یہو ہے کہ پاکستان نہ آئیں۔ اب عرفان تو پاکستانی ہیں۔"

سیتا ٹکے ہوئے جوڑے اٹھا اٹھا کر مسہری پر رکھتی گئی۔

"کل تم نادر بھیا کے ساتھ جائی کے تنک اپنی کوٹھی تو دیکھ لیو ـــــ" منجھلی خالہ نے کہا۔

کراچی آنے سے ایک روز قبل وہ بلقیس کو اپنے گھر قرول باغ لے گئی تھی۔ بلقیس کو اس نے آج تک اپنے گھر مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں کسی کو اپنا صحیح پتہ نہ بتاتی تھی۔ مگر جس روز وہ کراچی کے لئے اسباب باندھ رہی تھی، اس کی ماں نے اصرار کیا تھا کہ وہ بلقیس کو کھانے پر بلا لے کیسی بری بات کہ میں نے آج تک تمھاری نند کو نہیں دیکھا۔ سیتا کچھ مہینے سے ایک سرکاری محکمہ میں ملازم ہو گئی تھی اور دفتر سے اس نے بلقیس کو فون پر دعوت دی تھی۔ اس کے فوراً بعد بلقیس نے ہما کو فون کیا تھا کہ وہ شام کو سیتا کے گھر جا رہی ہے اور اسے پک اپ کر لے گی۔ دوپہر کو وہ لنچ کے وقت کناٹ سرکس کے ایک ریستوران میں بلقیس سے ملی تو بلقیس نے اس سے کہا تھا ـــــ "میں پرانی دلی جا کر ہما کو لیتی ہوئی آٹھ بجے تک تمھارے یہاں آ جاؤں گی ـــــ"

"ہما کو لیتی ہوئی ـــــ"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ کیوں؟"

"تم نے ہما کو کیوں بلایا —؟"

بلقیس بھونچکی رہ گئی تھی۔ "ہما تمھاری اتنی پرانی دوست ہے۔ اس کو بلانے میں کیا حرج تھا؟ میرا تو خیال تھا کہ تم پہلے ہی اس سے کہہ چکی ہوگی۔"

"مگر بلقیس — ہما اتنی شاندار کوٹھی میں رہتی ہے۔ میں اسے اپنے گھر کیسے بلاؤں۔ میرے ہاں تو بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ تم میری رشتے دار ہو۔ تمھاری دوسری بات ہے۔"

"سیتا —" بلقیس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ "سیتا! اور تم کلاس اور طبقاتی شعور کے متعلق اتنی تقریریں کرتی ہو —!!"

"وہ سب ٹھیک ہے —" اس نے چڑ کر جواب دیا تھا۔ BUT I HAPPEN TO HAVE A LOT OF PERSONAL PRIDE".

"گڈ ہیونز — تو اب میں ہما کو کیسے منع کر دوں؟"

"اب کیسے منع کر سکتی ہو۔"

اس شام بلقیس ہما کو ساتھ لے کر سیتا کے بتائے ہوئے پتے پر قرول باغ کی ایک گلی میں پہنچی۔ کھڑکی میں سے سیتا کی چھوٹی بہنیں جھانک رہی تھیں۔ سیتا کی ماں نے دروازہ کھولا۔ یہ کسی نچلے متوسط طبقے کے مسلمان کا چھوڑا ہوا تنگ و تاریک چھوٹا سا مکان تھا۔ ممی دونوں لڑکیوں کو وسطی کمرے میں لے گئیں اور دری پر بٹھا دیا۔ ایک طرف کو پلنگ بچھا تھا اور دیوار کے برابر ٹرنک چنے ہوئے تھے۔ الماری کے اوپر سری کرشن کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ کچھ دیر بعد ممی نے الماری کے پیچھے سے فریم کیا ہوا کلمہ نکالا اور جھاڑ پونچھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔ "بلقیس یہ کلمہ اس کمرے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتار کر احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ کئی بار سیتا سے کہا کہ اسے تمھارے ہاں پہنچا دے کہ شاید کبھی غلطی سے یہاں کسی سے بے ادبی ہو جائے۔ اب تم لیتی جانا۔"

"جی اچھا۔" بلقیس نے جواب دیا تھا۔

ممی نے تھالیاں اور کٹوریاں دری پر پروسیں۔ ہما اور بلقیس آرام سے ٹانگیں پھیلا کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئیں اور ممی اور اس کی چھوٹی بہنوں لیلا اور موہنی سے مزے مزے کی باتیں کرتی رہیں۔ سیتا دوسری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی تھی۔ مقابل کی دیوار پر ہنومان جی کی تصویر ٹنگی تھی جو پہاڑ ہتھیلی پر اٹھائے اڑے چلے جارہے تھے۔ میں نے بھی زندگی کا پہاڑ ہاتھ میں اٹھا کر آسمانوں پر اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

"بی بی کراچی ۱۲؍ا کالونی میں ہماری اٹھارہ کمروں کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔" ممی گلاسوں میں پانی انڈیلتے ہوئے بلقیس سے مخاطب تھیں۔

سیتا نے بڑی کوفت سے ان کو دیکھا تھا۔ یہ قصہ ہر ایک کو سنا کر انھیں کس قسم کا اطمینان محسوس ہوتا ہے؟

"اس کوٹھی میں ڈاکٹر صاحب نے ـــــ سیتا کے ڈیڈی نے چھ کمروں میں سنگ مرمر کا فرش لگوایا تھا۔"

"ممی اب ختم کرو یہ رام کہانی ـــــ" سیتا نے چڑ کر کہا تھا۔

"نہیں بلقیس ـــــ تم جا کر دیکھنا ضرور ـــــ اس کے نیلے رنگ کے شیشوں کی کھڑکیاں ہیں۔ "دولت رائے محل" اوپر لکھا ہوا دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ جمشید روڈ سے موتی لال نہرو روڈ پر جب مڑو...."

"ممی ـــــ بھئی ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے۔ ہما تم نے دہی بڑے لئے ـــــ" اسی وقت ڈیڈی اندر آگئے تھے۔

"کیوں بھئی ـــــ یہ تم کو دولت محل کے قصے سنا رہی ہیں؟ ان کی یہ عادت ذرا مشکل ہی سے چھوٹے گی۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور وہیں دری پر بیٹھ گئے تھے۔ پھر انھوں نے مہمان لڑکیوں سے کہا تھا۔

"بی بی ـــ تم دونوں اتنے برسوں بعد آج پہلی بار ہمارے غربت محل میں آئی ہو اسی کو دولت محل سمجھ کر پھر کبھی آنا۔"

"صبح کو ناشتے کے بعد نادر تم کو تمھاری کوٹھی دکھلا لائے گا ـــ" منجھلی خالہ نے نقرئی برتن منگواتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"جی نہیں ـــ نہیں دیکھوں گی ـــ کیا ضرورت ہے ـــ" اس نے جواب دیا منجھلی خالہ چپ ہو گئیں۔

چاندپور ہاؤس میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ چاندپور ہاؤس اس کے جیٹھ کی اسکینڈنیوین طرز کی دو منزلہ کوٹھی کا نام تھا جو انھوں نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں بنوائی تھی۔

"یہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ جنے آپ لوگ ایک پھٹیچر سے سابق تعلقہ دار ہیں اور پھٹیچر سا چاندپور نامی آپ کا تعلقہ تلسی پور ضلع فیض آباد سنہ ۱۹۵۰ء تک موجود تھا۔ اور کچھ نہیں تو پاکستان آکر آپ ریفیوجی لوگ پرانے ناموں ہی سے چپکے ہوئے ہیں ـــ" بلقیس نے ایک روز صبح کو ناشتے کی میز پر حسب معمول اپنے پاکستانی عزیزوں سے جھگڑنا شروع کیا۔

"ہمارا چاندپور ہاؤس تھا کہ نہیں لکھنؤ میں جاپلنگ روڈ پہ" منجھلی خالہ نے رسان سے کہا۔ ان کی آواز میں سیتا کو اپنی ماں کی آواز کی جھلک سنائی دی۔ وہ کوفت سے دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔

ڈرائیو پر اس کی کار آکر رکی۔ وہ اترا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ بلقیس بے نیازی سے توس پر مکھن لگانے میں مصروف رہی۔

ـــ اس ایک ہفتے کے دوران میں وہ روزانہ صبح و شام چاندپور ہاؤس آتا اور گھنٹوں بیٹھا سب سے باتیں کرتا رہتا۔ لیکن ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہتا کہ سیتا کے نزدیک بیٹھ سکے لیکن کسی پر یہ بھی ظاہر نہ ہو کہ وہ سیتا کی قربت کا خواہاں ہے۔ منجھلی خالہ یہ سوچ

سوچ کر خوش ہوتی رہیں کہ وہ بلقیس کی وجہ سے آرہا ہے۔ جب ایک آدمی اتنی خوشامد کرے گا تو لامحالہ لڑکی کو 'ہاں' کرنا ہی پڑے گی۔ انھوں نے فوراً بلقیس کی ماں کو جو ان کی بڑی بہن تھیں تلسی پور اس مضمون کا خط بھی لکھ بھیجا کہ ماشے اللہ سے بیٹا کی بات یہاں تقریباً پکی ہو گئی ہے۔

نوجوان پارٹی زیادہ وقت نادر کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں گزارتی۔ ایک روز وہ برآمدے میں بیٹھی سہ پہر کی چائے پی رہے تھے جب عرفان نے دفعتاً سیتا سے کہا ——
"آپ کو واپس جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ ہم پاکستانی اتنے برے نہیں! کچھ دن تو اور ٹھہر جائیے ——"

"میں تو دنیا کی کسی قوم کو بھی برا نہیں سمجھتی۔ مذہبی جنون اور شوونزم کا فلسفہ تو آپ جیسے غیر اشتراکی لوگوں ہی کی برکت ہے۔"

"واقعی بھابی جان! ایک مہینہ اور ٹھہر جائیے۔ ویزا آپ کا میں بڑھوا دوں گا فٹافٹ۔" نادر نے کہا۔

"کیسے ٹھہر جاؤں۔ میرے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی۔ نہیں لگ جائے گی۔"

"خیر سیتا! —— اب تم اتنی اہم بھی نہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ تمھاری فکر میں اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرے۔" بلقیس نے ہنس کر کہا۔ "چند سال بعد اگر اسی رفتار سے ترقی کرتی رہیں تو انٹرپول کے تمھارے پیچھے لگنے کے امکانات البتہ ہیں۔"

اس نے اداسی سے ان تینوں کو دیکھا۔

فضول —— فضول —— دنیا کتنی فضول جگہ تھی۔

"آپ کا میڈن نام کیا تھا ——" عرفان نے پوچھا۔ وہ "پرڈکشن" رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا جو نادر بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

"میر چندانی ——" اس نے چونک کر جواب دیا۔

"ہمارے یہاں ہردوئی میں ایک سندھی انجینیر صاحب تبدیل ہو کر آئے تھے۔ میرے لڑکپن میں" عرفان نے کہنا شروع کیا۔" ان کا نام میر چندانی تھا۔ تو ایک روز وہ ملنے آئے تو نوکر نے اندر آکر کہا بیگم صاحب مچھردانی صاحب آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ بہت دنوں تک انھیں مرچیدانی کہتا رہا۔ یہ واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم نے اس زمانے میں سندھی دیکھے ہی نہیں تھے۔ گنج میں دو تین سندھیوں کی دوکانیں تھیں۔ اور بس۔"

"ہاں" نادر جھک کر بولا۔" بلقیس تم کو یاد ہے وہ فروٹ مارٹ والا سندھی جب تم نے اندرا دالٹرز کے لئے اس سے پوچھا تھا کہ کیا ان کی شادی ہوگئی ہے اور کیا وہ واقعی بہت زیادہ کریک ہیں تو اس نے جواب دیا تھا — YES MADAM, SHE IS MAD AND MARRIED BOTH ہاہا — ہم لوگ اس کے اس برجستہ جواب پر کس قدر ہنسے تھے۔"

"ہاہا —" عرفان بھی ہنسا اور پھر رسالہ دیکھنے لگا۔

فضول — فضول —

دفعتاً اس نے عرفان سے پوچھا —" آپ کو معلوم ہے تھرڈ ڈگری کس طرح کی جاتی ہے؟"

"کیوں؟ آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟" عرفان نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔ خیالات میں ربط یا منطق کا کیا ذکر؟"

عرفان نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بات ٹالنا چاہی۔" آپ نے وہ لطیفہ سنا ہے؟"

"کون سا؟"

"وہی کہ ایک مرتبہ نیویارک میں لفٹ ونگ ادیبوں کے ہفتہ وار جلسے میں آدھے سے زیادہ خفیہ پولیس کے لوگ ہوا کرتے تھے تو ایک روز ایک جلسے میں ایک ادیب نے اٹھ کر حاضرین کو اس طرح مخاطب کیا COMRADES, AND GENTLEMEN OF THE F.B.I.۔"

"ہاہاہا —" نادر نے قہقہہ لگایا۔

پھر وہ چاروں بے حد کھوکھلی ہنسی ہنستے رہے۔

شام ہوتی تو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔

"چلئے پکچر بھابی جان" نادر اس سے کہتا۔

"روز پکچرز!"

عرفان سے بحث کرتے کرتے وہ جھنجھلا کر کہتی "کوئی پولیٹکل انڈر اسٹینڈنگ نہیں کتابیں نہیں ہیں۔ اچھے فلم دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اخباروں میں لے دے کر وہی ایک مارننگ اسٹار پڑھ کر اور اس کے کارٹون دیکھ دیکھ کر ساری عمر گذار دے اس کی سائیکولوجی کا کیا حشر ہوگا۔"

"بھابی جان آپ واقعی ہمارا بیڑا کر وادیں گی۔ خود تو چلی جائیں گی اور ہمارا ہو جائے گا کونڈہ شریف۔ آپ ہر محفل میں اس طرح کی انٹ سنٹ باتیں اڑاتی رہتی ہیں۔"

وہ نادر کے احتجاج کا کوئی نوٹس نہ لیتی اور اسی طرح جھائیں جھائیں کرتی رہتی۔

عرفان کی رخصت ختم ہو چکی تھی اور اسے لاہور واپس پہنچنا تھا۔ طے ہوا کہ وہ سب دو موٹروں پر اکٹھے لاہور جائیں گے۔

اس روز شام کے وقت سیتا برآمدے میں اکیلی بیٹھی "لائف" رسالہ دیکھ رہی تھی جب وہ آگیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب ان دونوں کے پاس تیسرا کوئی نہیں تھا۔ "پرسوں صبح چلنے کا انتظام ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب" وہ ذرا فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ڈاکٹر صاحب مت کہا کیجئے۔"

"اچھا پھر کیا کہیں؟ مسز جمیل ــــ بیگم صاحبہ ــــ شریمتی جی ــــ"

"آپ کو معلوم ہے میرا نام سیدھا سادا سیتا ہے۔"

وہ بلقیس کے سگے خالہ زاد بھائی کی بیوی تھی۔ وہ گویا اس کا ہونے والا نندوئی تھا اور اس لحاظ سے مذاق کے رشتے کا پہلو نکلتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اسے مستقل چھیڑتا رہتا تھا۔ شاید ــــ

"آپ کے رام چندر جی اپنا راج پاٹ سنبھالنے اجودھیا کب لوٹیں گے ؟" عرفان نے دریافت کیا۔ اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ جمیل نے دوسرا بیاہ کر لیا ہے۔ یہ خالص خاندانی معاملہ تھا اور عرفان بہرحال غیر آدمی تھا۔

"ابھی ان کی ٹرم دو سال کے لئے اور بڑھ گئی ہے۔ آپ نیویارک گئے ہیں ؟"

"جی ہاں۔"

"کب ؟"

"جب آپ وہاں نہیں تھیں۔"

"میں تو وہاں ۱۹۴۸ء سے ہوں۔"

"میں بھی وہاں ۱۹۴۹ء ہی میں پہلی بار گیا تھا۔ دراصل میرے اور آپ کے حلقے مختلف رہے ہوں گے۔ اب امریکہ واپس کب جا رہی ہیں ؟"

"ابھی کچھ طے نہیں۔" اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا اور دعا مانگی کہ بلقیس یا کوئی اور وہاں آجائے اور یہ موضوع ختم ہو۔

جس روز صبح وہ لوگ سفر پر روانہ ہونے والے تھے اسی رات بلقیس کو فلو ہو گیا اور جانا چند روز کے لئے ملتوی کرنا پڑا۔

اب بلقیس بیمار پڑ گئی تو سیتا ہی اکیلی نادر اور عرفان کے ساتھ باہر جاتی رہی۔ اتنے عرصہ میں وہ نادر کے دوستوں کے حلقے میں بہت مقبول ہو گئی تھی۔ انھوں نے سیتا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عرصہ بعد ان کو ایک ہندو جیتی جاگتی لڑکی نظر آئی تھی۔ پہلی مرتبہ جب نادر نے اپنے چند انٹلکچوئیل دوستوں کو سیتا سے ملوانے کے لئے چاندپور ہاؤس مدعو کیا تو منجھلی خالہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر کہا تھا۔

"یہ نادر بھیا کی پارٹی ہے یا شیو جی برات۔ ایک سے ایک ہونق آدمی چلا آرہا ہے۔"

"یہ سب لوگ بھابی جان سے ملنے کے لئے بلائے گئے ہیں۔" ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"تمھاری بھابی جان بھی تو خبطی ہیں ___" منجھلی خالہ نے کہا۔

اب عرفان بے تکلفی سے سیتا کا نام لیتا تھا اور اسے "تم" کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا قیصر چالے کے لئے آئی ہوئی تھی اور دو دن بعد اپنے شوہر کے ساتھ پشاور جانے والی تھی۔

رات کو قیصر کے سسرال والوں کے اعزاز میں چاند پور ہاؤس میں بڑا بھاری ڈنر تھا بلقیس اب ٹھیک ہو چکی تھی اور نادر نے ان دونوں کے ساتھ شام کو ریکس میں ایک پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔

تیسرے پہر کو سیتا جلدی جلدی تیار ہو کر باہر جانے لگی تو بلقیس نے اسے آواز دی۔

"یس بلی ___؟" سیتا نے دروازے میں ٹھٹھکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی جا رہی ہو؟"

"ہاں تم ساڑھے پانچ بجے پیلس ہوٹل آجانا۔ میں تم کو وہیں بار پر ملوں گی۔"

"بار پر ___؟"

"ہاں۔ ہاں میں نے وہیں ڈک سے اپوائنٹمنٹ کیا ہے۔ وہ کل اتفاقاً مجھے انفنسٹن اسٹریٹ میں مل گیا۔ میرے ساتھ کولمبیا میں تھا۔ یہاں ورلڈ بنک کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔ کیوں؟"

"سیتا ڈارلنگ ___" بلقیس نے پلنگ پر سے اتر کر ہاؤس کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "تم ضرورت سے زیادہ EMANCIPATED ہو گئی ہو۔ یہ امریکہ یا انگلینڈ نہیں ہے۔"

"اوہ ___ مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ اچھا تو پونے چھ تک عرفان کے گھر آجاؤ۔ میں ڈک سے کہوں گی مجھے وہاں اتار دے۔ عرفان پیلس کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کچہری روڈ پر کل ہم لوگوں نے انہیں وہاں ڈراپ کیا تھا ___"

"عرفان کے گھر ___" بلقیس نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ "ڈارلنگ وہ بیچلر آدمی ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ تم اس کے گھر کیسے جا سکتی ہو؟"

"او مائی گوڈ ـــــ اچھا، سوری، میں تم کو زیادہ شوک نہیں کرنا چاہتی۔"

"ڈنر کے لئے ابھی سے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ تم کو واپس آکر تیار بھی ہونا ہے۔ نادرہ سے کہو آج بکھر گول کرے۔" بلقیس نے کہا۔

"اچھا ـــ" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

اپنے امریکن کلاس فیلو سے پیلیس کی بار پر ملاقات کرنے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر جاکر عرفان کو فون کیا۔ اب اسے جلد چاندپور ہاؤس واپس جانا چاہئے تھا مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ شام تنہا عرفان کے ساتھ گزارے۔

چند منٹ بعد عرفان آگیا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست عثمان بھی تھا۔ وہ تینوں جاکر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

سیتا نے سرخ رنگ کی کانجی ورم کی ساری پہن رکھی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ڈنر کا وقت آگیا۔ مگر وہ بے پروائی سے بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ عرفان نے اس کے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے سراپا پر نظر ڈالی اور مسکرا کر پوچھا

"میلہ ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے نہ غیرتِ شمس و قمر گئے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "سچ مچ آپ اردو دانوں میں پھنس کر میرا تو بقول نادرہ کو نڈہ شریف ہو گیا۔"

"اور اردو والے بھی کون ـــ لکھنؤا ـــ جو رند اور آرزو سے کم تو بات ہی نہیں کرتے۔" عرفان کے دوست نے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سیتا سے اجازت لی اور چلا گیا۔

اب رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پیلیس ہوٹل کے اس حصے میں نسبتاً خاموشی تھی۔ لوگ لاگورانے کی طرف جارہے تھے۔

"کافی پیو گی؟" عرفان نے پوچھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ غروب آفتاب کے بعد محض

سیاہ تھوے پر اکتفا کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔"

"تسلیم۔"

پھر اس نے سیتا کے بالوں پر نظر ڈالی۔

"تم مانگ میں سیندور نہیں لگاتیں؟"

"دراصل ـــــ وہ ـــــ میری سیندور کی ڈبیا ہی کہیں کھو گئی کراچی آتے میں ـــــ منجھلی خالہ کبھی کئی بار کہہ چکی ہیں کہ دلہن تم نے سیندور لگانا کیوں چھوڑ دیا۔ تمھاری سونی مانگ دیکھ کر ہول آتا ہے۔ ان کی خاطر میں نے سوچا کہ ضرور لگاؤں گی۔ مگر یہاں مل جائے گا سیندور؟"

"معلوم نہیں ـــــ" عرفان نے جواب دیا۔ "تلاش کروالو۔"

"آپ کہیں سے ڈھونڈ کر لا دیجئے ـــــ" پھر وہ یک لخت چپ ہو گئی۔ اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کیسی عجیب وغریب صورت حال تھی۔ اس نے اس آدمی سے سیندور لانے کے لئے کیوں کہا۔ جسے وہ جمیل کے نام پر لگائے گی۔

او مائی گاڈ ـــــ وہ دل میں کیا سوچتا ہو گا اس وقت۔ اس نے طے کیا کہ اسے ساری بات بتا دے۔

"آپ کو معلوم نہیں ـــــ" اس نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ "میں سیندور کسے لئے لگاؤں۔ جمیل مجھے چھوڑ چکے ہیں۔" پھر وہ تیوری پر بل ڈال کر اور پلکیں جھپک جھپک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تاکہ آنسو نہ نکلیں۔

"مجھے معلوم ہے۔" عرفان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ مجھے جب کسی نے نہیں بتایا تھا تب ہی معلوم ہو گیا تھا۔ میں پہلے روز جب تم سے شامیانے کے نیچے ملا تھا میں نے تمھاری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا کہ تم کتنی دکھی ہو ـــــ آؤ ـــــ" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "چاند پور ہاؤس چلیں۔ تمھیں قیصر کی دعوت میں دیر سے نہیں پہنچنا چاہئے۔ تم اس گھرانے کی بہو ہو۔"

" اور آپ کو بھی دیر نہیں لگانا چاہئے ۔ آپ اس گھرانے کے داماد بننے والے ہیں "
سیتا نے آہستہ سے کہا ۔ کیا کروں ۔ کیا ہو سکتا ہے ۔

" بالکل نہیں ۔ تمھیں معلوم ہے بلقیس کو میری ذرہ برابر پروا نہیں ۔"

" اور آپ کو ۔ آپ کو بھی اس کی پرواہ نہیں ؟"

" قطعی نہیں ۔ مگر تمھیں اس کا یقین کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ چلو اٹھو دیر نہ کرو ۔"

اس رات وہ چاند پور ہاؤس کے ڈنر سے جلد واپس چلا گیا ۔ گھر پہنچا تو دیر تک نیند نہیں آئی ۔ سنسان کمرہ اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا ۔ آخر جھنجھلا کر اس نے عثمان کو فون کیا ۔

" میں اعظم کی اسٹیگ پارٹی میں جا رہا ہوں ۔ تم بھی جم خانہ آ جاؤ ۔" عثمان نے جواب دیا ۔

" میں اب مزید کسی پارٹی میں نہیں جا سکتا ۔"

" یار تم آ تو جاؤ ۔ ایک کونے میں بیٹھ کر تمھاری سیتا ہی کی باتیں کریں گے ۔ آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں ۔ !"

" اچھا ۔ میں پہنچتا ہوں ۔"

وہ اپنے فلیٹ سے اتر کر ٹہلتا ہوا جم خانہ پہنچا ۔ عثمان ابھی نہیں آیا تھا ۔ وہ برآمدے میں بہت دور جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا ۔

سیتا ۔ سیتا ۔

" ۔ سیتا جمیل بڑی زبردست فلرٹ معلوم ہوتی ہے ۔" وہ چونک پڑا ۔ پام کے گملوں کے ادھر زور شور سے گفتگو ہو رہی تھی ۔ شاید وہی اسٹیگ پارٹی جا رہی تھی جس کے لئے عثمان نے اسے مدعو کیا تھا ۔

وہ آنکھیں بند کئے سنا کیا ۔

" ایسی ویسی خالص MAN-EATER OF KUMAYON معلوم ہوتی ہے ۔"

"اور اوپر سے بنتی پروگریسیو ہے۔"

"سرخوں کے یہاں تو اخلاق کا تصور بہت بلند ہے۔"

"اچھا ___!"

"روسی تو اس سلسلے میں اچھے خاصے وکٹورین ہیں۔"

"بکواس ___ ان میں سب چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔"

"شاید آپ کو علم نہیں کہ روسیوں کو "پانی کے گلاس" کی تھیوری رد کیے بھی زمانہ ہوگیا۔"

"آپ کو ان خاتون محترم نے برین واش کر دیا ہے۔"

"اجی وہ بے چاری کیا برین واش کریں گی۔ مگر آپ حضرات ان لوگوں میں سے ہیں جن کے قلوب پر اللہ میاں نے مہر لگا دی ہے۔ سچ ہے جہالت میں بڑی برکت ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان کی نجی زندگی کو اس کے سیاسی عقائد کی کسوٹی پر کیوں کسا جائے؟"

"افسوس کہ محض اس لڑکی سے مل کر جو اتنی کنفیوزڈ ہے آپ ساری اشتمالی لڑکیوں پر حکم لگا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں آئی بھی کون ___ سیتا جمیل۔ انڈیا سے یہاں صرف بی کلاس فلمیں منگوانے کی اجازت ہے اور سیتا جیسی PHONEY لڑکیاں ___"

"خیر ___ گائے کو دوسرے کے کھیت کی گھاس ہمیشہ زیادہ ہری نظر آتی ہے۔"

"بولتی بہت ہے۔ کل رحمان کے وہاں کھانے پر گھنٹہ بھر سب سے جھگڑتی رہی۔"

"سنا ہے ناچتی خوب ہے ___ کتھا کلی۔"

"بھئی عورتیں کتھا کلی نہیں ناچتیں۔"

"چلئے خیر میں کوئی بھانڈ تو ہوں نہیں جو مجھے ناچ کی اقسام معلوم ہوں۔"

"بہت اچھی لڑکی ہے بھئی۔ بس ذرا بیتی زیادہ ہے۔ بقول شخصے مچھلی کی طرح بیتی ہے۔"

"یہی تو اس کی ایک ادا ہمیں پسند آئی۔"

"واہ ــــ جانِ عالم واجد علی شاہ آپ ہی تو ہیں۔"

"ہم نے سنا ہے کہ اس نے اپنے میاں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اچھا۔ تو موقع ہے۔ قسمت آزمائی جائے۔ اوہو ادھر عرفان صاحب چھپے بیٹھے ہیں ارے بھئی عرفان۔ کیا خیال ہے۔ تم روشنی ڈالو اس معاملے پر ــــ"

"عرفان صاحب سے بات کرنا بے کار ہے۔ ولی اللہ آدمی ہیں۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

دوسری صبح سیتا اسے چاند پور ہاؤس کے پھاٹک پر مل گئی۔

"رات آپ کھانے کے بعد اتنی جلدی چلے گئے۔ یہاں خوب گانا وانا ہوتا رہا۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔"

"میں نے آپ کو کافی رات گئے فون بھی کیا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ آپ جمخانہ چلے گئے ہیں۔"

"اچھا۔"

"کیوں ــــ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟" اس نے ذرا سہم کر پوچھا۔

"سیتا!"

"جی ــــ؟"

"لوگ تمھارے لئے طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیا دلی میں بھی لوگ اسی قسم کی باتیں تمھارے لئے کرتے ہیں؟"

"ضرور کرتے ہوں گے مجھے پتہ نہیں۔"

"پرواہ بھی نہیں ــــ؟"

"اونہہ ــــ" وہ یک لخت جھنجھلا گئی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ "اندر چلئے اسباب بندھ چکا ہے۔ آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

اندر باقاعدہ رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ کراچی کی رشتہ دار بیبیاں شادی میں آئی ہوئی

ہندوستانیوں بیبیوں سے گلے مل مل کر زار و قطار رونے میں مصروف تھیں۔ بلقیس سُوں سُوں کرتی پھر رہی تھی۔ مرد لوگ بھی ناک سنک سنک کر آنسو پونچھ رہے تھے۔ منجھلی خالہ لپٹ لپٹ کر سب کی بلائیں لے رہی تھیں۔

عرفان نے گیلری کے دروازے میں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا اور اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

سارے ہندوستانی رشتہ دار ہوائی جہاز سے واپس جا رہے تھے۔ صرف بلقیس اور سیتا نادر اور عرفان کے ساتھ لاہور جانے والی تھیں۔ کراچی سے بھی دو تین کزن لاہور تک ہمراہ جا رہے تھے۔ ساری پارٹی باہر آ کر موٹروں میں لدی۔ سیتا بلقیس کے ساتھ نادر کی کار میں بیٹھ گئی۔ عرفان نے دوسرے عزیزوں کو اپنی ٹیسو میں بھرا۔ "امام ضامن کی ضامنی" کے غل میں موٹریں "فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ" کے ٹیڑھے میڑھے راستے سے نکل کر ڈرگ روڈ پر آئیں اور ٹھٹھہ کے لئے روانہ ہو گئیں۔

(۷)

"نگر ٹھٹھہ ــــ" نادر نے شاہ جہاں کی مسجد کے سامنے کار روکتے ہوئے گویا اناؤنس کیا۔ جب وہ بھری دوپہر میں جامع مسجد کا چکر لگا کر "بنیوں کی گلی" میں سے گزر رہے تھے اس وقت ان اجاڑ مکانوں میں جو سرکنڈے اور مٹی سے بنائے گئے تھے ہوا ایک دم بہت تیزی سے سنسنانے لگی اور ایسا معلوم ہوا جیسے یہ جگہ دنیا کی ساری پریشان حال، آوارہ، غریب الوطن روحوں کا لرزہ خیز مسکن ہے۔ سیتا خاموشی سے پیچھے پیچھے بلقیس کے ہمراہ چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد عرفان اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"آپ کو معلوم ہے اس کا نام ٹھٹھہ کیوں ہے؟" اس نے گوگلز اتارتے ہوئے عرفان سے پوچھا۔

"نہیں ــــ"

"مغل گورنر کے زمانے میں یہ شہر اتنا بارونق اور اتنا آباد تھا کہ یہاں پوری ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کے لگے رہتے تھے۔"

جب وہ کاروں میں سوار ہونے لگے تو بلقیس نے اس سے چپکے سے کہا۔ "تم عرفان کی کار میں بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا نسیم باجی وغیرہ سے گپیں ہانکنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں ان کی کار میں جا کر بیٹھی تو عرفان اور میں دونوں خواہ مخواہ کی کوفت محسوس کریں گے۔ خصوصاً نسیم باجی وغیرہ کے سامنے ــــ میں ان سب کو نادر کی کار میں بلوائے لیتی ہوں۔"

چنانچہ ٹھٹھہ سے روانہ ہوتے وقت سیتا کو عرفان کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ تینوں رشتہ دار نادر اور بلقیس والی کار میں منتقل کر دیئے گئے۔

اب یہ لوگ صحرا میں سے گزر رہے تھے۔ سیتا نے عرفان سے پوچھا۔ "آپ نے اس روز مجھ سے سوال کیا تھا کہ مجھے کراچی کیسا لگا۔ اب یہی سوال میں آپ سے کرتی ہوں۔ میرا سندھ آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

وہ اس پر نظر ڈال کر چپ رہا۔

"اب مجھے یہ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے کہ ڈیڈی مجھ سے مارے سوالوں کے ناک میں دم کر دیں گے۔ تم نے فلاں جگہ دیکھی۔ فلاں گاؤں سے گزریں۔ ممی نے اتنا کہا تھا کہ اپنی کوٹھی دیکھ کر آؤں کس حال میں ہے۔ میں نے وہ بھی نہیں دیکھی۔"

"تمہارے ڈیڈی کراچی میں کیا کرتے تھے؟"

"ڈاکٹر تھے ــــ رام باغ میں ان کا کلینک تھا۔"

"رام باغ ــــ؟"

"رام باغ کراچی میں ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا؟"

"ارے ہاں۔ اسے اب آرام باغ کہتے ہیں۔"

سامنے سے اونٹوں کا قافلہ جارہا تھا۔ ایک بکری سڑک پار کرتے ہوئے کار کی زد میں آگئی تو اس نے زور سے بریک لگائی۔ دھچکے کی وجہ سے سیتا تقریباً عرفان کے اوپر جاگری۔"سوری" سیتا نے گھبرا کر کہا۔

"قصور میرا تھا ___ بکری کا نہیں ___ اب ___ اب تمھارے ڈیڈی دلی میں پریکٹس کرتے ہوں گے ؟" عرفان نے بھی اپنی گھبراہٹ میں سلسلۂ گفتگو وہیں سے جوڑنا چاہا۔

"جی نہیں ___ وہ کئی سال سے بیمار ہیں۔ اس لئے کچھ نہیں کرتے۔ میرا چھوٹا بھائی بھلائی کی اسٹیل مل میں انجینیر ہوگیا ہے۔ اسی بے چارے کی وجہ سے گزر ہوتی ہے۔"

"اوہ ___"

"وہ سامنے دیکھئے۔ ہم لوگ حیدرآباد جاتے ہوئے اکثر اس درخت کے نیچے کار روکتے تھے۔ یہیں پر ایک بار میری ٹانگ میں بڑی چوٹ آگئی تھی۔"

وہ چپ چاپ کار چلاتا رہا۔

"کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ یہ میرا دیس ہے۔ میرے کھیت۔ میرے گاؤں ___ میرے پیروں کے مزار۔" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس قدر سنٹی منٹل ہو ___" عرفان نے کہا۔

"جب کبھی آپ دلی آئیے تو راستے میں جمنا کے پل پر سے گزرتے ہوئے میں دیکھوں گی کہ آپ سنٹی منٹل ہوتے ہیں یا نہیں۔"

"میں یادوں کا روگ نہیں پالتا ___"

"اچھا ہوا کہ مجھے آپ نے یہ بات بتادی ___!"

"دوسری بات یہ کہ ___ میں دلی آنے ہی کیوں لگا۔"

"کیوں کہ وہاں آپ کی سسرال جو بننے والی ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ پھر تم نے میکے سسرال کا وظیفہ شروع کر دیا۔ عورتوں والی بھیٹپچر باتیں۔"

اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ وہ برابر نادر کی کار کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اور یہ خیال رکھتا تھا کہ اس کے پیچھے نہ ہونے پائے تاکہ وہ دونوں پچھلی والی موٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں کے سامنے رہیں۔

کس قدر محتاط آدمی ہے واقعی۔ سیتا نے سوچا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دھول اڑاتی ہوئی ایک ٹرک قریب سے نکل گئی۔ اب وہ ایک قدیم قبرستان کے برابر سے گزر رہے تھے۔

"سارا سندھ قبروں کا ملک ہے۔" عرفان نے چند لمحوں کے بعد اظہار خیال کیا۔

"آپ کو پتہ ہے یہ کتنا پرانا ملک ہے؟" وہ شاید اس کی معلومات میں اضافہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ واقعی بہت بکی لڑکی ہے۔ یہ کچھ دیر چپکی کیوں نہیں رہ سکتی؟ مگر شاید انسان اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے متواتر باتیں کئے جاتا ہے۔ تھرڈ ڈگری کا ایک طریقہ یہ بھی ہے ـــــ عرفان نے سوچا۔

"نہیں ـــــ" اس نے بآواز بلند کہا۔ "میں تاریخ میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں۔"

"ممی بتایا کرتی تھیں کہ پرانوں میں لکھا ہے کہ راجکمار سبی کی اولاد بلوچستان میں پھیلی۔ اور اجودھیا کے رام چندر کے بھائی بھرت سندھو دیش کی راج گدی پر بیٹھے۔ وہ بڑے یقین سے کہتی ہیں کہ مہابھارت کے بعد کالی یگ شروع ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس کے بعد پرانوں میں سندھ کا ذکر نہیں ملتا۔"

"اچھا!؟ اور بتاؤ۔"

"مذاق مت اڑائیے۔"

"ارے ـــــ نہیں نہیں۔ بتاؤ بھئی۔ میں بہت دلچسپی سے سن رہا ہوں۔"

"یونانی اس ملک کو انڈوسیتھیا کہتے تھے کیونکہ جنوبی سندھ کے لوگ آرین نہیں بلکہ سیتھین تھے۔"

" اچھا — ! ؟ مجھے ان دونوں نسلوں کا فرق نہیں معلوم۔ بھئی میں بہت جاہل آدمی ہوں۔ مگر تم بولے جاؤ۔ تمھاری آواز سننا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

" گڈ مما ڈ —"

اب وہ حیدرآباد کے قریب پہنچ رہے تھے۔" ویسٹ ایشیا سے آئے ہی سیتھین لوگ کاٹھیاواڑ اور راجستھان تک پھیل گئے۔ جو بعد میں اب راجپوت کہلاتے ہیں نا —"

" اچھا — !"

" پراچین زمانے میں میرپور خاص میں برہما کی بڑی سندر مورتی کا مندر تھا اور ملتان میں سوریہ کا مندر تھا۔ سہوان میں پرانے آریوں نے شیو کے مندر بنائے تھے۔"

" تم کبھی مندر گئی ہو ؟"

" ہاں — بچپن میں بہت گئی ہوں۔ ٹنڈو آدم میں ان گنت شوالے تھے۔ اسی لئے یہ سندھ کا کاشی کہلاتا ہے۔ ہیم کورٹ میں مہادیو کا مندر تھا۔ میں اپنی ماسی کے ساتھ ایک بار گئی تھی۔ اور کلفٹن پر جو مندر تھا وہاں میں شیوراتری کے روز ممی کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ میری دادی کالی کی بہت پوجا کرتی تھیں۔ ہمارے یہاں کالی کا ایک روپ تھرمائی کہلاتا ہے یعنی تھر ریگستان کی دیوی۔" پھر وہ چپ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی بات شروع کی۔" ممی بڑی رام بھگت ہیں۔ کراچی میں تھیں تو بڑی تمنا تھی کہ تیرتھ رام کے لئے اجودھیا جائیں۔ جب میں نے جمیل سے شادی کر لی تو ان کو بتایا کہ جمیل کا گاؤں تلسی پور اجودھیا سے صرف چار پانچ میل دور ہے۔ کتنی عجیب بات ہے نا !"

" کوئی خاص عجیب بات نہیں۔ تم زندگی کے ہر معمولی سے معمولی واقعے کو بھی حد سے زیادہ ڈرامیٹک بنا دیتی ہو۔"

" او۔ کے — او۔ کے — آپ مجھے بالکل مورکھ سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں سندھی میں ایک کہاوت ہے کہ عورت کی عقل اس کی ایڑی میں ہوتی ہے اور سورج ڈوبنے کے بعد وہاں سے

کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ آپ کا بھی شاید یہی خیال ہے! —— مگر میں تو سادھ بیلا بھی جاؤں گی۔

"ضرور جانا بھئی۔ تم جذباتی سفر پر نکلی ہو۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"شٹ اپ!"

"ہلو —! ذرا میرا ادب کرو —!"

"لائیک ہل[1] —!"

"ایک بات بتاؤ۔"

"جی —"

"تم ہندو لوگ پیپل کی شاخ کاٹنے پر اتنا ہلڑ کیوں کرتے تھے؟ ہر دوئی میں جب بھی تعزیہ پیپل میں اٹکا اور ہوا سر پھٹول۔"

"پیپل میں مہادیو جو رہتے ہیں۔"

"اوہ —— آئی سی!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا "پیپل کی بھی ہماری زندگیوں میں عجیب و غریب اہمیت تھی۔ اماں کہتی تھیں کہ پیپل میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ پیپل کے نیچے شہید مرد کے مزار ہوتے تھے۔ ہر دوئی میں میرے گھر کے سامنے پیپل کا جو درخت تھا اماں کبھی ہم بچوں کو دونوں وقت ملتے اس کے نیچے نہیں جانے دیتی تھیں کہ سایہ نہ ہو جائے۔ اور روز شہید مرد کے مزار پر چراغ جلواتی تھیں۔"

اس کی آواز جذباتی ہو گئی۔

"اب سنٹی منٹل کون ہو رہا ہے؟" سیتا نے کہا۔

"شٹ اپ!!"

دور سے حیدرآباد کے بادگیر نظر آنے لگے۔

---

[1] LIKE HELL

"اب سُوں سُوں کر کے رونا شروع کر دینا ـــــ لو رومال" عرفان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا۔

وہ ہنس پڑی۔

سرکٹ ہاؤس کی سڑک پر کار موڑتے ہوئے اس نے سیتا سے کہا "تم مجھے سندھ کا قصہ سنا رہی تھیں۔ وہ پورا کر دو۔ سیتھین لوگ آئے۔ پھر کیا ہوا؟"

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے بیٹھ گئی۔ گویا یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہو۔

"پھر یہاں بدھ مت خوب پھیلی۔ اور یہاں سرسوت برہمن رہتے تھے اور راجپوت اور جاٹ۔ اَروَر شہر کے باسی مسلمانوں کے حملے کے وقت پنجاب بھاگ گئے۔ میری ممی لاہور کی اروڑہ ہیں۔ سندھی لوگ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے پرانے مذہب کی عزت کرتے رہے۔ بے شمار درگاہیں بن گئیں۔ ان سب پیروں کا ایک ایک نام ہندو تھا اور ایک ایک محمڈن ـــــ"

"اچھا واقعی ـــــ"

"ہاں۔ راجہ بھرتری لال شہباز بنے۔ پیر پتھو پیر سلطان۔ زندہ پیر خواجہ خضر۔ اور دیرو لال شیخ طاہر بن گئے۔ لالو جسراج منگھو پیر بنے ـــــ"

"منگھو پیر ـــــ ارے وہی کراچی والے منگھو پیر ـــــ؟"

"جی ہاں"

"بھئی کمال ہے"

"کبھی آپ میرے ڈیڈی سے ملئے تو وہ آپ کو یہ سب قصے سنائیں گے۔ ان کو سندھ کی ہسٹری بہت معلوم ہے۔ اب بھی اکثر بیٹھے چچ نامہ پڑھا کرتے ہیں"

"اور بتاؤ ـــــ"

"بس۔ جیسے ہندوؤں کے یہاں ہر چیز کے لئے ایک نہ ایک دیوی دیوتا ایجاد کر لیا جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کے یہاں ہر چیز کے لئے الگ الگ پیر بن گئے۔ راگوں کے پیر، مٹی کے

برتنوں کے پیر، بنگوڑے کے پیر، سارا سندھ پیروں کا دیس بن گیا۔ سانپوں کے منتر جاننے والے جوگی سب مسلمان ہوتے تھے مگر شو کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور گورکھ ناتھ کو مانتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ رمضان کا مہینہ ہندوؤں کے لئے پوتر بن گیا اور وہ تعزیوں کے سامنے نذر ونیاز چڑھانے لگے۔ آپ کی طرف بھی یہی سب ہوتا تھا ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔"

"مذہب نے واقعی ہم لوگوں کے لئے پہلے سینکڑوں برس تک زبردست افیم کا کام کیا ہے اور اس کے بعد گولے بارود کا ۔۔۔"

"اب تم اپنی تقریر ست شروع کرو۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ سرکٹ ہاؤس پہنچتے ہی کھانے کا انتظام کرو ۔۔۔۔۔"

"آپ کو سمجھانا بالکل بے کار ہے۔ ری ایکشنری!"

رات کو کھانے کے بعد نادر نے سیتا کو سگریٹ جلا کر دیا اور وہ اور بلقیس اور دوسرے لوگ باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وہ میز پر بیٹھی گلدان میں سے ایک پھول نکال کر اس کی پنکھڑیاں الگ کرتی رہی۔ عرفان سامنے کی کرسی پر نیم دراز سے سگریٹ کے کش لگاتے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم سگریٹ بھی پیتی ہو ۔۔۔"

"اس 'بھی' کا کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم اس وقت ضرورت سے زیادہ اداس ہو۔ تم نے یہاں کا باغ دیکھا۔ کتنا خوبصورت ہے۔"

"جی ۔۔۔"

"آج چاندنی رات ہے اس لئے اور زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔"

"جی ۔۔۔"

ڈرائنگ روم میں سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

عرفان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح خوش کرے۔ نفسیات کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر انسان کی الجھنیں دور کرنا ہوں تو اس سے اس کی بچپن کی باتیں کرو۔

"مجھے کچھ اپنے بچپن کے متعلق بتاؤ۔" اس نے بڑے ماہر فن کی طرح کہا۔

"آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے ینگ کی روح آپ ہی میں حلول کر گئی ہے۔"

"ہاہاہا ۔۔۔" وہ پھر اپنی کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"پھر آپ اپنے بچپن کے متعلق بتائیں گے ۔۔۔ معاف کیجئے۔ یہ بڑی پٹی پٹائی تکنیک اور گھسی گھسائی سچویشن ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ تم تو کوئی بات کرنے ہی نہیں دیتیں۔ تمھیں بیرسٹر ہونا چاہئے تھا۔"

جمیل نے بھی اسے اپنے بچپن کے متعلق بتایا تھا۔ اس نے بڑی جذباتی آواز میں کہا تھا۔ ہمارا گھر گھا گھرا سے ذرا دور پر ہے۔ میری اماں کھانا بہت عمدہ پکاتی ہیں۔ میری چھوٹی بہن کا نام قیصر ہے۔ بڑی سخت چڑیل ہے۔ اب وہ بڑے بھیا کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے۔ ایک دفعہ میں نے اسے کوٹھے پر لے جا کر بند کر دیا اور نیچے سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر میری خوب ٹھکائی ہوئی۔ میری دو خالائیں ہیں۔ فرخندہ باجی چھوٹی خالہ ہی کی لڑکی تو ہیں۔ فرخندہ بجیا بہت دلیش بھگت اور بڑی گریٹ آدمی ہیں۔ بالکل دیوی ہیں ایک دم۔ تم ان سے دلی میں کبھی ملنے نہیں گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان کی ایسی بن جاؤ۔ ان کی چھوٹی بہن کا نام بلقیس ہے۔ میں اور بلقیس تلسی پور میں بڑے ابا کی بگیا میں جا کر خوب امرود چراتے تھے اور جب قیصر کی بچی جا کر چغلی کھاتی تو ۔۔۔"

"فضول ۔۔۔ فضول ۔۔۔"

مگر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کے تلخ لہجے نے عرفان کو رنجیدہ کر دیا ہے۔ اس نے عرفان کے خلوص کا جواب بدتمیزی سے دیا تھا اور وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ (وہ تو جمیل کو کبھی ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا؟)

"میں — میں اسی حیدرآباد میں پیدا ہوئی تھی۔" اس نے ذرا احساس جرم کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ اور پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا کہ وہ سن رہا ہے کہ نہیں — "ہم چار بہن بھائی تھے ہم چار —" پھر اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"دراصل —" عرفان نے اس سے کہا۔ "میں تقسیم سے پہلے کبھی سندھ نہیں آیا۔ اسی لئے اس طرح کرید کرید کر تم سے سوالات کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں لاہور اور پشاور اور کراچی اور حیدرآباد سندھ کیسی جگہیں تھیں اور ان کے باشندے۔۔"

"ان جگہوں میں سے ایک کی باشندی تو میں خود ہی آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

"باشندی!" وہ بے اختیار ہنس پڑا — "واللہ خوب شے ہیں آپ بھی —" پھر اس نے کہا — "دراصل سیتا — تم مجھے بے حد غیر جذباتی سمجھتی ہو مگر جلاوطنی کا مسئلہ مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ مغربی برلن میں، ہانگ کانگ میں ہر جگہ میں نے پناہ گزینوں کو دیکھا ہے۔ امریکن شہروں میں مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگوں سے ملا ہوں۔ جورڈن میں فلسطینی مہاجروں کی حالت دیکھی ہے — اور جو میں بات بات پر تم سے الجھتا ہوں اور تمھاری ہر بات مذاق میں ٹالنا چاہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں چالیس کروڑ انسانوں کی نفسیات یکسر بدل گئی ہے۔ ان کے خیالات نظریئے، جذبات، ردعمل، میرے اور تمھارے درمیان اب کوئی قدر مشترک باقی نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم لوگ کیا سوچتے ہو، کیا پڑھتے ہو، کیا کرتے ہو۔ جب بلقیس اپنی تھیوریٹیکل معرفیات کا ذکر کرتی ہے، مجھے لگتا ہے کسی دوسرے کرے کی باتیں سُن رہا ہوں۔ چھوڑو۔ ہم نے پھر پولیٹکس شروع کر دی جس سے مجھے نفرت ہے۔"

"آپ میرے بچپن کے متعلق پوچھ رہے تھے۔"

"ہاں — ہاں —"

"ہم چار بہن بھائی تھے —" اس نے فرمانبرداری سے پھر بچوں کی طرح گویا سبق

سنانا شروع کر دیا۔" پہلے ہم یہیں حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ہیرآآباد میں ہمارا مکان تھا جو ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ پھر ہمارے ڈیڈی نے کراچی میں پریکٹس شروع کردی اور وہاں کوٹھی بھی بنوالی۔ میں گرمیرا اسکول اور اس کے بعد سینٹ جوزفز کالج میں پڑھتی رہی۔ ہمارا بہت بڑا خاندان تھا۔ رشتے کے چاچے اور مامے اور ماسیاں۔ ان میں سے کچھ عامل کالونی میں رہتے تھے اور کچھ لاڑکانہ اور حیدر آباد میں۔ میرا بھائی صرف ایک ہے اور دو بہنیں ہیں۔ یہ تینوں پارٹیشن کے سمے کافی چھوٹے چھوٹے سے تھے۔" پھر اس کی آواز اداس ہوتی چلی گئی۔" جب پارٹیشن ہوا تو ہم لوگ جہاز پر بیٹھ کر کاٹھیاواڑ کے ایک پورٹ پر جا اترے۔ اگست کے بعد اگلے تین مہینوں میں لاکھوں شرنارتھی ہوائی جہاز، ریل اور سمندر کے ذریعے یہاں سے گیا تھا۔۔۔"

"اس زمانے میں ٹرین چلتی تھی —؟"

"جی ہاں — اسپشل ریفیوجی ٹرین چلائی گئی تھی۔ جو میرپور خاص سے مارواڑ جنکشن تک جاتی تھی۔ وہاں ٹرانزٹ کیمپ قایم کر دیئے گئے۔ جو لوگ یہاں سے گئے وہ زیادہ تر شہری پیشہ ور تھے۔ زمینوں پر بسانا انھیں بہت مشکل تھا۔ یہ سب کے سب بمبئی پریزیڈنسی، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے ریفیوجی کیمپوں میں بھیج دیئے گئے۔ میرے رشتہ دار بھی احمد آباد، جودھپور، وندھیا پردیش جانے کہاں کہاں بکھر گئے۔ بہت سے سندھی شرنارتھی بھوپال بھیج دیئے گئے۔"

"تم لوگ کہاں رہے؟"

"ہم پہلے گاندھی دھام میں رہے۔ پھر الہاس نگر میں۔ یہ سندھیوں کے لئے نئے سٹیلمنٹ بسائے گئے تھے۔ گاندھی دھام ہی میں ڈیڈی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ سارے سندھی شرنارتھیوں کی طرح ان کو بھی دو سال تک مالی امداد دی جاتی رہی۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں یہ امداد بند ہوگئی۔ کچھ کیمپوں میں بیماروں اور بوڑھوں کو رکھا گیا تھا۔ ڈیڈی بھی چند روز کے لئے وہاں بھیج دیئے گئے۔ اس کے بعد ہم دلی آگئے۔ اس وقت تک سب شرنارتھی کاروبار کی تلاش میں

سارے ہندوستان میں پھیل چکے تھے۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

ڈرائینگ روم میں اب رمی شروع ہو گئی تھی۔ عرفان نے سگریٹ جلایا لیکن اسے پیش نہیں کیا۔

"اب ہم وہ لوگ ہیں جن کا کوئی دیس اپنا نہیں۔ پنجابیوں کو کم از کم مشرقی پنجاب تو مل گیا۔"

"تمھارے ڈیڈی اب کچھ نہیں کرتے؟"

"نہیں۔ میں نے بتایا تو۔ وہ مستقل بیمار رہتے ہیں۔ ہم عامل لوگ زیادہ تر ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر، اسی طرح کے لوگ تھے جیسے آپ کے ہاں کائستھ ہوتے ہیں نا یو۔پی۔ میں۔ اسی طرح کی یہ کاسٹ تھی۔ کلھوڑہ اور تالپور امیروں کی حکومت میں یہی لوگ سارا ایڈمنسٹریشن کرتے تھے، اس لئے عامل کہلانے لگے۔"

"تم لوگ کیا ہو — برہمن —؟"

"نہیں بھئی — عامل کھتری ہوتے ہیں مگر اس ہجرت کی وجہ سے سارے طبقے الٹ پلٹ ہو گئے۔ عاملوں اور برہمنوں کو بھی وہاں فٹ پاتھ پر دوکانیں کھولنا پڑیں۔ پرانی ریت رسمیں، پیر فقیر، درگاہیں، مندر سب یہیں رہ گئے۔ یہاں کا اصل مذہب صوفی ازم تھا۔ اس صوفی ازم کے اثر سے ہم لوگ کٹر قسم کے مذہب پرست کبھی نہیں رہے۔"

چند منٹ تک وہ میز کی چادر پر کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"تم سندھی پڑھ لیتی ہو؟"

"ارے بالکل۔ آپ کیا سمجھتے ہیں میں اتنی میم صاحب ہوں کہ اپنی زبان نہیں جانتی؟ آپ نے تو یہاں سندھی ضرور سیکھ لی ہوگی۔"

"نہیں —" عرفان نے ذرا جھجھک کر جواب دیا۔ پھر پوچھا — "تمھارا مضمون ڈاکٹریٹ کے لئے کیا تھا؟"

"یہی — ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کا سماجی انقلاب۔ آپ کے یہاں بھی اس سبجکٹ

پر بہت کام ہو رہا ہوگا۔ مجھے کچھ کتابوں کے نام بتائیے گا۔ میرا موضوع "پنجاب کے شرنارتھی" تھا"

"اب ساڑھے بارہ بج رہا ہے سیتا۔ جا کر سو رہو۔"

"بہت اچھا" وہ اسی فرمانبرداری سے اٹھی اور اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

صبح کو وہ ناشتہ کے بعد برآمدے میں کھڑی تھی۔ اتنے میں سرکٹ ہاؤس کا مالی پھولوں کی ڈالی لے کر آیا۔ عرفان اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ "بیگم صاحب کے لئے پھول لایا ہوں صاحب" مالی نے کہا۔

"اچھا دے دو بیگم صاحب کو ــــــ"

وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

موٹروں میں سوار ہوتے وقت عرفان نے اس سے کہا ــــ "کل تم نے بے حد میرا دماغ چاٹا ہے۔ آج ذرا میں آرام کرنا چاہتا ہوں اس لئے تم نادر کے ساتھ جاؤ۔"

جس وقت وہ لوگ خیرپور سے گزر رہے تھے۔ سیتا نے دفعتاً کہا ــــ "میں پیر اللہ بخش جمالی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

سب نے اس کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے بیگ سے نوٹ بک نکال کر اتہ پتہ بتایا: "ڈیڈی کے دوست تھے۔ ڈیڈی نے کہا تھا اور کسی سے نہیں تو کم از کم ان سے ضرور مل لینا۔"

بہت دیر تک وہ پیر اللہ بخش جمالی کی کوٹھی ڈھونڈتے پھرے۔

"چلو سرکٹ ہاؤس پہنچ کر وہاں سے معلوم کر والیں گے۔" بلقیس نے تجویز کیا۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس جاتے ہوئے انھیں پیر صاحب کی کوٹھی نظر آگئی۔

شام کی چائے کے بعد دفعتاً اندھیرا ہو گیا۔" میں بھول گیا تھا کہ جاڑوں کے زمانے میں

سورج جلدی ڈوب جاتا ہے۔" نادر نے کہا۔ "چلئے اب آپ کو آپ کے پیر صاحب کے ہاں چھوڑ آئیں۔ عرفان بھائی آپ بھابی جان کو لے جائیے ہم سب کی پوری برات جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اب تم پھر میرے سر پر سوار ہو گئیں۔" عرفان نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اب چھٹکارا مل گیا۔"

پیر صاحب کی کوٹھی کی برساتی میں پہنچ کر اس نے سیتا سے کہا۔ "تم اندر ہو آؤ۔ میں گھنٹے بھر بعد آ کر لے جاؤں گا۔"

"واہ آپ کیوں نہیں ساتھ چلتے؟"

"مجھے سندھیوں سے ملتے ہوئے ذرا گھبراہٹ ہوتی ہے۔" عرفان نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی!"

"بھئی تم ہی بتلاؤ۔ وہ ہوں گے پرانی قسم کے اصلی تے وڈے وڈیرے۔ نہ میں ان کی سمجھوں گا نہ وہ میری۔ اور یہ تو بڑے غضب کی بات ہو گی کہ باہر سے آ کر تمہیں ان کے جذبات کی ترجمانی کرنا پڑے۔"

سیتا کار میں بیٹھے بیٹھے باغ کے گھنے درختوں کو دیکھتی رہی۔ "میں بچپن میں ڈیڈی کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھی۔ ڈیڈی پیر صاحب کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ہمارے دادا حیدرآباد کے مشہور وکیل تھے۔ ہز بخش میر چندانی کا نام آپ نے اب بھی سنا ہو گا۔"

اس نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا۔ لہذا سگریٹ جلا کر خاموش رہا۔

"دادا جی پیر صاحب کے قانونی مشیر تھے۔ دوسرے وڈیروں کی طرح پیر صاحب بھی مستقل مقدمے لڑا کرتے تھے۔" عرفان نے ہارن بجایا۔ مگر چاروں طرف سناٹا تھا۔ سیتا نے پھر بات شروع کی۔ "آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں معلوم ——!" عرفان نے تبسم کے ساتھ اس کی بات کاٹی۔

"آپ کو معلوم ہے انگریزوں کے زمانے میں ہندوؤں نے خوب ترقی کر لی اور ہندو مہاجنوں

کے پاس مسلمان تقریباً گروی ہو گئے۔ سندھی مسلمانوں کی کوئی مڈل کلاس نہیں بنی اور یہ وڈیرے لوگ اسی طرح اپنی فیوڈل ازم میں قلعہ بند بیٹھے رہے اور شاید اب بھی اسی طرح بیٹھے ہیں۔"

"سارے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی یہی ایک سی کہانی تھی۔ شاید اسی وجہ سے پاکستان بنا۔" عرفان نے جواب دیا۔

"بچپن میں میں پیر صاحب کی بیویوں کے زیور اور لباس دیکھ دیکھ کر مسحور ہوا کرتی تھی۔ یہ لوگ کس قدر بیک ورڈ اور کتنے دولت مند ہیں۔ اس کا آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔"

ایک مچھیل سندھی ملازم بڑے گھیر کی سیاہ شلوار میں ملبوس اندر سے نکلا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نو واردوں کو سلام کیا اور ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ سیتا فوراً اندر زنان خانے میں چلی گئی۔ عرفان ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرہ بیش قیمت فرنیچر سے اٹالوٹ بھرا ہوا تھا۔ فرش پر اعلیٰ ترین قالین بچھے تھے۔ دبیز ریشم کے پردوں پر سنہری ڈوریاں بندھی تھیں۔ کچھ دیر بعد گھنی داڑھی اور غلافی آنکھوں والے پیر اللہ بخش جمالی اندر سے تشریف لائے۔ جھک کر دونوں ہاتھوں سے عرفان سے مصافحہ کیا اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ٹھوس چاندی کے ٹی سیٹ میں چائے آگئی اور انھوں نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد ملکی سیاست کی بوالعجبیوں پر گفتگو شروع کی۔ یہ سر فیروز خاں نون کی وزارت کا زمانہ تھا اور ملک میں شدید افراتفری مچی ہوئی تھی۔

پھر وہ اٹھ کر اندر گئے اور سیتا کو ساتھ لے کر واپس لوٹے اور بڑے ریشمی رومال سے آنسو پونچھ پونچھ کر سیتا کے سر پر ہاتھ پھیرا کئے۔ جب سیتا پیر صاحب سے سندھی میں باتیں کر رہی تھی اس وقت عرفان کو شدت سے محسوس ہوا کہ وہ اس جگہ پر کتنا اجنبی ہے۔

مچھیل ملازم نے بڑا سا اٹیچی کیس کار میں رکھا۔

کار اسٹارٹ کرنے کے بعد عرفان نے مذاقاً پوچھا "بہت زبردست تحفے مار لائیں۔"

"میں نے دیکھے نہیں۔ انھوں نے ڈیڈی، ممی اور میرے لئے الگ الگ جانے کیا کیا چیزیں دی ہیں۔ بہت قیمتی سامان ہی ہوگا۔ یہ لوگ بے حد جذباتی اور بے حد دیالو ہیں۔"

"تم جذبات کی اتنی قدر کرتی ہو اور اوپر سے بنتی اتنی منطقی ہو — فراڈ — !!"

دوسرے روز ان لوگوں کا قافلہ خیر پور شہر سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب پرانی اینٹوں کی اداس عمارتیں تھیں جن کی محرابوں کے نیچے بوڑھے باوقار دراز ریش مسلمان سندھی باتیں کر رہے تھے۔ یہ لوگ بات بات پر ہاتھ جوڑتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز اور سوتے سوتے موسیقی ریز لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ بڑی عجیب اداس، نرم دھیمی دھیمی تہذیب تھی جو عرفان نے اس ملک میں نو سال تک رہ چکنے کے باوجود اب تک نہیں دیکھی تھی۔

"کمال ہے!" عدالت کے سامنے گیئر بدلتے ہوئے اس نے سیتا سے کہا۔

"واقعی عجیب سی بات ہے کہ میں اس ملک کا باشندہ ہوں اور تم اور تم غیر ملکی ہو"

"لیکن مجھے اب اس صورتِ حال کی عادت پڑ چکی ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں نیویارک سے جمیل کے ساتھ ہندوستان آئی تھی تو منجھلی خالہ اپنے بھانجے سے ملنے کے لئے کراچی سے فیض آباد آگئی تھیں اور انھوں نے مجھے سارے لکھنؤ کی سیر کرائی تھی اور تلسی پور اور چاند پور کی پرانی ریت رسموں سے روشناس کرایا تھا۔ مگر فیض آباد سے لکھنؤ پہنچتے ہی مجھے ایک غیر ملکی کی حیثیت سے ان کو پولیس اسٹیشن میں اپنی آمد اور اس کے بعد روانگی کی اطلاع درج کروانا پڑی تھی۔"

سندھ کے شہروں میں ہر طرف اداسی اور بے رنگی اور ریت اور دھول تھی۔ انگریزی عہد کی یادگار ضلعوں کی عمارتیں سول لائنز کی گرد آلود سڑکوں کے کنارے خاموش کھڑی تھیں۔ انگریز سارے برصغیر میں پشاور سے لے کر مدراس تک اور بہار سے لے کر سندھ تک، اضلاع کے طرزِ تعمیر اور ماحول اور مسائل کا یکساں پیٹرن بنا کر جا چکے تھے۔ وہی کچہریاں، وہی باغات، وہی ڈاک بنگلے، وہی ریلوے اسٹیشنوں کے کول تار سے لپے اونچی ڈاٹ والے ویٹنگ روم اور ان کا یکساں بھدا فرنیچر۔

سکھر کا یہ سرکٹ ہاؤس جس میں وہ سب ابھی آن کر اترے تھے بلند شہر یا بلاسپور یا گیا کسی بھی جگہ اٹھا کر رکھا جا سکتا تھا۔ وہی خانساماں تھا جس نے لپکتے ہوئے سامنے آکر بڑے صاحب کو سلام کرنے کے بعد پوچھا تھا کہ چھوٹا حاضری کس وقت کھائیں گے۔ اس کا نام یا رسول بخش تھا یا

گز بھن ۔ مالی کا نام چراغ دین تھا یا رام کھلاون ۔ مگر دنیا تبدیل ہو چکی تھی ۔ انسان بدل گئے تھے ۔ کیا واقعی انسان بدل گئے تھے ؟ اس سوال کا جواب دیانت سے دینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا ۔

" میں سادھ بیلا جاؤں گی ۔ میں وہاں ہمیشہ سالانہ میلے میں جاتی تھی ۔ خوب میوزک کمپٹیشن ہوتے تھے ۔" سیتا نے دہرایا ۔

شام کے وقت لانچ میں بیٹھ کر وہ دریا عبور کرنے لگے ۔ دور سادھ بیلا کا ٹاپو بڑے جہاز کی طرح لہروں کی وسط میں کھڑا تھا ۔ کنارے پہنچ کر وہ سیڑھیاں چڑھے ۔ کنارے پر بڑا سا پویلین تھا ۔ جس کی دیواروں پر کبیر کی بانیاں منقش تھیں ۔ ٹیلوں پر عمارتیں سنسان پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھیں ۔ چھوٹے بڑے مندر اور شوالے ، لڑکوں کا ہوسٹل ، کلب ہاؤس ، سیتا عرفان کو ساتھ لئے چاروں طرف گھومتی پھری ۔ پارٹی کے دوسرے لوگ تھک کر نیچے ایک بنچ پر بیٹھ چکے تھے ۔

" مجھے بھائی جان پر بڑا ترس آتا ہے ۔" سیتا کو ٹیلے پر ایک اندھیرے مندر کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر نادر نے آہستہ سے کہا ۔

مندروں کی دیواروں پر عجیب عجیب خوف ناک اور مضحکہ خیز شکلوں والی مورتیوں کے نیچے پنسل سے اردو میں طرح طرح کے جملے لکھے ہوئے تھے ۔

" دیوی ماں ۔ میں ہندوستان جا رہا ہوں ۔ مجھ پر اپنی دیا رکھنا ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء "

" بھگوان میں آج تمہارا شرن چھوڑ کر انڈیا بھاگ رہا ہوں ۔ مجھے معاف کر دو ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء "

" ماتا میں تم کو چھوڑ رہا ہوں ۔ اب کبھی پرشاد نہ چڑھا سکوں گا ۔ میرے بچوں پر دیا کرتی رہنا ۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ء "

سیتا اور عرفان ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان دردناک جملوں کو پڑھتے پھرے یہاں تک کہ سورج مہران کی لہروں میں ڈوب گیا ۔

دوسرے ٹیلے پر برگد کے نیچے ایک اور تاریک مندر تھا ۔ اندر گھپ اندھیرے میں ریشمیں

کپڑوں میں ملبوس رادھا کی قدِ آدم مورتی اوندھی پڑی تھی۔ عرفان کو بڑی وحشت ہوئی ـــــ "اب تا باہر چلیں ـــــ" اس نے جلدی سے کہا۔

نیچے اتر کر کلب ہاؤس کی مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے سیتا نے یک لخت اس سے پوچھا ـــــ "یہ جگہ بھوتوں کا شہر نہیں ہے؟ ـــــ میری دادی مجھ سے اکثر کہا کرتی تھیں۔ آج میں نے تیرے لئے بڑا اچھا سپنا دیکھا۔ رات کسی گوسائیں کی نیک آتما گھر کے اوپر سے گزری ہوگی ـــــ یا آج میں نے بڑا بُرا سپنا دیکھا۔ کسی موچی کی بد روح پچھواڑے سے گزری ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض بد روحیں بچوں کی شکل میں نکلتی ہیں اور ان کے ہاتھوں میں چار چار انگلیاں ہوتی ہیں اور بد روحیں ہوا میں چراغوں کی طرح بھی اڑتی ہیں ـــــ ادھر دیکھئے کہیں ہوا میں چراغ جل رہے ہیں؟ سادھ بیلا میری ساری قوم کا قبرستان ہے۔"

وہ اٹھ کر دوسری سیڑھی پر جا بیٹھی "کیسا اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں میری ساری آرزوئیں، سارے آدرش، سارے پچھتاوے اگیا بیتال کی طرح جگمگاتے ہیں ـــــ ابھی میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے ایسا لگا جیسے بھیرو کی سواری کا کتا لکڑ بگے پر سوار ہو کر قبرستانوں کی طرف جانے والی چڑیلیں، ہزاروں برس کی مری ہوئی روحیں ان سب نے مل کر مجھے چاروں اور سے گھیر لیا ہے اور میں بہت جلد مر جاؤں گی۔" اس نے سہم کر عرفان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہمارے یہاں ایک بڑی ڈراؤنی رسم تھی" اس نے چند لمحوں کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ "کہ اگر کوئی آدمی کنوار مر جائے تو اسے سُرخ کپڑوں میں لپیٹ کر شمشان لے جاتے تھے اور زور زور سے ڈھول بجایا جاتا تھا۔ گویا موت کے ساتھ ساتھ اس کا بیاہ بھی ہو گیا۔

"یہ سامنے جو سندھ بہہ رہا ہے، ہمارے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس کے پچھم میں جہاں چاند ڈوبتا ہے موت کا دیس ہے اور ہر سندھی جو مرتا ہے اس گئو ماتا پر جو اس نے زندگی میں برہمنوں کو دان کی ـــــ اس کی دم سے چمٹا ہوا اس دریا پر سے گزر جائے گا۔ بھادوں کی پورن ماشی میں اس کی آتما اس ناؤ پر سوار ہو کر واپس آتی ہے جو اس کے گھر والے پورنماشی سے دو روز پہلے

سندھ دریا میں چھوڑ دیتے تھے۔

"چیت کے مہینے میں بڑا بھاری میلہ ہوتا تھا۔ دراصل ہمارا سب سے بڑا خدا یہی دریا تھا۔ کیوں کہ ریگستان میں بہتا تھا۔ جس طرح پراچین مصر والے نیل کو دیوتا مانتے تھے۔ اسی سکھر میں مچھلی کی پیٹھ پر سوار دریا دیوتا کا مندر تھا۔ اسی کو مسلمان دریا پیر اور خواجہ خضر کہتے تھے۔ جنوبی پنجاب کے ہندو اسے دریا صاحب کہتے تھے ـــــ ذرا سوچئے ـــــ کتنے فیسی نیٹنگ عقیدے تھے۔ ناگ دیوتا کے لئے یہ طے تھا کہ وہ ٹھٹھہ کے آگے سندھ کے کنارے رہتا ہے۔"

اس رات وہ سکھر بیراج پر کھڑی دیر تک سندھ دریا کی کہانی سناتی رہی اور پھر یک لخت خاموش ہو گئی۔ اس وقت عرفان نے دیکھا کہ وہ اس عظیم الشان اور باجبروت بند کی منڈیر پر جھکی بے حد اکیلی، بے حد کمزور اور بے حد اجنبی لگ رہی تھی۔ تہران کی سمندر ایسی موجوں میں گھری۔ میلوں لمبے پل کی روشنیوں کی جھلملاہٹ اور صدیوں تک پھیلے ہوئے صحرا کی وسعت میں کھوئی ہوئی بے چاری لڑکی!

نیچے سندھ چاندنی میں لہریں مار رہا تھا۔ دونوں کناروں پر روہڑی اور سکھر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ پل پر موٹروں اور تانگوں اور بسوں اور سائیکل سواروں کے ریلے گزر رہے تھے۔ نومبر ۵۷ء کی سندھ کی یہ دنیا بہت مختلف تھی۔ اس قدر مختلف کہ اس میں قرولباغ دہلی سے آئی ہوئی سیتا میر چندانی کے لئے کوئی یگانگت نہیں ہو سکتی تھی۔

سندھ سے نکلتے ہوئے نادر نے اس سے کہا: "چلئے بھابی جان آپ کے سندھ کی بھی خوب سیر کر لی۔ عرفان بھائی تو آپ کے پیر اللہ بخش جتالی کی زیارت بھی کر آئے۔"

"سندھ نہ میرا ہے نہ پیر اللہ بخش جتالی کا۔ سندھ کے اصل مالک وہ ہاری ہیں جن کے متعلق سوچنے کی تم نے آج تک ضرورت ہی نہ سمجھی ہوگی۔" سیتا نے کہا۔

"انقلاب زندہ باد۔" نادر نے بشاشت سے نعرہ لگایا۔ عرفان خوش ہوا کہ وہ اپنے جذباتی موڈ پر قابو پا کر دوبارہ نارمل ہو رہی تھی۔ یعنی سیاسی بحثیں کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

بھاولپور میں پنج ند کے جنگل کے اونچے گرد آلود درخت اور پانچ دریاؤں کے سنگم پر برستی ہوئی چاندنی بہت خوش گوار تھی۔ وہاں سے آگے بڑھے تو چاندنی اور زیادہ تیز ہوگئی۔ روشنی میں چمکتی ہوئی سیدھی سڑک پر کار چھوڑکر عرفان نے سیتا سے کہا۔

"صحرا کی خنک، عجیب چاندنی رات، اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے اختر شیرانی کے شعر یاد آرہے ہیں ـــــ ہم اسکول کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے ـــــ صبح بنارس، شام اودھ، شب مالوہ۔ صبح بنارس اور شام اودھ تو سمجھ میں آجاتی تھی۔ مگر یہ پلّے نہیں پڑتا تھا کہ ریگستان کی رات میں سوائے خاک دھول کے کیا رکھا ہوگا۔ اب یہاں آن کر معلوم ہوا۔ تم نے بنارس کی صبح اور اودھ کی شام دیکھ لی؟"

"جی ہاں ـــــ"

چاندنی میں اس کے ہاتھ کا کنگن تیزی سے جگمگا اٹھا۔ وہ کچھ دیر سے چپکی بیٹھی اسے کلائی میں گھما رہی تھی۔

"بڑا خوبصورت کنگن ہے ـــــ اطالوی ہے نا؟" عرفان نے دریافت کیا۔

"جی ہاں ـــــ"

"نیپلز میں خریدا تھا؟"

"جی نہیں کینیڈا میں ـــــ"

"کینیڈا ـــــ! دنیا میں اور بھی ہزاروں ملک ہیں۔ یہ تم کو کینیڈا جانے کی کیا سوجھی تھی؟"

"میرے ماما وہاں تجارت کرتے تھے۔ پارٹیشن کے بعد انھوں نے ڈیڈی کو لکھا کہ آپ کی مالی حالت اب ایسی نہیں کہ سیتا کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکیں۔ اسے میرے پاس بھیج دیجئے۔"

"تم کو بے حد خوشی ہوئی ہوگی۔"

"ظاہر ہے ایک اکیس سالہ بے انتہا حسّاس لڑکی جو شرنارتھی کیمپوں میں گھومنے کے بعد

قرول باغ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہو اور بس میں بیٹھ کر دور راجس کالج پڑھنے جاتی ہو، اچانک اسے یہ بتایا جائے کہ اسے کینیڈا یا امریکہ بھیجا جارہا ہے تو یہ بالکل پریوں کی کہانیوں ایسی بات تھی ــــ ماما کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اور مامی بیس پچیس سال سے امریکہ میں رہ رہے تھے۔ ان کا کاروبار کافی پھیلا ہوا تھا اور سال میں چھ مہینے نیویارک میں رہتے تھے۔ انھوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید کر بھیج دیا اور کولمبیا میں میرا داخلہ کروا دیا۔"

"وہیں جاکر تم سرخوں کی سنگت میں پڑگئیں۔"

وہ ہنسی۔" سرخوں کی سنگت میں تو میں دہلی ہی میں پڑگئی تھی۔ میرے ایک کزن جو لاہور سے شرنارتھی بن کر آئے تھے اردو کے افسانہ نگار تھے، شیام نراین اردرہ۔ آپ نے ان کے افسانے ضرور پڑھے ہوں گے۔ وہ بڑے سخت ریڈ تھے۔ ان کے گھر پر ہفتہ وار ادبی میٹنگ ہوتی تھی اور فسادوں پر افسانے پڑھے جاتے تھے۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر کیا ـــ؟"

"نیویارک میں کیا ہوا ـــ؟"

وہ چپ ہوگئی۔

وہ اس سے جو بات پوچھنا چاہتا تھا اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

"آپ ـــ آپ شاید جمیل کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد اس نے فرماں برداری سے خود ہی کہنا شروع کر دیا گویا اپنے استاذ کے سامنے بیٹھی ہو۔" جمیل سے میں ایک سُرخوں کے جلسے میں ملی تھی۔ اس زمانے میں مک آرتھی ازم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور گرینچ ویلیج میں کافی لفٹ ونگ گروپ تھے جن میں زیادہ تر یہودی نیگرو اور تھوڑے سے ہندوستانی شامل تھے۔ جمیل وہاں اسی سال یو۔این۔او۔ میں ملازم ہوکر انڈیا سے آئے تھے۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر کیا — پھر —!"

"بہت خوب۔ مانتا ہوں کہ تم بھی اہل زبان کہلانے کی مستحق ہوگئی ہو۔"

"ایک فیض آباد والے سے بیاہ جو کیا تھا، اتنی اردو بھی نہ سیکھ جاتی — جمیل سے ملنے کے بعد میں نے اردو میں دلچسپی لینا شروع کی کیوں کہ وہ لٹریچر کے بہت شائق تھے اور ان سے باتیں کرنے کے لئے میرے لئے لازم تھا کہ میں خود کو ان کا ہم مذاق بناؤں اور وہی باتیں سوچوں اور کروں جو ان کو پسند تھیں۔ بعض دفعہ بے ساختہ اودھی میں مجھ سے بات کرنے لگتے۔ جب میں ان کی دیہاتی زبان کا بہت مذاق اڑاتی تو وہ فخریہ کہتے —"جناب میں اور میرے گھر والے وہ زبان بولتے ہیں جس میں تلسی داس جی نے رامائن لکھی تھی —!"

"شادی سے پہلے میں روز شام کو کیمپس سے سیدھی جمیل کے اپارٹمنٹ پر جاتی جہاں ایک سردار جی جو ان کے بہت گہرے دوست تھے باقاعدہ مجھے اردو پڑھاتے۔ مگر ان سردار جی کو افسانہ لکھنے کی جھک تھی لہذا مجھے پہلے گھنٹہ بھر بیٹھ کر ان کے تازہ افسانے سننے پڑتے۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر وہ کہا کرتے کہ بہت جلد کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو ڈاؤن کرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں بے چارے اب کہاں ہیں۔

"اردو مجھے بہت آسانی سے آگئی کیوں کہ اس کا اور سندھی کا اسکرپٹ ایک ہی ہے نا مجھے یاد ہے جمیل نے شادی کے دو سال بعد اپنی بہن کو لکھا تھا کہ میری بیوی اردو میں ایسی طاق ہوگئی ہے کہ تم لوگوں کو طاق پر رکھ دے —!

"— آپ کو معلوم ہے میں بہت کمینی ہوں —"

"اچھا۔ وہ کس طرح — بتاؤ —!"

"جمیل سے جب میں پہلی بار ملی تو ان کے اور میرے ایک مشترکہ دوست نے بتایا کہ یہ فرخندہ باجی کے کزن ہیں۔ یہ معلوم کرکے میں ان سے اور زیادہ خصوصیت سے ملی۔ ورنہ شاید شروع میں ان کو SNUB کر دیتی۔"

"اچھا — آپ شروع میں لوگوں کو SNUB بھی کر دیتی ہیں۔"

"ڈونٹ شَٹ اَپ — بات تو سنئے۔ لیکن میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں فرخندہ باجی یا بلقیس کو اتنی اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیوں انھوں نے مجھے شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ ان کی منگنی کنبے ہی میں ایک کزن سے ہو چکی ہے۔ جو شاید بلقیس کی چچا زاد بہن اور ایک رشتے سے جمیل کی بھانجی ہوتی تھی۔ آپ مسلمانوں میں اس قسم کا گھپلا بہت چلتا ہے، خیر — تو اگر میں ان کو یہ بتلا دیتی کہ میں فرخندہ باجی کو جانتی ہوں تو وہ فوراً دلی خط لکھتے کہ سیتا میر چندانی سے شادی کر رہے ہیں اور اس اطلاع پر فرخندہ باجی اور بلقیس مجھے کتنا کمینہ اور ذلیل سمجھتیں۔ احسان فراموشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ دونوں دلی میں میرا کتنا خیال کرتی تھیں اور اب میں ان کی ایک بہن کے منگیتر کو پھانس رہی تھی۔"

"اپنے لئے ایسے لچر الفاظ مت استعمال کرو۔"

"نہیں بالکل ٹھیک تو کہتی ہوں۔ سب لڑکیاں کسی نہ کسی طریقے سے مردوں کو پھانستی ہیں۔ خالی ان کے MODUS OPERANDI مختلف ہوتے ہیں اور آپ احمقوں نے اس کا نام محبت وغیرہ رکھ چھوڑا ہے۔ ہر لڑکی کا زندگی میں صرف ایک مقصد اور صرف ایک تمنا ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بے وقوف کو پھانس کر اس سے شادی کر لے۔ باقی سب بکواس ہے۔"

"ماشاءاللہ! آپ کے گوناگوں فلسفے قابلِ داد ہیں۔"

"تسلیم —!"

ہوا سے اڑتے ہوئے بالوں کو پیشانی پر سے ہٹانے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں —

"جمیل سے جس روز میں پہلی بار ملی تھی اس روز رات کو اپنے ہوسٹل واپس آکر میں نے اپنی روم میٹ گریس سے کہا تھا: آج مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اب تک میں انسائیکلو پیڈیا برٹینکا تھی۔ اب ایک عورت ہوں —!

"شادی سے پہلے میں جمیل سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتی تھی اور بہت جلد من بھی

جاتی تھی تو ایک دفعہ انھوں نے کہا ـــ تم کبھی شیرنی کی طرح بپھر جاتی ہو کبھی بلّی کے بچے کی طرح خُرخُر کرتی ہو۔ میں نے فوراً کہا تھا۔ لاحول ولا ـــ سب سے پہلے میں ان سے یہی فقرہ سیکھی تھی ـــ ‘اس میں لاحول کی کیا بات ہے؟’ انھوں نے کہا تھا۔

” ای ی ی ک ـــ میں نے منہ بنایا تھا۔ جس پر وہ کہنے لگی کہ تم اس مادّے سے بنی ہو جس سے اولڈ میڈز تخلیق کی جاتی ہیں ـــ

” شادی کے بعد جب میں خفا ہو کر کمرہ اندر سے بند کر لیتی تو وہ ہنس کر کہتے ـــ لو بھئی ہماری سیتا تو اٹواٹی کھٹواٹی لے کوپ بھون میں جالیٹیں ـــ جمیل الفاظ کے بادشاہ تھے۔“

کئی سنگ میل برابر سے گزر گئے۔

” پھر ـــ“ عرفان نے بہت دیر بعد پوچھا ” شادی کیسے ہوئی؟“

” ایک روز ہم کہیں سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں سب وے کے ایک اسٹیشن پر اترتے ہوئے جمیل نے کہا۔“

” سب وے میں ـــ؟“

” جی ہاں شام کے پانچ بجے کے بھیڑ بھڑکے میں۔“

” جو کہ بڑی سخت غیر رومینٹک بات تھی۔“

” بالکل ـــ مگر جمیل کو HUMBUG سے چڑ تھی۔ میں چوں کہ پلیٹ فارم پر ہجوم کے دھکّے سے آگے بڑھ چکی تھی اس لئے انھیں کافی زور سے چلّانا پڑا اور جب میں دوسری ٹرین پر چڑھ رہی تھی تو انھوں نے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا تھا ـــ سیتا ـــ سیتا ـــ مجھ سے شادی کروگی؟ ـــ جواب دو جلدی ـــ وقت بہت کم ہے۔ انھوں نے اس طرح گھڑی دیکھی تھی جیسے ایک دو منٹ کی دیر سے بڑا فرق پڑ جائے گا۔ اور میں نے اس رش میں دروازہ میں چڑھتے ہوئے پلٹ کر زور سے جواب دیا تھا ـــ ہاں ـــ“

” پھر ـــ؟“

"پھر میں نے ماما کو نہیں بتایا۔ اگلے ہفتے ایک ہندوستانی دوست کے گھر پر ہماری شادی ہوئی۔ خوب تصویریں کھنچیں جو شام کے اخباروں میں چھپیں ـــــ 'بیوٹی فل انڈین برائڈ' ـــــ وغیرہ۔ دوستوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ ماما کو میں نے دہشت کے مارے نہیں بتایا۔ حالانکہ میں اس وقت چوبیس سال کی ہو چکی تھی۔ ماما کو اخبار کے ذریعے ہی معلوم ہوا اور ان کو صدمے کے مارے دل کا دورہ پڑ گیا، مرتے مرتے بچے۔ انھیں مجھ سے بے حد محبت تھی۔ انھوں نے مجھی بیٹی بنایا تھا۔ جمیل ان سے ملنے کے لئے ان کے دفتر گئے تو وہ ان سے ملے بھی نہیں۔ مامی حالانکہ پرانی قسم کی ہیں مگر ماما سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ میرا خیال ہے عورتوں میں کومن سنس زیادہ ہوتا ہے۔ پھر بیس برس امریکہ میں رہ کر وہ ذرا روشن خیال بھی ہوگئی ہیں۔ ماما بہت پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ ماما جمیل سے ایک ڈرگ اسٹور میں آکر ملیں اور انھیں بہت پسند کیا۔ جمیل میں یہی تو ایک بات تھی۔ عورتوں کا دل پل کی پل میں موہ لیتے تھے۔ پھر مامی نے میری ممی کو خط لکھا ـــــ سیتا نے بیاہ کر لیا ہے۔ لڑکا اپنی ذات برادری کا نہیں۔ نام جیمل ہے۔ بعد میں مامی مجھ سے ہنس کر کہتی تھیں۔ جمیل اور جیمل میں کیا فرق ہے، محض نقطوں ہی کا تو فرق ہے۔

"چند روز بعد انھوں نے ممی کو بھی راز میں شریک کر لیا اور وہ بھی اس نقطوں کے فرق والی تھیوری کو مان گئیں۔ ڈیڈی سے انھوں نے یہی کہا کہ لڑکا ہے تو ہندو مگر بہت آزاد خیال ہے۔ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ اور آج کل کون ہندو لڑکا مذہب کو مانتا ہے ـــــ ڈیڈی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں بھی دلّی آنے کے بعد شیام بھائی صاحب کی وجہ سے ترقی پسندی کی چرچا رہنے لگی تھی ـــــ"

"یہاں تم نے ثابت کر دیا کہ ابھی پوری طرح اردو والی نہیں بنیں۔ 'چرچا' اردو میں مذکر ہے۔"

"اوہ ـــــ سوری ـــــ چرچا رہنے لگا تھا۔" اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ ادا کیا ـــــ

"چند مہینے بعد میں نے اور جمیل نے اکٹھے ڈیڈی کو خط لکھا اور ساری بات بتادی ـــــ ڈیڈی نے مجھے لکھا ـــــ میں تم سے خفا ضرور ہوں لیکن اگر تم خوش ہو تو ٹھیک ہے۔ جمیل کو انھوں نے لکھا۔

وہی جو سب بیٹیوں کے باپ اپنے دامادوں سے کہتے ہیں ___ میری نازوں کی پالی لڑکی ہے۔
اس کا دل کبھی مت دُکھانا"___ پھر وہ خود ہی ہنسی ___" بے چارے ڈیڈی ___ ڈیڈی
بے حد لٹریری آدمی ہیں۔ انھوں نے جمیل کو اس خط میں رامائن QUOTE کی تھی '۔ جس طرح
ہمالیہ نے گری جا مہیش کو، سمندر نے لکشمی ہری کو سونپی تھی اسی طرح جنک نے سیتا رام کو سونپی
___ اور اسی طرح بیٹے ہم اپنی سیتا تمھیں سونپتے ہیں'___ جمیل خود تلسی داس کے ہم وطن
ٹھہرے ___ یہ پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ عامل لوگ تو کافی آزاد خیال ہوتے ہیں۔ مگر ممی نے اپنے
میکے والوں سے جو کٹر آریہ سماجی ہیں۔ یہ خبر آج تک چھپائے رکھی ہے کہ میں نے ایک مسلمان سے
شادی کر لی ہے۔ وہ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ لڑکا یو۔ پی کا ہندو ہے جے مل نامی۔
"جب راہل پیدا ہوا تو ممی ڈیڈی ماما مامی سبھی بہت خوش ہوئے اور اس بات سے زیادہ خوش
تھے کہ جمیل اتنے آزاد خیال ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا ہندو نام رکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔
" دو سال بعد جمیل کو تین مہینے کی فرلو ملی تو ہم لوگ دلّی آئے۔ فرخندہ باجی، بلقیس وغیرہ
مجھ سے اتنی محبت سے ملیں کہ میں شرمندہ ہو گئی۔ ممی نے اپنے میکے والے اوروں کو پہلے ہی سمجھا دیا
تھا کہ لڑکا لکھنؤ کا باشندہ ہے اسی لئے اتنی اچھی اردو بولتا ہے اور بات بات پر لاحول ولا کہتا
ہے اور خدا کی قسم کھاتا ہے۔ ہم شرنارتھی لوگ یو۔ پی۔ والوں سے پہلے ہی ناخوش تھے۔ اس لئے
خاندان والے اصولاً اس بات پر خفا رہے کہ لڑکی غیر سندھیوں میں کیوں گئی۔ دلّی ہم چند روز ہی
ٹھہرے۔ پھر چاند پور اور تلسی پور چلے گئے۔ میں نے فیض آباد اور لکھنؤ دیکھا۔ کشمیر کی سیر کی، اس
کے بعد واپس امریکہ۔"
" اسی سال ایک لڑکا کلکتے سے ایکٹنگ سیکھنے کے لئے نیویارک آیا۔ اس کا بہت لمبا چوڑا
نام تھا۔ ابوالفصاحت قمر الاسلام چودھری۔"
" قمر الاسلام چودھری ___؟ انگریزی شاعر ___ جو آج کل ہندوستان کا ٹی۔ ایس۔
ایلیٹ کہلا رہا ہے؟"

"جی ہاں ـــ وہی ـــ اس وقت وہ بالکل مشہور نہیں ہوا تھا اور اداکاری کے میدان میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ کئی ترقی پسند بنگالی فلموں میں کام کر چکا تھا اور انگریزی میں نظمیں بہت اچھی لکھ رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گیا۔ جب سے لندن میں اس کی کتاب چھپی ہے، میں نے سنا ہے وہ ANGRY YOUNG MAN بن گیا ہے۔"

"اس کے بعد ـــ"

"اس کے بعد ـــ آپ تو لگتا ہے جیسے کہانی لکھنے بیٹھے ہیں۔"

"فضول کی بات مت کرو ـــ آگے سناؤ۔"

"اس زمانے میں ـــ خیر چھوڑیئے ـــ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ ـــ"

"نہیں ـــ نہیں ـــ ضرور بتاؤ ـــ مجھ سے کوئی بات چھپاؤ نہیں۔"

"آپ میرا سائیکلوجیکل علاج کر رہے ہیں؟ کہیں اس خیال میں بھی نہ رہیئے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ ـــ"

"اچھا خیر ـــ پھر وہی ہوا ـــ نہ جانے کیا ہوا ـــ میں یونیورسٹی میں اپنے کام میں مصروف تھی۔ گھر واپس آکر راحل کی دیکھ بھال کرتی۔ کھانا بناتی۔ دوستوں کا حلقہ بھی وہی تھا۔ ساری باتیں پرانی جیسی تھیں۔ مگر جانے کیوں جمیل آہستہ آہستہ ری ایکشنری بنتے گئے۔ خیر میں اس کو برداشت کر لیتی۔ مگر انھوں نے شراب حد سے زیادہ پینا شروع کر دی۔ جب وہ رات گئے شراب خانوں سے لوٹتے اور کھانا بنا کے ان کے انتظار میں راہ دیکھا کرتی۔ اس وقت قمر میرے پاس بیٹھا رہتا۔"

"اور تم سے ہمدردی کرتا۔ یہ ہمدردی کا ریکٹ بھی خوب ہوتا ہے۔"

"آپ خود اس وقت اس ریکٹ میں شامل نہیں ہیں؟"

عرفان نے غصے سے اسے دیکھا۔ "اللہ کی قسم تم بالکل ناقابلِ برداشت ہو ـــ قصہ سناؤ ـــ"

"جائیے نہیں سناتے ـــ اچھا خیر ـــ" اس نے سنجیدگی سے بات جاری رکھی ـــ

"نہیں ہمدردی کی بات نہیں۔ عرفان، بس جانے کیا ہوا، انسان واقعات اور وقت کے دھارے

میں بہتا چلا جاتا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہونے والا ہے ۔ اصل میں میری اور قمر کی دوستی اس طرح شروع ہوئی کہ ایک روز کیمپس پر قمر نے مجھ سے کہا کہ میں شام کو اس کے اپارٹمنٹ پر آؤں ۔ اس کی ایک دوست جو کالج میں ایلوکیوشن سکھاتی ہے اس سے ملنے آرہی ہے ۔ میں اس سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوں گی ـــــ میرے اور جمیل کے اوقات بالکل مختلف تھے ۔ وہ کھانا یو۔ این ۔ ہی میں کھاتے اور اکثر شام کو گھر آئے بغیر وہیں سے دوستوں کے ساتھ شراب لمانے چلے جاتے ـــــ"

" جمیل دوسری عورتوں سے فلرٹ نہیں کرتے تھے ۔ اس بات کا مجھے آج تک وشواس ہے ۔ وہ مجھ سے ہمیشہ وفادار رہے ۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیا ہوا ـــــ حالاں کہ عام طور پر گھر دوسری عورتوں کی وجہ سے برباد ہوتا ہے ۔"

"یا دوسرے مردوں کی وجہ سے ۔"

" جی ہاں ۔ بہرحال ۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اتنا مکمل اعتماد تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ـــــ" اس کا گلا رندھ گیا۔

" سگریٹ لو ـــــ"

" شکریہ ـــــ" اس نے سگریٹ جلالیا ۔" میں سگریٹ محض اس لئے نہیں پیتی کہ یہ عورت کی سماجی اور اقتصادی آزادی اور مردوں سے ہمسری کا سمبل ہے ۔ بس امریکہ میں کالج میں داخل ہوتے ہی اس کی عادت پڑ گئی تھی ۔ آپ کو برا تو نہیں لگتا ؟"

" نہیں ـــــ نہیں ـــــ" کار کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی ۔ اس کے سگریٹ پینے یا نہ پینے پر میں اعتراض کرنے والا کون ؟ اس نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا ؟

" ہم کیا کہہ رہے تھے ـــــ ؟"

" ہیں ـــــ ؟"

" اوہ معاف کیجئے گا ۔ اتنے برس جمیل کے ساتھ رہ کر مجھے مستقل 'میں' کے بجائے 'ہم' کہنے

کی عادت پڑگئی تھی۔ آپ اودھ والے 'ہم' بولتے ہیں نا — میں بہت احتیاط سے ہم کہتی تھی اور 'ہمارے کے یہاں' اور 'بہت' کے بجائے 'بُہت' — جمیل کے لہجے میں اردو بولنے کی نقل کرتی تھی۔ نمستے کہنا چھوڑ کر باقاعدہ آداب عرض کہتی تھی۔ جس لگن سے میں نے اپنے آپ کو جمیل کے کلچر میں ڈھالنے کی کوشش کی بہت کم کسی لڑکی نے اپنے پتی کے لئے اتنا کچھ کیا ہوگا — میں نے محض اسی لئے شراب بھی زیادہ پینی شروع کر دی تاکہ شام کو ان کے ساتھ ساتھ رہ سکوں۔ مگر جب میں ان کے ساتھ بار میں جاتی تو وہ خفا ہو جاتے کہ کیوں ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی ہو۔

"تلسی پور جب ہم گئے محرم کا زمانہ آگیا۔ جمیل کے گھر پر بڑے زور کا محرم ہوتا تھا۔ میں بھی کالی ساری پہن کر خوب اپنی ساس نندوں کے ساتھ مجلسوں میں شامل ہوئی۔ حالانکہ میں ہر مذہب کو لایعنی سمجھتی ہوں۔ جب مجھے اسلام ہی سے کوئی دلچسپی نہیں تو شیعہ سنی قصّے سے کیا مطلب ہوتا۔ مگر جمیل شیعہ گھرانے کے فرد تھے لہذا مجھے ساری دنیا کے شیعہ بہت اچھے لگنے لگے۔"

"کسی عقل مند آدمی نے بہت ٹھیک کہا ہے۔ عورتیں بے حد بوگس ہوتی ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے —" وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے وہ تلسی پور کا محرم یاد آگیا۔ کیسا خواب کا ایسا وقت گزرا تھا اور وہاں میں نے ایک بات اور عجیب دیکھی کہ وہاں مجلسوں میں اکثر پنجابی اور سندھی شرنارتھی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ فرخندہ باجی نے بتایا کہ تقریباً ساری یو۔پی۔ اسٹیٹ میں یہی ہو رہا ہے آج کل — دیکھئے کلچر پیٹرن کس طرح بدلتے ہیں! — تلسی پور میں ان سیّدوں کے گھر خالی پڑے ہیں جو پاکستان چلے گئے۔ مگر کوئی شرنارتھی ان میں نہیں رہتا کہ سیّدوں کے گھروں کی بے ادبی ہوگی — اس طرف سندھ اور پنجاب میں سیّدوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی نا —"

"یا اللہ —!"

"جی —؟"

"معلومات کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے —!!"

"آپ بات تو کرنے نہیں دیتے ؟"

"میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ جمیل غریب بھی دل میں کیا کہتا ہوگا کہ لڑکی کیا پوری لائبریری کی لائبریری سے شادی کی ہے"۔

"ویری فنی — ہاہا!"

"قصہ جاری رہے —"

"— تو شام کو میں قمر کے ہاں پہنچی۔ اس کے کمرے میں سب بوہیمین جمع تھے۔ عرفان! اس لڑکی جینیفر کرین کو دیکھ کر میری تو سٹی گم ہو گئی۔ اور جب قمر نے سب سے اپنی منگیتر کہہ کر اس کا تعارف کروایا تو ہم لوگ بھونچکے رہ گئے۔ مگر ہم سب انٹلکچوئیل تھے اور انٹلکچوئیل لوگ دنیا سے انوکھی نرالی باتیں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جینیفر کرین انتہا سے زیادہ موٹی اور بے ہنگم تھی اور قمر کافی ہینڈسم لڑکا ہے"۔

"ہاں میں نے انڈین ہائی کمیشن میں اس کا ایک فلم دیکھا ہے"۔

"ہے نا ہینڈسم —؟ اور جینیفر کرین خوفناک حد تک موٹی تھی۔ مگر اس کی شکل بہت پیاری تھی۔ اسی لئے اور زیادہ بے تکی معلوم ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے کسی بڑے سے گلیشیر کے پیچھے سے سر نکالے جل پری جھانک رہی ہو — یہ قمر کو بوسٹن کی کسی تھیٹر ورک شاپ میں ملی تھی۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے نیویارک آ گئی۔ ایکٹنگ کی بڑی قابل استاد سمجھی جاتی تھی۔ اس کی نظمیں "نیو ورلڈ رائٹنگ" اور "ہڈسن ریویو" میں چھپتی تھیں۔ اس چیز کا ہم سب پر بڑا رعب تھا۔ وہ اور جینیفر ایسا عجیب عجیب الخلقت جوڑا معلوم ہوا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے اور بہت خوشیاں منائی گئیں شراب کے دور چلے جینیفر چونکہ خود بوہیمین تھی اس لئے اپنے موٹاپے کا خود مذاق اڑاتی تھی۔ سب کو سامنے بٹھا کر اپنی نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ کرتی تھی اور قمر سے مصر تھی کہ وہ اس کے سامنے کسی اور لڑکی پر عاشق ہو جائے تاکہ وہ حسد اور ٹریجڈی کے جذبات کا تجزیہ کر کے بہتر نظمیں لکھ سکے"۔

"قمر نے اس سے شادی تو نہیں کی مگر وہ قمر ہی کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ ہم لوگوں نے اس بات کا بالکل نوٹس نہیں لیا کیوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ OLD MORALITY کے ..."

"ہاں، ہاں۔ معلوم ہے۔ قصہ مختصر کرو ــــ"

"سال بھر بعد قمر کلکتے واپس چلا گیا۔ چند روز بعد وہ بھی انڈیا گئی اور وہاں پہنچ کر اس نے سچ مچ قمر سے شادی کر لی ــــ مگر اس کے بعد ــــ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

"میں بے وقوفی کے سوالوں کا جواب نہیں دیا کرتا۔ کہانی سنائے جاؤ۔"

"مگر یہ تو بہت لمبی کہانی ہے۔"

نادر نے برابر آکر زور سے ہارن بجایا۔ وہ ملتان پہنچ چکے تھے۔

ملتان شہر میں داخل ہوتے ہوئے نادر نے زور سے نعرہ لگایا :

"اور دیوان شرر ملتانی ــــ مونچھ سفید اور منہ پہ جوانی

اور دیوان ــــ"

"کس قدر بے تکے ہیں آپ واللہ ــــ!" عرفان نے کھڑکی میں سے سر نکال کر داد دی۔ "آگے ارشاد ہو ــــ"

"آگے یاد نہیں ــــ" نادر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

وہ سرکٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ کار سے اترتے ہوئے نادر نے بات جاری رکھی۔ "کمال ہے اس وقت میں سوچ رہا ہوں کہ بچپن کی بعض باتیں ذہن پر کس بری طرح نقش ہو جاتی ہیں۔ عرفان بھائی آپ کچھ روشنی ڈالئے۔ آپ تو بڑے بھاری ماہر نفسیات ہیں۔"

"واقعی ــــ؟" سیتا نے خوش دلی سے منہ بنا کر کہا۔ "جبھی یہ راستے بھر مجھ سے میرے بچپن کی باتیں پوچھ رہے تھے۔"

"میں نے بچپن میں نیرنگ خیال میں ایک نظم پڑھی تھی جو دیویکا رانی کے انگریزی فلم

کرما کے متعلق کسی نے لکھی تھی ۔ بے حد پر لطف ۔ اکبر کے دہلی دربار کی قسم کی ۔ اس کا بس ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے ـــ کچھ اور بھی تھا ـــ بلقیس یاد ہے ؟" نادر نے پوچھا ۔

"جمیل بھیا کو ساری نظم ازبر تھی ۔ ان کے تو ہزاروں شعر نوک زبان پر رہتے ہیں ۔"

پھر وہ سیتا کی طرف دیکھ کر اچانک چپ ہوگئی ۔

نادر نے ہڑبڑا کر موقع کو سنبھالنا چاہا ـــ " اور دیوان شرر ملتانی ـــ اور دیوان شرر ملتانی ۔" اس نے بے وقوفوں کی طرح الاپنا شروع کیا ۔ وہ سب برآمدے میں داخل ہوئے ۔

"کچھ اور چنڈو خانے کے شعر سناؤں بھابی جان ؟" نادر نے گھبراتے ہوئے سرگرمی سے پوچھا ۔

"ضرور سناؤ ـــ" سیتا نے مادرانہ شفقت سے اسے دیکھا ۔ بے چارہ ـــ میرا دیور ۔

"بلقیس ـــ نیشنل اینتھم شروع کرد ـــ" نادر نے پکارا ۔

"کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے ـــ ؟" بلقیس نے بالوں سے گرد جھاڑتے ہوئے اسی تندہی سے دریافت کیا ۔ پھر اس نے مستعدی سے گانا شروع کیا ۔

"کہاں مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے ۔"

"کیا کہا ـــ ؟" نادر نے قوالوں کے انداز میں پوچھا ۔

"کہ بیٹا گر تو کرے ایم ۔ اے ۔ پاس ـــ" بلقیس نے تان لگائی ۔

آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے عرفان نے سیتا سے کہا ۔ "اب ملتان کی ہسٹری شروع ہو جائے ۔"

"شٹ اپ ۔"

"اجی کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی ۔" بلقیس جوش و خروش سے گائے جا رہی تھی

"یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ ـــ تو استعفیٰ ـــ اجی تو استعفیٰ ۔"

اٹیچی کیس میز پر پٹختے ہوئے نادر نے گردن ہلا ہلا کر "نیشنل اینتھم" کے ٹیپ کا بند اٹھایا ۔

"اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا ـــ

اہے وا ــــ فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت ــــ
عرفان محبت ــــ

عرفان ــــ عرفان ــــ عرفان ــــ

دوسرے روز دھوپ بہت تیز تھی اور گرد کے جھکڑ چل رہے تھے اور شمس تبریز کے مقبرے کے برآمدوں میں خوف ناک سرخ آنکھوں والے قلندر اور غلیظ برقعوں میں ملبوس عورتوں اور چرس کے دم لگاتے ہوئے لوفروں اور طوائفوں کا ہجوم تھا۔ ہر شخص خوف ناک تھا۔ لرزہ خیز شکلوں والے، کان میں بڑے بڑے بالے پہنے ہوئے فقیر اور "شاہ دولہ کے چوہے" اور بھانت بھانت کی نوجوان بھکارنیں۔

"یہی آپ کی صوفی ازم کی کلچر ہے۔" عرفان نے طنزیہ آواز میں بیتا سے کہا۔

ملتان سے روانہ ہو کر جب وہ دوبارہ سیدھی سڑک پر آئے تو عرفان نے کہا۔
"شہرزاد! اپنی داستان شروع کرو۔"
"اور کہاں تک سناؤں۔ انجام تو آپ کو معلوم ہے۔"
"نہیں مجھے انجام معلوم نہیں۔ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"
"تاکہ آپ اپنا حکم لگا سکیں۔"
"تاکہ میں اپنا فیصلہ کر سکوں۔"
"افوہ ــــ! آپ غیر اشتراکی لوگ کس قدر رومینٹک ہوتے ہیں! ــــ ہاں تو میں کہاں تک پہنچی تھی؟"
"جینیفر نے کلکتے جا کر قمرے بیاہ کر لیا۔"

"ہاں ــــ اور ابھی ان کے بیاہ کو چھ مہینے ہی گزرے ہوں گے۔ ایک روز میں باورچی خانے میں راہل کے لئے دلیہ تیار کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے کواڑ کھولے۔ سامنے قمر کھڑا تھا۔ ارے میں نے کہا تم کیسے آگئے۔ تم نے کلکتہ اور نیویارک گھر آنگن بنا رکھا ہے ــــ تب اس نے ایک سخت ڈرامائی بات کہی ــــ وہ بڑی گمبھیر بنگالی رومینٹک آواز میں بولا ــــ سیتا میں تمھاری وجہ سے واپس آیا ہوں!!

"پہلے تو سمجھی کہ وہ اپنے کسی ڈرامے کا ڈائیلاگ بول رہا ہے۔ میں نے اسے مذاق میں ٹالنا چاہا۔ مگر وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"بس ــــ اس کے بعد ــــ" وہ آہستہ آہستہ کہتی رہی۔" جانے کس طرح میں ایک اور دھارے میں بہنے لگی۔ جمیل مجھ سے بعض دفعہ تین تین دن تک بات نہ کرتے تھے۔ صبح کو چپ چاپ دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے ــــ بچے کو پیار کیا ــــ وہ اپنے بچے پر عاشق تھے ــــ اور آدھی رات کے بعد گھر لوٹے ــــ پہلے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں جمیل کی بے پروائی کا انتقام لے رہی ہوں مگر اصل بات یہ تھی ــــ کہ ...."

"کہ ــــ؟"

"کہ میں واقعی قمر کی اور کھنچتی ہی چلی گئی ــــ جیسے سانپ کی اور اس کا شکار کھنچا چلا جاتا ہے۔

"ایک روز مجھے بتائے بغیر قمر جمیل کے پاس ان کی بار میں گیا اور ان سے کہنے لگا جمیل مجھے تمھاری بی بی سے عشق ہو گیا ہے ــــ!"

"گڈ گاڈ ــــ نو ــــ!" عرفان نے کہا۔

"جمیل بھی پہلے یہی سمجھے کہ قمر اپنے ڈرامے کا ڈائیلاگ بول رہا ہے مگر جب ساری بات ان کی سمجھ میں آئی تو انھوں نے ......"

"ظاہر ہے۔" عرفان نے اس کی بات کاٹی۔" انھوں نے پہلے قمر کی ٹھکائی کی ہو گی پھر گھر

آکر تمھاری ٹھکائی کی ہوگی اچھی طرح ــــ"

"آپ کو کیسے معلوم ؟" سیتا نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اگر میں جمیل کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔"

"انھوں نے بالکل یہی کیا۔ انھوں نے قمر کے بھی خوب گھونسے لگائے اور گھر آکر مجھے بہت مارا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جمیل ایسے مدھر اور نرم مزاج کے آدمی پر اتنا جنون سوار ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مجھے خوب مارا۔"

"شاباش میرے شیر ــــ" عرفان نے کہا۔ "اور اس وقت جمیل نے یہ بھی کہا ہوگا کہ ابھی ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ ــــ اور رات کا وقت تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی۔"

سیتا ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ "جی ہاں ــــ بالکل یہی ہوا تھا۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"دیکھو سیتا ــــ" عرفان نے رسان سے کہا۔ "تم جو کہتی ہو کہ ہر بات مختلف اور انوکھی اور انوکھی اور گہری ہونی چاہیے ــــ سیتا! ساری زندگی ہزاروں لاکھوں بار دہرائی ہوئی داستان ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ لوگ اسی طرح محبت میں گرفتار ہوں گے۔ ایک دوسرے سے مایوس ہوں گے اسی طرح دل ٹوٹیں گے۔ اسی طرح دکھ اٹھائے جائیں گے۔ تم یا جمیل یا قمر انوکھی عجوبۂ روزگار ہستیاں نہیں ہو۔ تم مجھے سطحی اور غیر جذباتی سمجھتی ہو۔ مگر میں جانتا ہوں کس طرح تم جمیل کے گھر سے (جو تمھارا گھر تھا) نکلی ہوگی۔ کس طرح اس نے راہل تم کو دینے سے انکار کیا ہوگا۔ کس طرح تم مدد مانگنے قمر کے پاس گئی ہوگی۔ اور شاید اس نے بھی تمھیں سہارا دینے سے انکار کیا ہو ــــ ایسی باتیں تم لوگوں کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے تھیں، کیوں کہ تم اور جمیل اور قمر بڑے غیر معمولی دل و دماغ کے لوگ تھے مگر زندگی کی چکی میں سب ایک ساتھ پستے ہیں۔ اس میں انٹلکچوئیل اور غیر انٹلکچوئیل کی کوئی تفریق نہیں ــــ"

وہ سر کھڑکی میں ٹکا کر سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ اب پنجاب کے سرسبز کھیت شروع ہو چکے

تے ۔ سرخ اور سیاہ لہنگے پہنے کسان عورتیں پگڈنڈیوں پر سے گذر رہی تھیں ۔ منٹگمری ضلع سے آگے غروبِ آفتاب کی روشنی میں آسمان بالکل سرخ انگارہ ایسا ہوگیا ۔ سڑک پر مکمل سناٹا تھا ۔ جوہڑوں پر پن ڈبیاں چکر کاٹ رہی تھیں ۔ ایک کسان بڑا سا پگڑ باندھے اور سفید تہمد پہنے بیلوں کی جوڑی ہنکاتا گھر جا رہا تھا ۔ بہت دیر تک گھنٹیوں کی سُریلی آواز شام کے گلزنگ سناٹے میں تیرا کی ۔ سیتا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کھول دیا ۔ ریڈیو سیلون سے لتا کا گیت شروع ہوگیا ۔ جس میں گٹار بڑی جان لیوا آواز میں بج رہا تھا ۔

" بند کردو اسے " عرفان نے جھنجھلا کر کہا ۔

سیتا نے فوراً تعمیل کی اور سوئچ آف کرنے کے بعد پھر سر کھڑکی میں رکھ دیا ۔

" روؤ مت —" عرفان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا ۔

اس نے سسکی بھری اور چھنگلیا سے آنکھ کا کونہ صاف کیا ۔

" میں تمہارے لئے جو کچھ ممکن ہوگا کروں گا سیتا ۔ مگر بتاؤ بھلا میں کر کیا سکتا ہوں ؟ "

" عرفان مجھے میرا راہل چاہئے ۔ اگر آپ کو مجھ سے ذراسی بھی ہمدردی ہے تو جمیل سے میرا بچہ واپس دلوا دیجئے "

" راہل جمیل سے ہلا ہوا ہے ؟ "

" وہ اسے پاگلوں کی طرح چاہتے ہیں ۔ امریکہ سے آنے والے دوستوں نے مجھے بتایا ہے کہ دفتر سے سیدھے گھر آکر بس اسی کو کھلاتے رہتے ہیں ۔ ایک نیگرو بڑھیا اس کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لی ہے ۔ شام کو گھر پر ہی تنہا بیٹھ کر ڈرنک کرتے رہتے ہیں ۔ مگر یہ ان کی دوسری شادی سے پہلے کی بات ہے ۔ اب تو انھوں نے اسے اسکول کے بورڈنگ میں ڈال دیا ہے ۔ کسی طرح مجھے میرا بیٹا واپس دلا دیجئے عرفان —"

" تم نے ان کے گھر والوں سے کہا — ؟ "

" میں ان سے کیا کہہ سکتی ہوں — ؟ "

"قانونی مشورہ کیا؟"

"میں کچھ نہیں کر سکتی ـــــ میں نے فرخندہ باجی سے ذکر کیا تھا۔ وہ بے چاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں۔ انھوں نے جمیل کو ان گنت خط لکھے مگر یہ ایک الجھا ہوا معاملہ ہے کیوں کہ جمیل ان کے بھائی ہیں۔ انھوں نے مجھے طلاق دیئے بغیر دوسری شادی کر لی ـــ ابھی تھوڑے دن ہوئے۔"

"ارے تم نے سول میرج نہیں کی تھی ـــ؟"

"نہیں مسلمان ہو کر میرا نکاح پڑھایا گیا تھا کیوں کہ جمیل کے بابا نے ان سے کہا تھا کہ اگر انھوں نے امریکہ میں کسی غیر مسلم سے سول میرج کی تو وہ ان کو عاق کر دیں گے کیوں کہ وہ مجتہد ہیں۔ جمیل نے مجھ کو یہ بات بتائی۔ میں ان کے عشق میں اس شدت سے مبتلا تھی کہ میں نے جواب دیا۔ کوئی حرج نہیں۔ ان کی یہ شرط پوری کر دیجئے۔ بوڑھے ماں باپ کا دل دکھانے کی کیا ضرورت ہے اور فرق کیا پڑتا ہے مسلم اور غیر مسلم ـــــ میں تو ان جھگڑوں کو مانتی ہی نہیں سرے سے ـــ نکاح نامہ پر میرا اسلامی نام شاید سعیدہ بیگم لکھا گیا ہے۔ میں نے بے حد اصرار کر کے بالکل شرعی مہر لکھوایا جو صرف چند ڈالر بنتا تھا۔ چونکہ جمیل نے مجھے طلاق نہیں دی اس لئے اس اسپینش لڑکی کو بھی مسلمان کر کے ہی بیاہ کیا ہوگا۔

"وہ مجھے طلاق نہ دے کر اچھی طرح سزا دینا چاہتے ہیں۔ قصور سراسر میرا تھا۔ میں نے انھیں دھوکہ دیا تھا۔ میں کئی مہینے تک متواتر دوپہر کو یا رات کو جب بھی موقعہ ملتا قمر کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ اس کے دوستوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کی مسٹریس بن چکی ہوں۔

"لیکن جس وقت جمیل نے مجھے گھر سے نکالا میں بہت دیر باہر بارش میں سائیڈ واک پر کھڑی رہی۔ اگر اس وقت وہ ایک مرتبہ بھی دروازہ کھول کر صرف اتنا کہہ دیتے، سیتا ـــ بارش میں مت بھیگو ـــــ اندر آ جاؤ ـــــ تو میں ـــــ تو میں واپس جا کر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی ـــــ عمر بھر ان کو دھوکہ نہ دیتی۔ مگر دروازہ اسی طرح بند رہا۔ اندر سے راہل کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بیڈ روم کی روشنی جلا کر اسے سلانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کا سایہ

میں نے کھڑکی پر پڑتے دیکھا۔ وہ راہل کی پلنگڑی پر جھکے اسے سلا رہے تھے۔ اسے کمبل اڑھانے کے بعد وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں دیر تک سانس روکے کھڑکی کے اندر دیکھا کی۔ شاید وہ مجھے اندر بلالیں مگر وہ اسی طرح بت بنے اندر بیٹھے رہے اور اس کے بعد روشنی بجھادی۔

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ میں وہاں سے ٹیکسی لے کر قمر کے گھر پہنچی۔ اس وقت اس کے یہاں محفل گرم تھی۔ اس نے مجھے تعجب سے دیکھا —— اتنی بارش میں کیوں آئیں —— کیسی ہو ——؟"

"میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے کہا —— میں نے غلطی کی تھی —— میں تم سے کبھی نہیں نبھا پاؤں گا —— میں بہت غیر ذمہ دار آدمی ہوں۔ واپس جاؤ اور جمیل سے کہو تمھیں معاف کردیں۔ وہ بہت نوبل آدمی ہیں۔ تمھیں ضرور معاف کردیں گے۔ میں بھی ان سے معافی مانگ لوں گا۔ ہم دونوں جذبات کے سیلاب میں بہہ گئے تھے، سیتا رانی —— زندگی کا اصل سکون تمھیں ایک SOLID آدمی ہی کے گھر میں مل سکتا ہے —— وہ جانے کیا کیا ڈائیلاگ بولتا رہا۔ میں باہر آگئی۔

"چند روز میں نے اپنی دوست گریس کے اپارٹمنٹ میں گزارے اور پھر ماں سے کرائے کا روپیہ لے کر دلّی چلی آئی۔ اب سال بھر سے میں دلّی میں ہوں ——"

"تم نے بچے کے لئے جمیل کو لکھا؟ خلع کی کوشش نہیں کرسکتیں ——؟"

"عرفان یہ سب اتنی ڈراؤنی باتیں ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس آدمی کو میں نے اپنی زندگی، اپنا دل، دماغ، روح سبھی کچھ سونپ دیا تھا، ایک روز اس سے علیحدگی حاصل کرنے کے لئے قانونی جھگڑے کرنے پڑیں گے۔ میں جھگڑا زیادہ نہیں بڑھانا چاہتی تھی کیوں کہ ڈیڈی کو سب تفصیل معلوم ہوتی تو ان کا صدمے کے مارے ہارٹ فیل ہوجاتا۔ ایک بیرسٹر دوست کے ذریعے البتہ جمیل کو خط لکھوادیا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس عورت کی اخلاقی حالت

ایسی نہیں کہ ایک معصوم بچے کی پرورش کر سکے ــــ اور عرفان ــــ ان کا یہ پوائنٹ شاید ٹھیک بھی تھا ــــ کم از کم دنیا کی نظروں میں ــــ"

"واٹ ربش ــــ"

لاہور اسٹیشن پر انڈیا جانے والی ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے پلیٹ فارم کی سلاخوں کے ادھر بیٹھے ہوئے کانسٹبل نے کاغذات کی خانہ پری کے لئے سوالات شروع کئے تو ایک خانے پر آکر اس نے پوچھا۔

"مذہب ــــ؟"

سب گڑبڑا گئے ــــ بلقیس فارم مکمل کروا کے ٹرین کے قریب کھڑی رشتے داروں سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ نادر اور عرفان سیتا کے ساتھ پولیس کی میز پر موجود تھے۔ کانسٹبل نے پاسپورٹ کھول کر دوبارہ دیکھا ــــ اور ویزا پر نگاہ دوڑائی ــــ

نام :۔ مسز سیتا جمیل۔

سفر کا مقصد :۔ عزیزوں سے ملنے پاکستان آئی تھیں۔

شوہر کی قومیت :۔ جمہوریۂ ہند کا شہری۔

اس نے پھر ایک مرتبہ سیتا پر نظر ڈالی۔ عجیب سا نام ہے۔ ماتھے پر بندی لگا رکھی ہے۔ پاکستان سے انڈیا جا رہی ہیں۔ خاصا پر اسرار معاملہ تھا۔

"مذہب ــــ؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"یہ سوچنا پڑے گا ــــ چلئے فری تھنکر لکھ دیجئے ــــ" عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔

کانسٹبل نے لکھ دیا۔

"ہاہاہا ــــ" نادر نے قہقہہ لگایا ــــ "بھابی جان فری تھنکر ــــ! سارے شگون بڑی خالہ سے پوچھ پوچھ کر تلسی پور میں کرتی تھیں۔ جب جمیل بھیا بیمار پڑ گئے تھے ــــ ہاہا ــــ"

"ہاہاہا ——" عرفان بھی کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"ہاہاہا ——" سیتا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

(۸)

ٹرین لاہور سے دہلی پہنچ گئی۔ بلقیس اسی روز پالم جاکر بمبئی روانہ ہوئی۔ سیتا قرول باغ واپس پہنچی۔ دوسرے روز ہما سے ملی۔ تیسرے روز سے دفتر جانے لگی۔ اس کی مصروف اور خالی زندگی کے معمولات کا سلسلہ وہیں سے دوبارہ شروع ہو گیا جہاں اسے چھوڑ کر وہ تین ہفتے کے لئے پاکستان گئی تھی۔

بلقیس کے بمبئی سے لوٹنے کے بعد "مدرا راکھشس" شروع ہونے والا تھا اور ماڈرن تھیٹر کے اراکین اس کی تیاریوں میں بے طرح مصروف تھے۔

"فرسٹ نائٹ" کے موقعہ پر سیتا تھیٹر ہال کی سیڑھیوں پر کھڑی چند دوستوں سے باتیں کر رہی تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ ستون کے پیچھے سے ایک آدمی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ صورت کچھ مانوس سی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کون ہے۔ وہ اطمینان سے باتوں میں منہمک رہی۔ جب سب لوگ اندر جانے لگے تب بھی اس آدمی نے ایک دوبار مڑ کر اسے اچٹتی نگاہوں سے دیکھا۔ کھیل کے اختتام پر جب وہ بلقیس کو مبارک باد دینے کے ارادے سے للتا کے ڈریسنگ روم میں گئی۔ اس وقت وہ آدمی وہاں پہلے سے موجود تھا اور چار پانچ لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اپنے انداز سے وہ کوئی بڑی اہم ہستی معلوم ہوتا تھا۔ للتا نے سیتا کا اس سے تعارف کرایا —— "پروجیش کمار چودھری!"

پروجیش کمار چودھری —— ملک کا عظیم مصور —— عالمگیر شہرت کا ایکسپریشنسٹ آرٹسٹ —— جس کی تصویریں اس نے نمائشوں اور رسالوں اور کتابوں میں دیکھی تھیں جس کے متعلق امریکہ کے آرٹ میگزینوں میں مضمون پڑھے تھے —— پروجیش کمار چودھری —— اس سمے

جیتا جاگتا اس کے سامنے موجود تھا ۔۔۔!!

"ہیلو سیتا دیبی ۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا ۔۔۔ "تمرے تو آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اس وقت آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آئیے ۔۔۔ ادھر بیٹھ جائیں۔"

وہ ملبوسات کے انبار کے پاس اسٹولوں پر ٹک گئے۔ پرو جیش بے حد اخلاق سے گفتگو کرتا رہا۔

یہ سوچ کر کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مصوّر سے باتیں کر رہی ہے اسے بڑی عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔

پرو جیش خاصی پختہ عمر کا انسان تھا۔ اس کی شخصیت بہت دلکش تھی اور عورتوں کو موہنے کا فن بھی اسے خوب آتا تھا۔

"بچپن سے میں آپ کا نام سنتی آرہی ہوں۔ کولمبیا میں ہم لوگوں نے آپ کی تصویروں کی نمائش بھی کی تھی۔ 'انڈیا ایوننگ' کے سلسلے میں ایک مرتبہ ...." سیتا نے کہا۔

"اچھا ۔۔۔!" وہ بڑی شفقت اور اپنائیت سے مسکرایا۔

"بچپن سے آپ کا نام سنتی آرہی ہوں ۔۔۔" یہ کیا رسمی اور احمقانہ بات کہہ دی میں نے۔ مگر یہ واقعہ تھا کہ اس وقت وہ یکبارگی بے حد نروس ہوگئی تھی۔ مشہور شخصیتوں سے مرعوب ہونا اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ اور اسے اس کمزوری کا احساس بھی تھا۔ پل کی پل میں ان سب مشہور لوگوں کا جلوس اس کے ذہن میں منڈلایا جن کی وہ لڑکپن سے ہیرو ورشپ کرتی آئی تھی ۔۔۔

"میرا مطلب یہ نہیں کہ ۔۔۔ میں بہت چھوٹی ہوں ۔۔۔" دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر کہا۔

"کیوں نہیں ۔۔۔ تم تو میری بیٹی کے برابر ہوگی۔"

"خیر یہ تو غلط ہے ۔۔۔ بیٹی؟" اس نے ذرا رک کر پوچھا۔

"ہاں اگر میرے کوئی بیٹی ہوتی تو تم سے کوئی چار پانچ سال ہی چھوٹی رہی ہوتی عمر میں!"

سیتا کو معلوم تھا کہ جب سے اپنی ہنگیرین بیوی کو اس نے طلاق دی تھی (جو خود بڑی مشہور

سنگ تراش تھی) پرو جیش کمار چودھری نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ جس طرح گورکی ساری دنیا کو اپنی یونیورسٹی سمجھتا تھا، پروجیش ساری دنیا کی خوبصورت عورتوں کو اپنی حرم سرا کی ممکن کنیزیں تصور کرنے کا قائل تھا اور ایسا سوچنے میں وہ حق بجانب تھا کیوں کہ بہت کم عورتیں اس کی شخصیت کے سحر سے بچ سکتی تھیں۔ پچھلے بیس سال سے اس کے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں اس کے مختلف "پیریڈ" مشہور تھے۔ ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک، جب الہ آباد کی کشمیری نژاد آرٹسٹ پریما بخشی پر عاشق تھا۔ وہ زمانہ اس کی مصوری کا "کشمیر پیریڈ" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے چیکوسلویکین، گجراتی اور راجستھانی "ادوار" جاری رہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک جب نامور ہندی ادیبہ کماری راج رانی مصرا نے اس سے متاثر ہو کر تین ضخیم ناول لکھے وہ پروجیش کمار چودھری کا "گنگا جمنی دور" سمجھا گیا۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک اس کے علیحدہ علیحدہ مرہٹی، فرانسیسی، روسی اور پنجابی پیریڈ شروع ہو کر ختم ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں اس کی ہنگیرین بیوی آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ ادھر کچھ عرصہ سے اس کی جذباتی زندگی کا کوئی پیریڈ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

وہ للتا کے ڈریسنگ روم میں بیٹھا بہت دیر تک سیتا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ سیدھی سادی غیر گنجلک، غیر مابعد الطبیعیاتی باتیں۔

اس کی طبیعت میں کتنا انکسار تھا، کتنی ملائمیت ـــــ سیتا نے حیرت سے سوچا اور جب پروجیش نے کہا کہ ہفتے کی رات کو میرے ساتھ کھانا کھاؤ تو اس نے فوراً منظور کر لیا۔ "قمر اور مادھوری بھی آ رہے ہیں۔" پروجیش نے اضافہ کیا۔

"اوہ ـــــ ہاؤ ونڈر فل ـــــ میں قمر سے بہت زمانے سے نہیں ملی ـــــ" سیتا نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

ہفتے کی شام کو جب وہ پروجیش کمار چودھری کے ہمراہ ریسٹوراں میں داخل ہو رہی تھی تو ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر برآمدے میں کھڑی ہوئی کسی لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا "شوگر ڈیڈی ـــــ!!"

سیتا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شکر ہے کہ پرجیش نے یہ لچر ریمارک نہیں سنا۔ اس نے سوچا۔ وہ دونوں اندر جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہال قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ آرکیسٹرا کوئی تازہ ترین امریکن دھن بجانے میں مصروف تھا۔ لوگ آ کر میزوں پر بیٹھ رہے تھے یا باہر جا رہے تھے۔ پرجیش اپنے کسی شناسا سے بات کرنے کے لئے اٹھ کر دوسری میز پر چلا گیا۔ سیتا اپنی جگہ پر بیٹھی ریسٹوراں کے مجمع کو دیکھتی رہی۔ کیسے کیسے لوگ نئی ہندوستانی اسٹیج کے اداکار۔ اردو کے شاعر اور ادیب — نئے دولت مند سندھی اور پنجابی جو دس سال قبل اسی شہر میں پاکستان سے شرنارتھی بن کر آئے تھے باہر کناٹ سرکس کے راستوں پر موٹروں کا جوار بھاٹا امنڈ رہا تھا۔ مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدے دار، فلم سیمنار کے لئے آئے ہوئے بمبئی اور کلکتے کے مشہور ایکٹر اور ایکٹریس اور ڈائریکٹر — کانگریس اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نیتا — اسی نئی سوسائٹی کے متعلق ریسرچ کر کے اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی — چند منٹ بعد پرجیش میز پر واپس آیا اور نرم نرم آواز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ ان کمبخت بنگالیوں کی آواز میں کتنا جادو ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر میں قمر اور مادھوری آ گئے — مادھوری کی مانگ میں سیندور تھا۔

"مسز چودھری —" پرجیش نے سیتا سے تعارف کرایا۔

"مبارک ہو قمر — !" سیتا نے مسکرا کر کہا۔

"تھینکس — سیتا — ! ہم لوگوں نے اتنی جلدی میں شادی کی ہے کہ سب دوستوں کو خبر بھی نہیں کر سکے — اور تم تو پاکستان چلی گئی تھیں۔"

قمر نے بڑی محبت اور خلوص سے سیتا سے باتیں شروع کیں، جس طرح دو پرانے دوست ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

اسی وقت پرجیش نے ایک روسی دوست کو اپنی میز پر بلا لیا جو اردو میں ریسرچ کرنے کے لئے ماسکو سے علی گڑھ آئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دو اور روسی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں

بھلائی میں انجینیر تھے۔ یہ لوگ "ہندی والے" تھے اور نہایت ثقیل اردو اور نہایت شدھ ہندی بول رہے تھے۔

جوں جوں رات گہری ہوتی گئی پر دجیش کے مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ڈنر کے اختتام پر جب سیتا باہر نکلنے لگی تو قمر اور مادھوری نے اسے بڑی گرمجوشی سے آیندہ اتوار کو اپنے گھر مدعو کیا۔

قمر اور مادھوری کی شادی کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں سندر نگر کے ایک فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ مادھوری سرکاری افسر تھی اور اپنی کار چلاتی تھی۔ اس وجہ سے قمر کو اپنی مالی کامیابی کے باوجود کار خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان دنوں وہ دونوں اپنا گھر انتہائی آرٹسٹک انداز سے سجانے میں جٹے ہوئے تھے اور زیادہ تر شام کو باہر جانے کے بجائے وہ اپنے قریبی دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کر لیتے تھے۔ جہاں سب مل کر کھانا پکانے میں مادھوری کی مدد کرتے۔

اتوار کی شام حسب وعدہ وہ پر دجیش کے ہمراہ قمر کے گھر پہنچی۔ قمر گھنٹی کی آواز سن کر بہت خوش خوش دوڑتا ہوا نیچے استقبال کے لئے آیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے مہمانوں کو سٹنگ روم میں چھوڑا اور ان کی خاطر میں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ پر دجیش نے جو بہت بڑی پینٹنگ قمر کو شادی کے تحفے میں دی تھی اس کے نیچے دیوان پر بیٹھے ہوئے سیتا نے دیکھا کہ کامیابی نے قمر کو ایک حد تک مختلف شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے انداز میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ شاید وہ اب اتنا لپاڑی بھی نہیں رہا تھا۔ مہمانوں سے باتیں کرتے کرتے وہ کبھی کبھی نظریں اٹھا کر بڑے پیار سے مادھوری کو دیکھ لیتا تھا ___ مادھوری نے اس پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ اس کی بوہیمین ازم دور کرنے میں تن دہی سے مصروف تھی۔

قمر الاسلام چودھری اس وقت ایک کامیاب، نامور، دولت مند انسان تھا اور مسرور

اور مطمئن — کامیابی روح کے لئے کتنی عمدہ شے ہے۔

اس وقت وہ بڑی بے نیازی اور بے پروائی سے اپنے برطانوی امریکن پبلشرز کا ذکر کر رہا تھا اور سیتا نے دیکھا کہ اس کی گفتگو میں کہیں پر بھی غرور یا اتراہٹ یا خود ستائی کی جھلک نہیں تھی کامیابی انسان کو انکسار بھی سکھلا دیتی ہے۔ چند روز بعد وہ ماسکو جا رہا تھا۔ اس کی نئی تمثیل مشرقی برلن میں اسٹیج کی جانے والی تھی۔ حال ہی میں اس نے اپنا پہلا ناول مکمل کیا تھا۔ اس ناول کو چھپوانے کی اسے جلدی نہیں تھی کیوں کہ نظموں کے مجموعے کی اشاعت سے اسے اتنی شہرت مل گئی تھی کہ اب اسے مزید شہرت کی چنداں پرواہ نہیں رہی تھی — کامیابی انسان کو قانع بنا دیتی ہے۔

گھنٹی بجی اور ستیش گوپال اور جینیفر کرین اندر آئے۔ جینیفر سیتا کو دیکھتے ہی نعرہ لگا کر اس سے لپٹ گئی — "ڈارلنگ — تم کو اتنی صدیوں بعد دیکھا ہے — کیسی ہو — ؟ میں اب مسز گوپال ہوں — اور تم — ؟"

ستیش گوپال نے مسکرا کر سیتا کو نمستے کیا۔ سیتا اس سے ایک بار بلقیس کے ہاں مل چکی تھی۔ وہ بڑا خوش اخلاق اور ملنسار قسم کا پنجابی لڑکا تھا۔ محکمۂ اطلاعات میں کام کرتا تھا اور اردو میں شعر کہتا تھا۔

"ہندوستان کی روح کے اندر جھانکنے کی تمھاری پروجیکٹ ابھی مکمل نہیں ہوئی — ؟" کھانے کے لئے جاپانی وضع کی لمبی چوکی کے نزدیک کشن پر بیٹھتے ہوئے سیتا نے جینیفر سے دریافت کیا۔

"بنگال کے بعد پنجاب کا جائزہ لینا بے حد ضروری تھا —" جینیفر نے اطمینان سے پھسکڑا مار فرش پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی تو ہندوستان کی بہت ساری اسٹیٹس اور باقی ہیں جینیفر ڈیر —!" سیتا نے کہا۔

"خدا میری مدد کرے —!" جینیفر نے آنکھیں گھما کر چھت کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سیتا جی۔ !" ستیش نے اسے مخاطب کیا۔" قمر صاحب اب مصر ہیں کہ میں ان کے ناول کا اردو ترجمہ کروں ——آپ نے پڑھ لیا اسے ؟"

" ابھی تو نہیں۔"

قمر فوراً مسودے کا فائل نکال لایا۔

" نام تو بڑا اچھا ہے —— بادلوں کا شہر ——" پردجیش نے عنوان پر نظر ڈال کر کہا۔

کھانے کے بعد قمر مسودہ لے کر سیتا کے پاس آ بیٹھا ——" سیتا —— میں کسی روز یہ ناول تمھیں خود پڑھ کر سناؤں گا —— سنو گی —— ؟ تمھیں نیویارک کی وہ طوفانی رات یاد ہے جب برستی بارش میں تم میرے پاس آئی تھیں اور میں کچھ نہ کہہ سکا تھا —— یاد ہے نا —— ؟ میں نے اس طوفانی رات کا باب اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے ——" اس نے آہستہ سے کہا۔

سیتا نے نفرت سے اس پر نظر ڈالی —— تم زندگیوں سے اسی لئے کھیلتے ہو کہ بعد میں ان کے متعلق کامیاب ناول لکھ سکو۔ تم انٹلکچوئیل لوگ دراصل کتنے بڑے فراڈ ہو —— اس نے دل میں کہا۔

جینیفر اب قہوہ بنانے میں مادھوری کی مدد کرنے باورچی خانے میں جا چکی تھی اور وہ دونوں کسی بات پر خوش خوش ہنس رہی تھیں۔ ستیش پھلکاری کے ٹکڑے پر بیٹھا بک کیس کی کتابیں دیکھنے میں مصروف تھا —— اور قمر سے کوئی بات کہہ رہا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے سیتا کا سر چکرا گیا۔ یہ بوہیمین انٹلکچوئیل لوگ شادیوں کے سلسلے میں ایک قسم کی میوزیکل چیرز کھیل رہے تھے اور کتنے ناقابل اعتبار تھے —— کیونکہ خود انھیں اپنی زندگیوں پر اعتبار نہ تھا۔

یک لخت اسے عرفان یاد آیا —— اور اس یاد نے اسے بے حد دل گرفتہ کیا۔ اس لمحے وہ نہ جانے کہاں ہوگا۔ لاہور، پشاور، پنڈی۔ واقعی اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اور عرفان دو مختلف کرّوں پر زندہ تھے۔

عرفان نے اس کی روانگی کے وقت لاہور کے پلیٹ فارم پر نیچی آواز میں کہا تھا۔
"تم مجھے غیر جذباتی سمجھتی ہو۔ مگر اب تمھارے جانے کے بعد میں مستقل یہ شعر پڑھ پڑھ کر آنسو بہایا کروں گا ـــــ آنسو بہانا کیا معنی دھاڑیں مار مار کر روؤں گا ـــــ"
"کون سا شعر ـــــ؟"
"عرض کرتا ہوں ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں"

(۹)

پانچ چھ مہینے گزر گئے ـــــ
ایک روز کافی رات گئے بلقیس کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ جب زور زور سے فون کی گھنٹی بجی ـــــ "سیتا ہو گی۔ وہی اس طرح وقت بے وقت فون کرتی ہے" ـــــ بلقیس نے چھوٹی خالہ سے کہا اور لاؤنج میں جا کر ریسیور اٹھایا۔
اس کا خیال ٹھیک تھا۔ ہماکے گارڈن ہاؤس سے سیتا بول رہی تھی۔
"بلّی ـــــ میں کل صبح کو کولمبو جا رہی ہوں ـــــ"
"کیا کہا ـــــ؟ کوالالمپور ـــــ؟ خدا کے لئے ـــــ کیوں بھئی ـــــ؟"
"کولمبو ـــــ" سیتا کی آواز میں نقاہت تھی۔
"مگر کیوں ـــــ؟"
"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ جمیل وہاں یو۔ این کے کسی کام سے آئے ہوئے ہیں۔"
"تو ـــــ؟"
"میں جا کر آخری بار ان سے پرار تھنا کروں گی کہ راہل مجھے دے دیں۔"

"یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے سیتا ڈیر ـــــ اور تم وہاں کیوں جاؤ ـــــ شاید وہ دلّی بھی آئیں گے۔ اتنے قریب آکر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں ـــــ مگر انھوں نے ہمیں کولمبو آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا ـــــ"

"وہ وہاں صرف ہفتہ بھر کے لئے آئے ہیں اور سیدھے جکارتہ چلے جائیں گے اور پھر واپس نیویارک۔ میں نے یو۔این انفارمیشن آفس سے سب معلوم کرلیا ہے۔"

"اور کولمبو میں تم انھیں پکڑ لوگی۔"

"ہاں ـــــ میں سب انتظام کرلوں گی۔"

"یا اللہ ـــــ! تم روز بروز زیادہ پراسرار ہوتی جارہی ہو سیتا ڈیر ـــــ وہ کس طرح؟ بڑی ری سورس فل ہو بھائی۔"

"وہ تمھارے والے مہاشے بھی آج کل وہیں پر ہیں۔ کسی کانفرنس کے چکر میں گئے ہیں۔"

"میرے والے مہاشے کون؟"

"وہی" ـــــ وہ ذرا جھجکی ـــــ "عرفان ـــــ"

"تم کو کیسے معلوم؟"

"میں ـــــ مجھے انھوں نے لکھا تھا۔"

"اچھا ـــــ آپ ان سے خط وکتابت بھی کرتی رہی ہیں۔ تم واقعی بڑی زبردست DARK HORSE ہو سیتا رانی! اگر کہیں خدانخواستہ میں ان سے شادی کرنے والی ہوتی تو اسی وقت آکر تم سے ڈوئل لڑتی!!"

"چونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم ان سے شادی نہیں کررہیں اس لئے میں نے ان کے خطوں کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔"

"اوہ ـــــ نیور مائنڈ ـــــ میں مذاق کررہی تھی۔ تم کسی قدر بور بھی بنتی جارہی ہو۔

مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو گئی ہے ــــ بیچاری آپ!"

"تو ــــ وہ ــــ عرفان صاحب بڑے سمجھ دار آدمی ہیں۔ میں ان سے کہوں گی کہ جمیل کو سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کریں ــــ تمہارے ناتے ــــ انھوں نے پاکستان میں وعدہ کیا تھا کہ ہر ممکن مدد کریں گے ــــ اس کے علاوہ میں ڈیڑھ سال کام کرتے کرتے تھک گئی ہوں ــــ ذرا سیر بھی کر لوں ــــ"

"تو سیر کرنے کے لئے یہاں جگہیں کم ہیں کشمیر یا کیرل چلی جاؤ۔ اتنی دور جا کر روپیہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے ــــ اور پھر تم نے وہی بیہودہ بات کہی ــــ میرا ناتہ کیسا ــــ؟"

"میرا مطلب یہ کہ وہ تم لوگوں کے فیملی فرینڈ ہیں ــــ"

"دوسری بات یہ کہ جمیل بھیا دوسروں تیسروں کے سمجھانے سے سمجھنے کے بجائے اور زیادہ چڑ جائیں گے۔ تم ان کا غصہ نہیں جانتی ہو ــــ میں ان کی بہن ہوں ــــ میں جانتی ہوں ــــ"

"میں ان کی بیوی ہوں ــــ بلقیس!"

"گڈ گاڈ ــــ سیتا تم کو عقل کی بات بتانا بالکل بے کار ہے۔ سیدھے سبھاؤ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ چونکہ تمہارے لئے پاکستان جا کر عرفان سے ملنا تقریباً ناممکن ہے اور ہم سب کے لئے AWKWARD بھی۔ اس لئے تم محض ان سے ملاقات کرنے کو ملبو جا رہی ہو ــــ تم کس کو بے وقوف بنانا چاہ رہی ہو۔ سیتا ڈیر ــــ؟"

"بلقیس ــــ" سیتا نے غصہ سے کہا ــــ "تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"اس لئے کہ تم دن بہ دن زیادہ احمق ہوتی جا رہی ہو۔ لوگ یہاں تمہارے اسکینڈل بیان کرتے ہیں تو شرم تو ہم لوگوں کو آتی ہے!"

"گڈ نائٹ بلقیس ــــ" سیتا نے غصّے سے لرزتے ہوئے زور سے ریسیور پٹخ دیا۔

"کس سے لڑ رہی تھیں؟" ہما نے بچے کو لوری دیتے ہوئے اپنے کمرے سے بڑی میٹھی آواز میں پوچھا۔

"تم لوگ سب مل کر مجھے کھا جاؤ گے!" سیتا نے زہر بھرے لہجے میں جواب دیا اور بیگ اٹھا کر تیر کی طرح گیلری سے باہر نکل گئی۔

(۱۰)

"وانی اور ونایک کو میرا پرنام۔ جنھوں نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کیے ——— والمیکی، ہنومان، بھوانی اور شنکر، رام اور سیتا کو میرا پرنام ——— ہری ہر ———! جس کے کارن یہ دنیا حقیقی نظر آتی ہے ——— جس طرح رسی کو سانپ سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہری ہر ———! جس کے چرن ہی ایسی ناؤ ہیں جن کے ذریعہ سنسار ——— پیدائش ——— اور موت ——— کے سمندر کو پار کیا جا سکتا ہے ——— وشنو ———! جس کا چہرہ ہاتھی کا ایسا ہے، جو کالی یگ کی بدی کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے ——— مجھ پر اپنا رحم کر ———

"دودھ کے سمندر میں رہنے والے خدا جو نیل کنول کے مانند نیلا ہے ——— مجھ پر رحم کر ——— گرو را ما نند کے قدموں کی دھول سے جو امرت ہے میں اپنی خرد کی آنکھوں کو صاف کروں گا ——— سنتوں کے کرم کپاس کے پھول ایسے ہیں ——— خشک اور سپید اور ملائم ——— میراگ و جو دنیا میں مجسّم پریاگ ہے ——— جہاں سے گنگا بہتی ہے، جو رام کی بھگتی ہے ——— جو دھیان ہے ——— جو سرسوتی کی مانند ہے ——— ہری اور ہر کی کہانی تربینی ایسی ہے ——— دھرم برگد کا مضبوط درخت ہے ——— بدنفس اس دنیا میں کیتو کی طرح تباہ کن ہیں اور کمبھ کرن کی طرح ستاتے ہیں ——— خدا اور بندہ، دولت اور افلاس، بادشاہ اور بھکاری، کاشی[1] اور مگدھ[2]، گنگا اور کرم ناش[3]، مارواڑ اور مالوہ[4]، برہمن اور قصائی ——— ویدوں نے ان کا فرق بتایا ہے ——— میں سفید کاغذ پر وہی لکھتا ہوں جو سچ ہے ——— ملایا کی جو لکڑی اسے بڑا بیش قیمت سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] کاشی نیکی ہے مگدھ بدی۔ [2] گنگا کی ایک شاخ جس کے متعلق عقیدہ ہے کہ اس کو چھونے سے سارے کرم کا ناس ہو جاتا ہے۔ [3] مارواڑ صحرا ہے مالوہ سرسبز۔

اسے محض لکڑی کون سمجھتا ہے؟ شاردا[1] کی بوندیں سیپی میں گرتے ہی پورن ماشی کی رات کو صدف بن جاتی ہیں۔

"اودھ کے مقدس شہر اور مقدس سرجو کو میرا پرنام۔ سیتا اور رام جو اس طرح ہیں جیسے لفظ اور اس کے معنی۔ پانی اور اس کی موج۔ رگھوپتی کی بھکتی برسات کا موسم ہے۔ رام کے بھگت دھان کے اگتے ہوئے پودے ـــــ رام نام کے حروف ساون بھادوں کے مہینے ـــــ پرخلوص محبت وہ جنگل ہے جس میں رام اور سیتا گھومتے ہیں۔ ذہین سوالات کشتیاں ہیں۔ ان کے جواب ماہر ملّاح۔ رام کے الفاظ مضبوط گھاٹ ہیں۔

"منّو بادشاہ جو نسل انسانی کا باپ ہے، اس کا پوتا ہری بھگت تھا۔ منّو اور ان کی بی بی نے راج پاٹ تج کر تپسیا کے لئے جنگلوں کا رخ کیا۔ میاں اور بی بی جنگل میں اس طرح چلتے تھے گویا خرد اور عقیدہ ہمراہ ہوں اور ہم بھگوتے واسودیو کا جپ کرتے وہ جب گومتی کنارے پہنچے اور ہزاروں سال عبادت کرتے رہے تب خداوند عالم نے ان سے کہا مانگو ـــــ تمھاری کیا خواہش ہے ـــــ منو نے کہا ـــــ خداوندا ـــــ میں تجھ ایسا بیٹا چاہتا ہوں ـــــ خداوند عالم نے کہا ـــــ میں لاثانی ہوں ـــــ میرا جیسا دوسرا کوئی نہیں۔ میں یہ البتہ کر سکتا ہوں کہ تیرے بیٹے کے روپ میں دنیا میں آؤں ـــــ"

"اری ہما ـــــ" اماں نے راماین کے صفحے پر انگلی رکھ کر اپنے کمرے سے آواز دی "اری کیا سیتا چلی گئی! اسے کھانا تو کھلا دیا ہوتا۔"

ہما نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ وہ بیڈروم اندر سے بند کئے بچے کو سلانے میں مصروف تھی۔ سارا گارڈن ہاؤس خاموش پڑا تھا۔ شہزاد ابھی نئی دہلی سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں نے عینک لگا کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"مہاراجہ ستیہ کیتو کے بیٹے کے راج میں سارے دیس میں دودھ کی ندیاں بہہ گئیں۔

---

[1] بارش۔

وہ را . بے حد نیک اور بہادر تھا۔ ایک روز وہ وندھیاچل کے پہاڑوں میں ہرن کا شکار کھیلنے گیا اور ایک بے حد حسین جنگلی سور کا پیچھا کرتے کرتے ایک کھوہ میں جا پہنچا جہاں ایک شہزادہ جوگی کے بھیس میں رہتا تھا۔ اسے راجہ نے میدانِ جنگ میں شکست دی تھی اور تب سے وہ اس کا دشمن تھا۔ راجہ اس کو پہچان نہ سکا اور نقلی جوگی نے کہا میرا نام ایک تنو ہے۔ ابتدائے عالم سے میں ایک ہی جسم میں رہتا آیا ہوں کہ تپسیا سے انسان بڑی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ سادہ لوح راجہ نے اس سے کہا۔ گرو! ایسی دعا دو کہ میں اور میرا راج پاٹ امر ہو جائے۔ اس چالاک سنیاسی نے کہا۔ یہ جبھی ممکن ہے جب تم برہمنوں کو تابع کرو۔ برہمنوں کے شراپ سے ساری طاقتیں زیر ہو جاتی ہیں۔ تم میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا روزانہ ایک لاکھ برہمنوں کو کھلاؤ اور وہ تمھارے تابع فرمان ہو جائیں گے۔ جوگی کی مدد سے راجہ نے برہمنوں کی ضیافت کی۔ جیسے ہی برہمنوں نے کھانا شروع کیا آسمان سے آواز آئی۔ خبردار اس بھوجن کو ہاتھ نہ لگانا اس میں برہمن کا ماس پکا ہے ـــــ لهذا برہمنوں نے راجہ کو شراپ دیا کہ اس کا اگلا جنم راکھشش کی صورت میں ہوگا۔ تب آکاش سے آواز آئی۔ برہمنو! تم نے بغیر سوچے سمجھے شراپ دیا ہے۔ راجہ بے قصور ہے۔ مگر برہمنوں کا دیا ہوا شراپ واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اگلی مرتبہ راجہ راکھشس کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے دس سر تھے اور بیس ہاتھ اور وہ بے حد بہادر اور جنگجو تھا۔ اور اس کا نام راون تھا اس کے وزیر نے اس کے چھوٹے سوتیلے بھائی دی بھی شن کے روپ میں جنم لیا جو بڑا وشنو بھگت اور عاقل تھا۔ جب راون نے بڑی تپسیا کی تو برہما نے پوچھا مانگ! تیری کیا خواہش ہے ـــ راون نے کہا ـــ میں چاہتا ہوں کہ صرف انسان یا بندر کے ہاتھ مارا جاؤں ـــ برہما نے کہا ـــ تیری یہ آرزو پوری ہوگی۔"

" سمندر کے وسط میں ایک پہاڑ ہے۔ اس پر برہما نے ایک مضبوط قلعہ بنایا جو اندر کے شہر امراؤتی سے بھی زیادہ خوبصورت تھا اور لنکا کہلاتا تھا۔ اس کے چاروں اور سمندری پانی کی خندق تھی اور اس کی دیواریں سونے کی تھیں جن میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ راون

نے اس لنکا کو اپنی راجدھانی بنایا اور اس میں اطمینان سے رہنے لگا۔ عشرت، دولت، بیٹے، افواج، فتح و نصرت، طاقت، ذہانت سب کچھ اس کا تھا۔ اس کا بھائی کمبھ کرن جو بے حد پیٹو تھا، سال میں چھ مہینے سوتا تھا۔

"اپنی طاقت کے نشے میں آکر ایک روز راون نے ساری کائنات کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ساری دنیا اس کی محکوم ہو گئی — نیکی اس جہان سے رخصت ہو گئی۔

"تب خداوند عالم نے کہا — میں نے مدتیں گزریں کیشیپ اور آدتی سے ان کی ایک آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میں سورج بنسی خاندان میں پیدا ہوتا ہوں اور میرا نام رام ہوگا۔"

"اودھ کے شہر میں رگھو بنشی راجہ دسرتھ حکومت کرتا تھا جو ویدوں کا ماہر اور نیک اور عقل مند اور وشنو کا بندہ تھا۔"

باہر موٹر آکر رکی۔ شہزاد آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا اندر آیا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ اس کے بیڈ روم میں بچھے ہوئے قالین میں ڈوب گئی۔

اَمّاں نے کئی ورق الٹے اور آگے پڑھنا شروع کیا —

"اور جب دونوں شہزادے اس خوبصورت شہر کے باہر پہنچے جہاں دریا کے کنارے اور بہت سے شہزادوں نے خیمے لگا رکھے تھے۔ تب وشوامتر نے کہا رکھو! ہم یہاں ٹھہریں گے۔

"جب متھلا کے راجہ کو معلوم ہوا کہ رشی وشوامتر تشریف لائے ہیں تو وہ خود ان سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے پوچھا — اے مہاراج — بتلائیے — یہ دونوں خوبصورت لڑکے جن میں سے ایک سانولا ہے اور ایک گورا — آپ کے ساتھ کون ہیں — کیا ذات مطلق جسے ویدوں میں "یہ نہیں ہے" کہا گیا ہے دوئی کے روپ میں ظاہر ہو گئی ہے؟ اور وشوامتر نے بتایا کہ یہ دونوں عاقل اور بہادر بھائی رام اور لکشمن ہیں۔

"اور شہر کی عورتیں جو کھڑکیوں کی جالیوں سے جھانک رہی تھیں انھوں نے ایک —

دوسرے سے کہا ـــــ وہ سانولے بدن اور کنول نینوں والا جس نے تیر کمان اٹھایا ہوا ہے کوشلیا کا بیٹا رام ہے اور گوری رنگت والا جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اس کا وفادار بھائی اور سمترا کا بیٹا لکشمن ہے ــــ اور یہ دونوں یہاں دھنش توڑنے کے مقابلے کا نظارہ کرنے آئے ہیں۔

"ـــــ اور سیتا گوری کی پوجا کے لئے باغ میں آئیں اور رام نے ان کی پائل کی جھنکار پر نظریں اٹھائیں۔ اور ان کی نظریں سیتا کے چہرے پر ایسے جمیں جیسے چاند چکور کو دیکھتا ہے اور لکشمن نے کہا ــــ بھیا ــــ یہ جنک کی بیٹی سیتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے دھنش توڑنے کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔"

"درختوں کے کنج سے سیتا نے رام پر نگاہ ڈالی اور ان کی نظریں رام پر ایسے جمیں جیسے چکور خزاں کے چاند کو دیکھتا ہے ــــ انھوں نے رام کو آنکھوں کے ذریعہ دل میں داخل کر کے پلکوں کے کواڑ بند کر لئے۔

جب رام سیتا کو بیاہ کر ایودھیا لوٹے ــــ"

"اماں ــــ" ہما نے دروازے میں آکر کہا ــــ "آنند روئے جا رہا ہے ذرا آکر چپ کرائیے ــــ"

"لڑکی تو مجھے کبھی چین سے بیٹھ کر پاٹھ نہیں کرنے دیتی ــــ" کتاب ہاتھ میں لئے بڑبڑاتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں گئیں اور آنند کو گودی میں لٹا کر دوسرے گھٹنے پر کتاب رکھ لی اور ہلکورے دے کر اسے سلاتے ہوئے بولیں ــــ "لے تو بھی سُن ــــ رام نام سُن کر دیکھوں تو تو کیسے اپنی ماں کو تنگ کرتا ہے ــــ" پھر انھوں نے مزید چوپائیاں پڑھنا شروع کیں

"ـــــ دسرتھ کی رغبت ایک جنگل کی مانند تھی جس میں راحت مسرور پرندوں کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اس جنگل میں بھیل شکارن ــــ کیکئی ــــ اپنے الفاظ کے شکرے چھوڑنے والی

تھی ـــ اس نے کہا ـــ مہاراج ـــ ایک مرتبہ آپ نے مجھے وچن دیا تھا کہ میں جو بھی فرمائش کروں گی آپ اسے پوری کریں گے ـــ سورج بنسی راجہ اپنے قول سے نہیں پھرا کرتے ـــ اب میری ایک آرزو پوری کیجئے ـــ رام کے بجائے میرے بیٹے بھرت کو گدی پر بٹھائیے اور رام کو چودہ برس کی بن باس دیجئے ـــ"

بچے نے زور سے اپنا ننا سا ہاتھ مارا اور کتاب پٹ سے بند ہو کر نیچے گر پڑی۔ اماں نے اسے اٹھا کر پڑھنا جاری رکھا۔

"ـــ رام اور لکشمن کے درمیان سیتا اس طرح چل رہی تھی جیسے ذات مطلق اور انسانی روح کے درمیان فریبِ نظر ـــ گھنے جنگلوں میں رشیوں کے ہجوم رام کے ساتھ ساتھ چلے اور چترکوٹ پہنچ کر مندکینی ندی کے کنارے رام نے قیام کیا۔"

"اماں ـــ بشن سنگھ پوچھ رہا ہے صبح کو کھانا کیا بنے گا ـــ؟" ادما جی جی نے ڈائننگ روم میں سے آواز دی۔ بچہ اب سو چکا تھا۔ اسے ٹوکری میں لٹال کر وہ بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آکر انھوں نے جھانک کر نظر ڈالی اور اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ ہما اب غسل خانے سے نکل کر چہرے پر کولڈ کریم لگانے کے بعد سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ اسے پھر اماں کی آواز سنائی دی۔

"ہما ـــ ادھر آ ـــ"

"جی اماں ـــ اس نے گیلری میں آکر پوچھا۔ اماں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پلنگ پر لیٹ چکی تھیں ـــ

"ابھی پڑ کر مت سو ـــ" انھوں نے کہا۔

"جی اماں ـــ"

"میری آنکھوں میں درد ہو رہا ہے ـــ تو تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر مجھے رام نام سنا ـــ"

"بہت اچھا اماں ـــــ" ہما نے ایک لمبا سانس بھرا اور کرسی کھینچ کر فرمانبرداری سے بیٹھ گئی ـــــ "کہاں سے پڑھوں ـــــ؟"

"کہیں سے پڑھ ـــــ بن باس کا قصہ پڑھ!"

"اچھا ـــــ"

"کالی گھٹا کے مانند سانولے سلونے رام گوداوری کے کنارے پہنچے تو لکشمن نے کہا۔ بھیا ـــــ مجھے گیان اور بے تعلقی اور فریب مجاز کے متعلق بتلایئے ـــــ"

"اور آگے چلو!"

"افوہ ـــــ اچھا ـــــ انسویا نے کہا ـــــ یہ پڑھوں ـــــ؟"

"ہاں یہ پڑھو ـــــ" اماں نے آنکھیں بند کر آرام سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"ـــــ انسویا نے کہا ـــــ سنو راجکماری ـــــ ماں اور باپ اور بھائی سب اپنے دوست اور مددگار ہیں مگر جو مسرت ان سے حاصل ہوتی ہے محدود ہے ـــــ شوہر کی رفاقت کی مسرت اتھاہ ہے۔ وہ عورت کمینی ہے جو اپنے شوہر کی عزت نہ کرے۔ ہمت، اصول، دوست اور بیوی ـــــ یہ چار چیزیں آڑے وقت پر پرکھی جاتی ہیں۔ شوہر اگر بوڑھا ہو یا بیمار یا احمق یا اندھا یا بدمزاج یا سخت مصیبت میں مبتلا ـــــ اگر اس سے بی بی نے اس کی عزت و توقیر نہ کی تو وہ نرکھ میں جلے گی۔ ویدوں اور پرانوں کے مطابق عورت کے چار درجے ہیں۔ بہترین عورت وہ ہے جو سمجھے کہ اس کے شوہر کے علاوہ دنیا میں اور کوئی مرد نہیں۔ دوسرے درجے پر وہ عورت ہے جو شوہر کے علاوہ سارے مردوں کو باپ اور بھائی اور بیٹا سمجھے ـــــ وہ عورت سب سے کمتر ہے جو محض موقعے کے فقدان کی وجہ سے پاک دامن رہے ـــــ"

"اور آگے چلو ـــــ"

"ـــــ ایک روز راون کی بہن سورپنکھا گوداوری کے کنارے آئی اور اسے دونوں شہزادے نظر آئے۔ اے گرڑ! عورت خوبصورت مرد کو دیکھ کر اس طرح پگھل جاتی ہے جیسے

سورج کے سامنے رتیلا پتھر ـــــ"

"آگے چلو ـــــ"

"ـــــ جب لکشمن نے طیش میں آکر سورپنکھا کی ناک کاٹ لی ـــــ یہاں سے سناؤں ؟"

"ہوں ـــــ"

"ـــــ تو وہ روتی ہوئی راکھشسوں کے پاس پہنچی اور ان کا سردار دھوم کیتو چودہ ہزار راکھشسوں کی فوج لے کر رام اور لکشمن پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔"

"اس سمے جنگل میں گیدڑ چلاتے تھے ـــــ بھوتوں، بدروحوں اور مسانوں نے کھوپڑیاں جمع کیں ـــــ خونخوار عفریتوں نے ان کھوپڑیوں کے ڈھول بجائے اور چڑیلیں ان کی تال پر ناچیں۔ سورپنکھا نے اپنے بھائی سے کہا۔"

"آگے چلو ـــــ جہاں سیتا ہرن ہوتا ہے ـــــ"

"ـــــ اور ست ونتی سیتا نے دیکھا کہ ایک سنہرا ہرن جنگل میں بھاگا جارہا ہے۔ ناتھ! انھوں نے کہا ـــــ اس کا شکار کرکے اس کی کھال میرے لئے لا دیجئے ـــــ رگھوپتی سمجھ گئے کہ یہ ہرن کون ہے۔ اور دیوتاؤں کا مقصد پورا کرنے کے لئے انھوں نے تیر کمان اٹھائی۔ رگھوپتی نے لکشمن سے کہا ـــــ بھائی ـــــ جنگل میں راکھشس گھوم رہے ہیں۔ دھیان اور فہم اور طاقت کے ذریعے سیتا کی حفاظت کرتے رہنا ـــــ رام کو دیکھتے ہی ہرن تیزی سے بھاگا اور رام نے اس کا پیچھا کیا ـــــ اور بہت دور نکل گئے ـــــ"

"جب ہرن رام کے تیر سے گھائل ہوکر گرا تو اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری ـــــ اور چیخ کی آواز سنتے ہی سیتا نے گھبرا کر لکشمن سے کہا ـــــ بھیا ـــــ تمھارے بھائی پر کوئی آفت آئی ہے ـــــ وہ جس کی ابرو کے اشارے سے ساری کائنات تخلیق ہوئی اس وقت خود خطرے میں گھرا ہے ـــــ فوراً جاؤ ـــــ اور لکشمن سراسیمہ ہوکر رام کو ڈھونڈنے چلے گئے۔"

"اور راون جوگی کے بھیس میں سیتا کی کٹی پر پہنچا اور انھیں زبردستی اٹھا کرلے چلا۔

سیتا چیخیں ــــ رگھورائے ــ رگھورائے ــــ رگھورائے ــــ"

ہما کو اب نیند آرہی تھی ۔ اس نے آنکھیں مل کر اماں کو دیکھا کہ شاید وہ بھی سوچکی ہوں مگر وہ اسی طرح بڑی شردھا سے آنکھیں نیم وا کئے لیٹی پاؤں ہلا رہی تھیں ۔ یہ چوپائیاں وہ ہزاروں مرتبہ پڑھ چکی تھیں مگر جنے یہ کیا مصیبت تھی ــــ اس نے جمائی لے کر پھر پڑھنا شروع کیا ۔

" راون نے سیتا کو رتھ پر بٹھالا اور تیزی سے اڑگیا ۔ سیتا شکاری کے چنگل میں پھنسی ہوئی خوفزدہ ہرنی کی طرح چیختی چلاتی آسمان پر سے گزری ۔ جب اس نے نیچے ایک پہاڑی پر بندروں کو بیٹھے دیکھا تو ہری کا نام لے کر اپنا دوپٹہ ان کی طرف پھینکا ۔ راون نے اسے اپنی راجدھانی میں لے جاکر اشوک کے جنگل میں قید کر دیا ۔"

وہ پھر جمائی لینے کے لئے رکی اور پر امید نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی کہ شاید اب وہ بس کرنے کو کہیں ۔

" اب ہنومان جی والی چوپائیاں پڑھو ــــ" انھوں نے آنکھیں بند کئے کئے اطمینان سے فرمائش کی ۔

" اور کے اماں" ہما نے ٹھنڈا سانس لے کر جواب دیا ۔

"ــــ اور بندروں نے لنکا تک پہنچنے کے لئے پل بنایا اور رگھوراج نے اس پر کھڑے ہوکر سمندر پر نگاہ کی اور مگرمچھ اور سمندر کی ساری مخلوق ان کے درشن کے لئے باہر نکل آئی اور پل پر اس قدر بھیڑ لگی کہ بندروں کو ہوا میں اڑنا پڑا ۔

" بندروں نے ساحل پر پہنچ کر خوب پھل کھائے ــــ" (ہاؤ سویٹ ــــ! ہما ہنس پڑی ــــ ہُوں ــــ اماں نے غصہ سے ہنکارا بھرا ــــ) اور پہاڑوں کے ٹکڑے توڑ توڑ کر لنکا کی طرف پھینکے ۔

" سامنے لنکا تھی ــــ سونے کے شہر ــــ چوک اور بازار ــــ اور گلیاں ــــ اور ہاتھی اور گھوڑے ــــ اور رتھ اور راکھشسوں کی فوجیں ــــ اور جنگل اور پھول بن ۔

اور جھیلیں اور تالاب۔ اور انسانوں اور ناگوں اور گندھردوں کی خوبصورت بیٹیاں۔ ہنومان نے اس جگہ کی مضبوط قلعہ بندیاں دیکھ کر نرسنگھ پر دھیان لگایا اور مچھر کی صورت بن کر لنکا میں داخل ہوئے اور ایک راکھشش نے جس کا نام لنکنی تھا للکار کر کہا ـــ تم میری بغیر اجازت یہاں کیسے آئے؟ ـــ اور ہنومان نے اسے ایک گھونسہ رسید کیا اور ـــ"

(۱۱)

بَینگ ـــ بَینگ ـــ بَینگ ـــ انجنوں کا شور کم ہوا اور ہوائی جہاز بڑی سہولت سے رتمالانا ایرپورٹ پر اتر گیا۔ مدراس سے یہاں تک گہرے بادلوں کی وجہ سے پرواز بہت خراب رہی تھی۔ وہ جہاز سے اتر کر سیدھی انڈین ایرلائنز کے کاؤنٹر پر گئی اور کولمبو پلان کے دفتر فون کیا ـــ "جی نہیں۔ یہاں تو کوئی مسٹر عرفان نہیں ہیں ـــ شاید کسی دوسری عمارت میں ہوں ـــ ٹھہریئے معلوم کر کے بتاتا ہوں ـــ آپ گھنٹہ بھر بعد دوبارہ ـــ"

اس کا دل دھک سے رہ گیا ـــ اب کیا ہوگا ـــ؟

"یو۔ این کا دفتر کدھر ہے؟" اس نے ٹیکسی والے سے دریافت کیا۔

ڈرائیور نے ٹیکسی ایک عمارت کے سامنے لے جا کر کھڑی کر دی ـــ اس کے اندر وہ بیٹھا ہوگا ـــ جمیل ـــ اپنے ڈیسک پر اپنے کام میں مصروف ہوگا۔ اگر وہ اس وقت باہر نکل آئے ـــ تو کیا ہو؟ ـــ یک لخت اسے بے حد ڈر لگا اور سیدھی ماؤنٹ لیونیا ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس روز سارے کولمبو میں بڑی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے سرخ پھولوں والے گھنے درخت اور ناریل کے جھنڈ اور سمندر کی لہریں ـــ ہر چیز جگمگا رہی تھی۔ ماؤنٹ لیونیا کے نیچے ساحل پر انگریز اور امریکن آفتابی غسل میں مصروف تھے فضا پر عجیب سی کاہلی چھائی ہوئی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر کچھ دیر بعد اس نے دریچہ کھولا۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سیاہ فام سنہالی آیائیں چند انگریز بچوں کو ریت پر کھلانے میں مصروف تھیں۔ ایک سنہالی عورت بالوں میں پھول اڑسے، مونگے کے ہار بیچتی دریچے کے نیچے سے گزری ـــــ
"بیڈز میڈم؟ ـــــ ویری نائس بیڈز ـــــ" اس نے اوپر دیکھ کر کہا۔
اس نے دریچہ بند کر دیا اور سنگھار میز کے سامنے آکر بیٹھ گئی ـــــ اب کیا ہوگا ـــــ؟
گھنٹے بھر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور سفید سیرونگ میں ملبوس بیرے نے اندر آکر ایک کارڈ پیش کیا ـــــ "عرفان احمد کاظمی ـــــ"۔
"اوہ !! ـــــ تھینک یو ـــــ !!!" بوڑھا سنہالی بیرا بڑی شفقت سے مسکرایا ـــــ وہ جلدی جلدی بال درست کر کے نیچے چلی گئی۔
عرفان ٹیرس پر رنگین چھتری کے نیچے بیٹھا کسی سنہالی سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا۔
"مسٹر رتن سنگھ جے سوریہ ـــــ مسز ـــــ ار ـــــ ڈاکٹر میر چندانی ـــــ" اس نے سنہالی سے تعارف کرایا۔
"مسٹر جے سوریہ یہاں کے ایک بڑے اہم سنہالی اخبار کے ایڈیٹر اور میرے بہت پرانے دوست ہیں۔"
سیتا نے مسکرا کر ہاتھ جوڑے۔ تینوں بیٹھ گئے ـــــ سیتا نے ذرا بے چینی سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ادھیڑ عمر کے جے سوریہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ عرفان سے اپنی بات ختم کرنے کے بعد انھوں نے سیتا کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور اجازت چاہ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

عرفان نے پہلو بدل کر سگریٹ جلایا۔
"تو آپ تشریف لے آئیں ـــــ"

"جی ہاں۔"

اتنے دنوں بعد یہ بڑی UNCEREMONIOUS سی ملاقات تھی۔

"تم نے یہ لکھا ہی نہیں کہ اچانک یہاں کیوں نازل ہو رہی ہو۔ میں سمجھا تم بھی کسی سرکاری کام کے لئے آنے والی ہو۔ کولمبو انٹرنیشنل کانفرنسوں کا شہر ہے۔"

"خط میں پوری داستان کیا لکھتی۔ آپ کو خود ہی اچھی طرح معلوم ہے۔"

"واقعہ یہ ہے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے تمھارے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم۔"

اس کا دل ڈوب سا گیا ــــ دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر پوچھا ــــ "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"میں بھی یہیں ٹھہرا ہوں ــــ تم نے یہ بھی نہیں لکھا تھا کہ کس روز پہنچ رہی ہو۔ بہرحال تمھیں تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔"

"جمیل سے ملاقات ہوئی؟"

"جمیل یہیں ہیں ــــ؟ تم ان سے ملنے آئی ہو ــــ؟ بڑی سخت DARK HORSE ہو ــــ!" اس نے ایش ٹرے میں سگرٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً وہ بڑا مایوس نظر آیا۔

"آپ کا کیا خیال تھا۔ میں اتنی دور چل کر محض آپ کے درشن کے لئے آئی ہوں۔

YOU HAVE HOPES! " اس نے ہنس کر جواب دیا۔

یک لخت ماحول کا کھنچاؤ دور ہو گیا ــــ وہ بھی خوب ہنسا ــــ ہاہاہا ــــ

"آپ ان سے جا کر ملئے ــــ آج ــــ ابھی ــــ فوراً ــــ یو۔این والوں سے معلوم کر لیجئے کہ وہ کہاں ٹھہرے ہیں ــــ"

"کیا پتہ وہ بھی یہیں ہوں ــــ"

وہ سفید پڑ گئی۔ پھر اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "آپ ان سے راحل کے متعلق بات کیجئے اور ان سے کہئے کہ ایک بار مجھ سے مل لیں ــــ صرف ایک بار ــــ"

وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے چند لمحوں تک کوٹ کی جیب میں سگریٹ کیس تلاش کرنے کے بعد کہنے لگا "میں ان سے آج تک نہیں ملا ہوں سیتا — میری ان سے اتنی بے تکلفی کیسے ہو سکتی ہے کہ میں چھوٹتے ہی ان کے خالص نجی معاملے میں اس طرح جا کر ٹانگ اڑاؤں"

"مگر آپ نے کہا تھا۔۔۔"

"ہاں — ہاں — بالکل ٹھیک ہے — میں ضرور ان سے ملوں گا۔ ابھی کوئی ترکیب سوچتے ہیں۔ تم اس وقت تو ذرا ری لیکس کرو — سگریٹ لو —"

"میں کس طرح ری لیکس کر سکتی ہوں"

"یہ بھی ٹھیک ہے" وہ پھر منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔

سامنے سے خوبصورت ڈچ برگر لڑکیوں کا ایک پرا گزرا۔ ان میں سے ایک لڑکی نیلا فراک اور نیلی پکچر ہیٹ اور سفید دستانوں میں بالکل گینز برو کی پینٹنگ معلوم ہو رہی تھی — ہندوستانی ساریوں میں ملبوس سنہالی اور تامل عورتیں، قیمتی سوٹوں میں ملبوس سیاہ فام مرد، سنجیدہ شکلوں والے انگریز، بے فکرے امریکن ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ ٹیرس کے نیچے سمندر شور کر رہا تھا۔

"شام کو کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں —"

"جے سوریہ کی پارٹی میں چلو — گال فیس"

"میں یہاں سوشل ملاقاتوں کے لئے نہیں آئی"

"تو کیا جنگل میں بیٹھ کر تپسیا کرو گی؟"

یہ آدمی بھی کیا بوگس تھا — اب کیا ہوگا — اب کیا ہوگا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"جہنم کا ——"

"ارے رے رے —— خفا ہو گئیں —— اتنی جلدی ؟"

اب کیا یہ بھی جمیل کا شیرنی اور بلی کے بچے والا جملہ دہرانے والا تھا۔

او مائی گاڈ ——

وہ ریلنگ پر جھک کر ساحل کی طرف دیکھنے لگی "آپ یہاں سے کب واپس جا رہے ہیں ؟"

اس نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کیا۔

"دس پندرہ دن ! در لگیں گے "

"واپس لاہور ؟"

"نہیں —— میرا تبادلہ پیرس ہو گیا ہے۔ کراچی پہنچ کر اگلے مہینے پیرس روانہ ہو جاؤں گا ——"

"ہاؤ ونڈرفل —— لکی یو —— !"

"پیرس جانا کوئی خاص ونڈرفل بات تو نہیں —— اور 'لکی' تو میں زندگی میں آج تک کسی سلسلے میں نہیں رہا "

"وہاں کتنے عرصے رہئے گا —— ؟"

"پتہ نہیں —— فی الحال تو دو سال کے لئے جانا ہے —— اچھا اگر تم ڈنر پر نہیں چل رہی ہو تو مجھے اجازت دو۔ مجھے ابھی ذرا کانفرنس کے چند لوگوں سے بھی ملنا ہے۔ میں جلد از جلد تمھارے پتی دیو کو پکڑنے کی فکر کرتا ہوں۔ اور پھر انھیں کلٹی ویٹ کرنے کی کوشش کروں گا تمھاری خاطر ——"

"لوگوں کو کلٹی ویٹ کرنا تو آپ کو خوب آتا ہے۔ کوشش کی کیا ضرورت ہے —" سیتا نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

وہ ہنسا — "اچھا اب خفا مت ہو — بہ ہیر! اپ کل سویرے ہی سے کانفرنس کا اجلاس ہے ۔ اگر موقعہ ملا تو فون کروں گا ۔ تم بریکفاسٹ کے لئے نیچے آؤ گی ؟"

"جی نہیں ۔"

"اچھا تو میں کانفرنس میں جانے سے پہلے فون کروں گا — گڈ نائٹ —"

"گڈ نائٹ —"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹیرس سے اتر کر باہر چلا گیا ۔ وہ ریلنگ پہ سر رکھ کر سمندر کو دیکھتی رہی جہاں سورج ڈوب رہا تھا اور کنارے پر بکینی میں ملبوس ایک انگریز عورت قہقہے لگاتی آگے آگے بھاگ رہی تھی اور ایک موٹا انگریز ہانپتا کانپتا ریت پر اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا ۔

دوسرے روز وہ شہر کا چکر لگا کر سہ پہر کے قریب لوٹی تو ریسیپشن کاؤنٹر پر اس کے نام عرفان کا پرچہ رکھا تھا — "مجھے اس نمبر پر فون کر لو — بے حد ضروری بات ہے —"

اس نے اپنے کمرے میں جا کر دھڑکتے دل کے ساتھ فون کیا ۔

عرفان اپنے کمرے سے بول رہا تھا — "بھئی سیتا — سنو — گھبرانا مت — کل رات بڑا قصہ ہو گیا ۔ جے سوریہ کے ڈنر میں جمیل صاحب بھی آئے تھے ۔ بہت دیر تک ان سے تعارف نہ ہو سکا ۔ وہ دور ایک کونے میں بیٹھے مے نوشی میں مصروف تھے ۔ اس کے بعد پارٹی میں شامل ہو گئے ۔ مگر کسی سے ایک لفظ بات نہیں کی — جے سوریہ نے مجھے بتایا کہ وہ کل سے ڈیپریسڈ ہیں ۔ کیونکہ انھیں اطلاع ملی ہے کہ ان کی بیوی ایک پاکستانی کے ساتھ بھاگ آئی ہے اور ماؤنٹ لیونیا میں ٹھہری ہے ۔ اور سیتا ان کی خفگی اور رنجیدگی حق بجانب ہے — یہ واقعہ بھی ہے ۔"

"جی —!"

"یہ واقعہ بھی ہے کہ تم ماؤنٹ لیونیا میں ٹھہری ہو! — ہاہاہا — اچھا اب بھلا

یہ معلوم ہونے کے بعد میں ان سے کیا بات کرتا۔ میں تو ڈنر ختم ہونے سے پہلے ہی کان دبا کر بھاگ آیا۔"

"آپ اتنے۔ اتنے ڈرپوک نکلے۔"

وہ پھر ہنسا — "ارے بھائی میں مذاق کر رہا ہوں۔ اب ایک دم یہ کوئی آغا حشر کا ڈرامہ تو نہیں ہو رہا ہے کہ میں بھی ان کے سامنے جا کر ڈائیلاگ بولنا شروع کر دوں — توفیق کس حال میں ہے اور شیر لوہے کے جال میں ہے۔ ذرا ایک دو دن میں موقعہ محل تلاش کر کے ان سے بات کروں گا۔ آدمی کافی ٹیڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے باقی خاندان والوں سے بالکل مختلف — کل شام ٹیرس پر مجھے تم سے باتیں کرتا دیکھ کر ڈنر پر بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کون پری زاد تھی جس کے ساتھ آپ چائے پی رہے تھے — وغیرہ — تم جانتی ہو گوسپ کی عادت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا — اب کانفرنس میں جا رہا ہوں۔ شام کو اگر کہو تو تمہارے کمرے میں آ کر ساری رپورٹ دوں۔ نیچے پبلک میں تم سے ملنا ذرا مخدوش ہے۔"

"جی نہیں۔ رات کو دس بجے کے بعد فون کر لیجئے گا۔"

"اچھا —"

رات کو اس کا فون نہیں آیا۔ تیسرے دن وہ سیڑھیاں اتر کر باغ میں جا رہی تھی، جب ہال کی طرف سے آتا ہوا وہ مل گیا۔ "بھائی سیتا مجھے معاف کرنا۔" اس نے جلدی جلدی کہا "میں رات پھر بہت دیر میں واپس آیا۔ سنو — ادھر آؤ — میں آج لنچ پر جمیل صاحب سے ملاقات کر رہا ہوں —" وہ ایک گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ "سنو — یہاں پر ایک جگہ سان مشیل[1] ہے۔ جھیل کے اندر ایک جزیرہ ہے۔ جہاں ایک ریسٹوران ہے۔ میں شام کو وہاں آ جاؤں گا۔ تم بھی تشریف لے آؤ۔ ساری رپورٹ گوش گذار کر دوں گا۔"

---

[1] SAN MICHEL

"وہاں تو کوئی ہندوستانی، پاکستانی نہیں ملیں گے ؟" اس نے ذرا خائف ہو کر پوچھا۔
"میرے خیال میں تو کوئی ہندوستانی پاکستانی اتنی دور نہیں جائے گا۔ شام کا وقت زیادہ تر لوگ شہر کے نائٹ کلبوں میں گذارنا زیادہ پسند کرتے ہیں ـــــ اچھا تم چھ بجے وہاں فوراً پہنچ جانا۔"

"اکیلی ـــــ ؟"

"ارے ساری دنیا گھوم چکی ہو۔ وہاں اکیلی نہیں پہنچ سکتیں۔ حد ہے۔ !"
"اچھا ـــ اچھا ـــــ" سیتا نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ تیزی سے روش پر سے گذرتا ڈھلوان پر اتر گیا۔

ٹیکسی کولمبو کے مضافات سے نکل کر سیدھی سڑک پر روانہ ہو گئی جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے اور جنگل کے اندر پہنچ کر بل کھاتے ہوئے رستوں سے گذرتی جھیل کے کنارے جا لگی۔ درختوں کے نیچے دو تین موٹریں کھڑی تھیں۔ وہ اتر کر لکڑی کے بوٹ ہاؤس میں گئی۔ اسے دیکھ کر کشتی والے نے موٹر بوٹ سیڑھیوں سے لگا دی۔ پھونس کی چھت والے اس سنسان بوٹ ہاؤس میں جلتی ہوتی سرخ لالٹین بڑی پر اسرار معلوم ہوئی۔ اتنے میں تین چار لوگ اور آ گئے اور سب کشتی میں جا بیٹھے۔ وہ ٹامل مرد اور عورتیں تھے اور سب بڑے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بوٹ نے گھڑ گھڑ کرتے ہوئے پانی پر چلنا شروع کر دیا۔ جھیل پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ دور کناروں پر ناریل اور چندن کے جھرمٹ کھڑے تھے۔ آسمان کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ جھیل کے وسط میں سان مشیل کے ٹاپو پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد بوٹ گھاٹ سے لگی۔ وہ لکڑی کا طویل کوریڈور طے کر کے ریسٹوران کی طرف گئی۔ روش کے اوپر دو رویہ جاپانی قندیلیں جل رہی تھیں۔ اندر ریسٹوران میں چند سنہالی کیتھولک لڑکیاں اور لڑکے رقص میں مصروف تھے۔ برآمدوں میں اکا دکا لوگ کھڑے تھے۔ بڑا اداس اور

ڈیپریسنگ ماحول تھا۔ آرکیسٹرا انیتا برائیٹ کا اداس نغمہ بجا رہا تھا اور ایک ڈچ برگر لڑکی مائیکروفون کے سامنے کھڑی گا رہی تھی۔

O COME ALONG WITH ME

TO MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

AND DREAM A LITTLE DREAM

IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ عرفان کہیں نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر جزیرے کے دوسرے کنارے کی طرف گئی جہاں ایک چوبی پویلین جو جھیل کے عین وسط میں لکڑی کے کھمبوں پر ایستادہ تھا، ایک چھوٹے سے پل کے ذریعے جزیرے سے ملحق تھا۔ وہ اس پویلین میں داخل ہوئی۔ یہ بھی سنسان پڑا تھا۔ ایک سرے پر کوئی سنہالی جوڑا ریلنگ سے ٹکا پانی کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اب سورج ڈوب چکا تھا۔ جھیل کا پانی قرمزی ہو گیا تھا چند لمحوں میں یہ سرخی رات کی سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔

"سیتا — !"

اس نے مڑ کر دیکھا۔

عرفان کونے کی میز پر سے اٹھ کر آیا۔ "تم نے دیکھا نہیں۔ میں اس طرف بیٹھا تھا۔"

وہ ریلنگ کے برابر بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سیتا جھک کر لہروں کو دیکھنے لگی۔

"کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ۔"

"ہاں۔ ہاں۔ خوبصورت تو ہے مگر اب کام کی بات سنو۔"

"فرمائیے۔" سیتا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت "بزنس لائیک" نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا — دور رقص گاہ میں لڑکی کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونج رہی تھی۔

YOU WILL SOON FORGET THAT THERE IS ANY OTHER PLACE
AND IF YOU CARE TO STAY IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD
THEN WE CAN HIDE AWAY IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

"کل سے آج تک بہت سے واقعات ہو گئے۔" عرفان نے سگریٹ جلا کر جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "ایک تو یہ کہ یہ بات کافی پھیل گئی ہے کہ تم یہاں آئی ہوئی ہو اور بڑی عجیب سی بات ہے نا کہ تم اور تمہارے صاحب بہادر دونوں اسی شہر میں موجود ہیں۔ اور لوگ بآگ جانے کیوں مجھے رقیب روسیاہ سمجھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ تم نے پہلے اس کے متعلق کیوں نہیں سوچا؟ اب کانفرنس کے بعد شام کی محفلوں میں لوگوں کو یہ بے حد عمدہ گوسپ ہاتھ آ گئی ہے اور انڈو پاکستان جھگڑوں کے پیشِ نظر یہ صورتِ حال اور بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔ چند حضرات کو تو یہ یقین کامل ہے کہ میں جمیل کی بی بی کو اڑا لایا ہوں اور اسے ماؤنٹ لیونیا میں چھپا رکھا ہے۔ آج ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ میاں پریشان کیوں ہوتے ہو دوسرے کی بیوی کا اغوا کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔"

سیتا نے ایک جھرجھری سی لی۔ "اب کیا ہوگا؟"

وہ ہنسا۔ "ہوگا کیا۔ انڈو پاکستان تعلقات مزید خراب ہوں گے۔ ممکن ہے کوئی کرائسس بھی ہو جائے جس پر ہمارے وزیر خارجہ کا بیان چھپے گا۔ تمہارے یہاں لوک سبھا میں سوالات کئے جائیں گے۔ اخباروں میں دھڑا دھڑ خبریں چھپیں گی۔ دیکھتی جاؤ۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے بھائی ——!"

"آپ کسی وقت بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔ پر بتایئے اب میں کیا کروں؟"

"میں پوچھتا ہوں تم یہاں آئی کیوں ؟ اگر جمیل سے ملنا تھا تو امریکہ چلی جاتیں۔"
"امریکہ چلی جاتی۔ اور وہاں تک جانے کا کرایہ آپ دے دیتے۔" اس نے غصے سے کہا۔

"آج لنچ پر جمیل صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ حضرت آئے ہی نہیں۔ چنانچہ تیسرے پہر کو بقول شخصے سر پہ کفن باندھ کر جے سوریہ کے ہمراہ گال فیس گیا۔ جہاں موصوف قیام فرما ہیں۔ بھائی اپنے کمرے میں قلعہ بند حسب معمول مے نوشی میں مصروف تھے۔ میں نے جے سوریہ کو اندر بھیج کر کہلوایا کہ میں اس سارے قصے کی تشریح کر کے ان کی یہ خوف ناک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ جے سوریہ جواب لایا کہ عرفان صاحب سے کہہ دینا کہ قمر الاسلام چودھری کی جیسی ٹھکائی میں نے نیویارک میں کی تھی وہ آج تک نہیں بھولا ہو گا۔ لہذا اپنی جان کی خیر مناتے ہو تو میرے سامنے نہ آنا۔"
پویلین میں ہوا کا خنک جھونکا داخل ہوا جس سے سیتا کے بال اڑنے لگے۔ اس نے اپنی سیاہ لٹیں لپیٹ کر سر ڈھانپ لیا۔
"تمھیں پتہ ہے ___" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ قمر کا قصہ جو تھا سو تھا۔ جمیل کو پرو جیش چودھری کی خبریں بھی پہنچ چکی ہیں۔"
وہ سفید پڑ گئی۔
"آپ کو کس نے بتایا ___؟"
"مجھے برابر تمھارا خیال رہتا ہے۔ اور اگر تم برا نہ مانو ___ کیوں کہ تم ADULT بننے کی کوشش بہت کرتی ہو مگر ہو نہیں ___ تمھیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ مجھے تم میں کافی دلچسپی ہے غالباً تم اس کا مداوا نہیں کر سکتیں کہ لوگ تم میں اور بیدا کے دلچسپی لیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی حد تک تم بھی ان کا دل نہیں توڑنا چاہتیں۔"
"آپ نے اس وقت یہ اس قدر ذلیل اور کمینے پن کی بات کہی ہے کہ میں اس کا جواب

نہیں دینا چاہتی ۔ میں آپ کو اپنا دوست سمجھ کر کولمبو آئی تھی ۔"

" دوست ــــــ ؟ دوستی کیا بلا ہے ــــــ ؟ ڈیم ــــــ "

شام کے گہرے سناٹے میں جزیرے سے آتی ہوئی موسیقی اب صاف سنائی دینے لگی۔ رقص گاہ کے اندر لڑکی وہی گانا دوبارہ گا رہی تھی ۔

I ALWAYS KNEW, I'D FIND SOME ONE LIKE YOU SO

WELCOME TO MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا ــــ "اب رات کافی ہو گئی ہے۔ کولمبو واپس جاؤ۔ تم پہلی کشتی سے کنارے پر واپس چلی جاؤ۔ میں بعد میں واپس آجاؤں گا۔ کیا پتہ واقعی ریسٹوران میں کوئی مجھے یا تمھیں پہچان لے ۔ رات پڑے یہاں مجمع زیادہ ہو جاتا ہے ــــ گڈ نائٹ ــــ"

وہ اسے پولیین کے چوبی پل تک پہنچانے بھی نہیں آیا۔ وہ روش پر آئی۔ گھاٹ کی سمت جانے کے لئے رقص گاہ کے راستے پر سے گزری تو ریسٹوران کے سنہالی منیجر ــــ نے جو ڈی ۔ جے پہنے بالکل پنگوئن لگ رہا تھا سامنے سے آکر اس سے کہا ۔" مس ! آپ بہت جلدی واپس جا رہی ہیں ۔ ڈنر کے لئے نہیں ٹھہریئے گا ــــ ؟" قریب سے گزرتی ہوئی دو ٹامل خواتین نے اسے غور سے دیکھا ۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کوریڈور تک پہنچی ۔ کوریڈور کے سرے پر ایک اور سنہالی جوڑا ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا ۔ رات کے آسمان کی وسعت اور سناٹے کے مقابل میں ان کا سلہوٹ بہت المناک اور بے بس معلوم ہوا ۔ ان کے سر کے اوپر ایک سرخ اور سبز جاپانی قندیل جل رہی تھی ۔ چاروں کھونٹ بے پایاں تنہائی تھی ۔

گھاٹ سے اتر کر وہ موٹر بوٹ میں بیٹھ گئی ۔ اندر روسی سفارت خانے کے چند مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے ۔ اس جگہ کا سحر ایسا تھا کہ شاید بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ یہ سحر ٹوٹ نہ جائے ۔

دوسرے روز عرفان اسے لاؤنج میں ملا ۔" میں نے آج پھر سلسلۂ جنبانی کی کوشش

کی تھی مگر وہ ملاقات پر تیار نہیں ہیں۔ لاحول ولا قوۃ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو مصیبت میں پھنسایا۔ میرا خیال تھا ہم تینوں متمدن افراد ہیں اور اسی سطح پر یہ خالص HUMAN معاملہ آپ کے صلاح مشورے سے طے ہو سکے گا۔"

"پھر تم نے اڑنگ بڑنگ اڑانا شروع کیا۔" عرفان نے چڑ کر جواب دیا۔ "میں اگلے چھ دن تک کانفرنس کے کام میں بے حد مصروف رہوں گا۔ تم یہاں اتنا وقت بے کار کیسے گزارو گی۔ بہتر یہ ہے کہ اسکینڈل کا زور کم کرنے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ کے لئے کینڈی وغیرہ چلی جاؤ۔ اگلے منگل سے مجھے فرصت ہے۔ اس کے بعد ہم بیٹھ کر کچھ سوچ سکیں گے۔"

"مگر جمیل ــــ"

"ان کی فکر نہ کرو ــــ وہ بھی ابھی ہفتہ دس دن اور ٹھہر رہے ہیں۔ لیکن تم اب خدا کے لئے یہاں سے رفو چکر ہو ــــ کسی امریکن ٹورسٹ بڑھیا کو ہمراہ لے لو۔ ہوٹل ان سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ساتھ ہو جائے گی اور تم جی بھر کر اس کی معلومات عامہ میں اضافہ کرتی رہنا۔"

"اچھا ــــ" اس نے ایک بار پھر فرماں برداری سے جواب دیا۔

"میں امریکن ایکسپریس سے بات کر کے ابھی تمھارے لئے بہت سخت فرسٹ کلاس ٹور کا انتظام کروائے دیتا ہوں۔" اس نے کاؤنٹر پر جا کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

(۱۲)

سوا چھ فٹ اونچے اور نیلی آنکھوں اور سرخی مائل زرد بالوں والے ڈاکٹر لزلی ونسنٹ مارش نے ریسٹ ہاؤس کی برساتی میں پہنچ کر کار روک لی اور ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید وہ سبز رنگ کی ہل مین جس میں وہ خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی، اسی طرف آتی ہو۔ وہ کولمبو کے مضافات سے لے کر یہاں تک اس کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ بھی اس ریسٹ ہاؤس پر آ کر ٹھہر جائے گی۔ مگر جنگل کے درمیان سے گذرنے والی بل کھاتی ہوئی سرمئی سڑک

سنسان پڑی تھی۔ وہ کار سے اتر کر برآمدے میں آیا۔ بیرے نے ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے لاکر رکھ دی۔ اس نے سیاہ قہوے کی ایک پیالی ختم کرنے کے بعد ٹائپ رائٹر کھولا اور مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ "جنوبی ایشیا میں کمیونزم کا اثر" اپنی کتاب کا دوسرا باب اسے جلد از جلد مکمل کر کے رسالہ کے ایڈیٹر کو ہارورڈ بھیجنا تھا اور وقت بہت کم تھا۔ اسے ابھی یہاں سے مغربی بنگال اور کیرالا بھی جانا تھا۔

برآمدے میں اکا دکا یوروپین ٹورسٹ بیئر کا گلاس سامنے رکھے چپ چاپ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ باغ میں سرخ پھول کھلے تھے۔ آسمان بہت شفاف اور نیلا تھا۔ اس نے سامنے کے پرسکون منظر کو دیکھا۔ ایک گہرا سانس لیا اور دوبارہ ٹائپ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

گھنٹے بھر بعد وہ ایک بار پھر خاموش سرمئی سڑک پر رواں تھا جس کے دونوں طرف ربر کے گھنے جھرمٹ تھے اور الائچی کی جھاڑیوں پر زرد تتلیاں اڑ رہی تھیں۔

کروینگالہ میں ہاتھی کی شکل کی مہیب سیاہ چٹان افق پر نمودار ہوئی۔ یہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ دور دور تک پام کے جھنڈ ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے قصبے کے خوبصورت بازار میں سے گذرتے ہوئے اچانک اسے وہ سبز کار دوبارہ دکھائی دے گئی۔ کچھ دیر تک وہ آگے آگے جاتی رہی اور ایک گاؤں میں پھلوں کی دوکان کے سامنے رک کر پھر پیچھے رہ گئی۔

لزلی مارش کو خود ہی ہنسی آگئی۔ وہ کیا مسخرہ پن کر رہا تھا۔ اگر اس لڑکی نے پیچھے پلٹ کر دیکھ لیا تو یہی سمجھے گی کہ کوئی دوسرا ٹورسٹ پیچھے پیچھے آرہا ہے اور واقعہ بھی یہی تھا۔

گاؤں کے راستوں کے کنارے لگی ہوئی رنگ برنگی کاغذی چرخیاں ہوا میں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ کہیں کہیں بدھ مندروں کے پھاٹک پر سفید جھنڈے لگے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں کے پروہت کا دیہانت ہوگیا ہے۔ تاریک جنگلوں میں پرتگالی اور ولندیزی عہد میں بنے ہوئے کیتھولک چرچ چھپے کھڑے تھے۔ خوبصورت کاٹجوں کی کھڑکیوں میں پردے

لہرا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد منظر تبدیل ہونا شروع ہوا اور زمرد کے رنگ کی پہاڑیاں حد نظر تک پھیلتی چلی گئیں۔

پولونروا میں "پراکرم سمدر" کے کنارے ریسٹ ہاؤس پر پہنچ کر اس نے متوقع نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔

کمرے میں جاکر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور لنچ کا آرڈر دینے کے بعد باہر آکر شیشے کی لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ لاؤنج کے تین طرف پراکرم سمدر لہریں مار رہا تھا۔ اندر میزوں پر بڑے بڑے زرد پھول گلدانوں میں جگمگا رہے تھے۔ دریچوں کے قریب تین چار امریکن اور یورپین سیاح عورتیں قہوہ پیتے ہوئے آہستہ آہستہ باتوں میں مصروف تھیں۔ سائے کی طرح مودبانہ چلتے ہوئے سنہالی بیرے ان کی خاطر کرنے میں جٹے تھے۔

ڈائننگ ہال میں ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی نے مسکرا کر اسے نمستے کیا۔

"پولونروا کے کھنڈر دیکھنے میں کتنی دیر لگے گی؟" اس نے دریافت کیا۔

"یہ اس پر منحصر ہے کہ آپ کو ان سے کتنی دلچسپی ہے۔" لڑکی نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

"میں آرکیالوجسٹ ہوں۔"

"اوہ۔ تب تو آپ کو انورادھاپورہ بھی ضرور جانا چاہیئے۔"

"افسوس ہے کہ اس مرتبہ میں انورادھاپورہ نہیں جا سکتا۔ آرکیالوجی میری ہوبی ہے مگر ان دنوں میں ایک بالکل مختلف موضوع پر کتاب لکھنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ تم کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتی ہو تو مجھے کچھ باتیں بتاؤ۔ اس نے کھڑے ہو کر دوسری کرسی میز کے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔" تم ٹامل ہو یا سنہالی؟"

"ٹامل ــــ! مگر میں کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے

اسی وقت کولمبو واپس جانا ہے ـــــ" لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا اور نمستے کر کے آگے چلی گئی۔

کھانا ختم کر کے وہ باہر آیا۔ برآمدے میں سری لنکا اور پولونروا کا نقشہ اور پراکرم باہو اول کا فرمان فریم میں آویزاں تھا " بارش کا تھوڑا سا پانی بھی انسان کے کام میں آئے بغیر سمندر تک نہ بہنا چاہئے ـــــ پراکرم باہو"

اس نے "جنوبی ایشیا میں کمیونزم کا اثر" کا مسودہ بند کر کے پورٹ فولیو میں سے دوسرا مسودہ نکالا اور نقشے کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھ کر جلدی جلدی نوٹ لینے شروع کئے۔

" عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے ہندوستان کے پرنس وجے نے لنکا پر حملہ کیا۔ اس کے ہمراہ آئے ہوئے لوگ جو مگدھی نسل کے تھے سنہالی کہلائے اور ان کی مناسبت سے یہ جزیرہ سنہلدیپ کہلایا یعنی شیروں کا جزیرہ۔ پرنس وجے نے لنکا کی شہزادی سے شادی کر لی تھی۔ لنکا کے قدیم باشندے PRE-DRAVADIAN ASTROLOIDS تھے ـــــ چھوٹا ناگپور کے علاقے سے چل کر یہ نسل ملایا، جاوا اور آسٹریلیا تک پھیل گئی۔ لنکا میں ان لوگوں کی راجدھانی کا نام لنکا پورہ تھا۔ غالباً اسی کو ہندوؤں کی قدیم ایپک رامائن میں شمالی ہند کے آریوں نے اپنی نسلی برتری کی احساس کی بنا پر سیاہ فام راکھشسوں کی قوم کہا ہے۔ (ایشیا میں نسل ورنگ کا امتیاز ـــــ مشرق کی کلر بار ـــــ اس مسئلے پر مجھے مزید کام کرنا پڑے گا۔ اس نے حاشیے پر لکھا اور کیمل سگریٹ جلا کر پراکرم سمندر کی موجوں کو دیکھنے لگا۔ اس کاسنی ساری والی لڑکی کا خیال دماغ سے نکال کر چند لمحوں بعد دوبارہ لکھنا شروع کیا) سیلون کے موجودہ جنگلی قبائل جو اڑیسہ کے جنگلی قبائل سے بہت مشابہت رکھتے ہیں، ویدہ کہلاتے ہیں اور ان ہی ادی جنگل باشندوں کی اولاد ہیں۔

" سنہالی بادشاہ اکیس صدیوں تک اس جزیرے پر حکمراں رہے۔ انورادھا پورہ ان کا دارالسلطنت تھا۔ اشوک کا بیٹا شہزادہ مہندر پہلا بدھسٹ مشنری تھا جس نے انورادھا پورہ آکر سنہالی بادشاہ دیونام پیا تسا کو بدھ مت میں داخل کیا۔ بائیبل میں جنوبی لنکا کے

ساحلی سہر تار شش یا گال کا ذکر ہے جہاں سے ملکہ سبا اور سلیمان کے لئے مور اور ہیرے ایکسپورٹ کئے جاتے تھے

"آٹھویں صدی عیسوی تک لنکا شمالی ہند کی موریہ اور گپتا کلچر سے متاثر رہا اور نویں صدی سے جنوبی ہند کے سیاسی اور تہذیبی حلقہ اثر میں داخل ہو گیا۔ دریائے کرشنا کے بیچھم میں اس وقت چولا اور پانڈیہ اور کیرل کی بادشاہتیں قائم تھیں۔ لنکا کے تخت کے مختلف دعویدار اپنی خانہ جنگیوں کے دوران ان بادشاہوں سے مدد مانگتے تھے۔ گیارہویں صدی میں چولا لوگوں نے انورادھا پورہ کی بادشاہت کو شکست دے کر جزیرے کے بیشتر حصے کو چولا سلطنت میں شامل کر لیا اور پولونروا کو اپنی راجدھانی بنایا۔ مگر اسی صدی میں سنہالی بادشاہ پراکرم باہو اوّل نے جنوبی ہند کے تسلط سے آزاد ہو کر دوبارہ اپنی سلطنت قائم کی۔

"لنکا کا پایہ تخت انورادھا پورہ تیرہ سو سال تک آباد رہا —— یہ روم اور قرطاجنہ اور تھیبز سے زیادہ لمبی مدت ہے —— اور پھر جنگل اسے کھا گیا۔

"پولونروا لنکا کے عظیم ترین بادشاہ پراکرم باہو اوّل کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے شاندار تھیٹر ہال، تصویر خانے، ستوپ اور مندر تعمیر کروائے۔ اس نے سارے جزیرے میں آب پاشی کا ایسا زبردست اور حیرت انگیز انتظام کیا کہ دور دراز کشمیر کے فرمانروا یہاں سے انجینیر منگواتے تھے (کولمبو پلان اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا —— لینرلی مارش نے دل میں کہا)

"پراکرم باہو نے یہ عظیم الشان مصنوعی سمندر تیار کروایا ——" لکھتے لکھتے اس نے سمندر کی طرف دیکھا اور پھر سامنے لگے ہوئے فرمان پر نظر ڈالی —— "بارش کا تھوڑا سا پانی بھی انسان کے کام میں آئے بغیر سمندر تک نہ بہنا چاہیئے۔"

"اس کے بعد زوال آیا ——" لینرلی مارش نے لکھنا جاری رکھا۔ "اور رفتہ رفتہ اگلی صدیوں میں پولونروا بھی جنگل کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ڈوب گیا۔"

اس نے گھڑی دیکھی۔ اب چلنا چاہئے ورنہ رات تک سگریہ نہیں پہنچا جا سکتا۔ کتابیں اور کاغذات سمیٹ کر اس نے پورٹ فولیو میں رکھے اور ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلا۔ چند قدم پر پراکرم باہو کا عظیم الشان مجسمہ ایک نیچے سے ٹیلے پر کھڑا تھا ـــــ اس مجسمے کو سنہالی سنگتراشوں نے نو سو برس پہلے بنایا تھا ـــــ اس کے سائے میں کھڑے ہو کر لزلی مارش نے خود کو بے حد حقیر محسوس کیا ـــــ میں کون ہوں ـــــ دور دراز نیو انگلینڈ سے آیا ہوا لزلی ونسنٹ مارش ـــــ جو اس وقت بزعم خود مشرق کو تہذیب سکھانے نکلا ہے ـــــ جو سمجھتا ہے کہ مشرق کے سارے دکھوں کا علاج صرف اس کے پاس ہے ـــــ مشرق کو اپنے دکھوں کا خود ہی مداوا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

مجسمے کے قریب جھبڑے بالوں اور سیاہ رنگت کا ایک نوجوان دیدہ کھڑا دانت نکوس رہا تھا اور غالباً اس سے بخشیش کا طالب تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ ویدہ ان قدیم جنگلوں ان سرسبز پہاڑوں، اس لہریں مارتی نیلی جھیل، اس سنگ سرخ کے مہیب مجسمے کی روح ہے، جو آج کی "متمدن" دنیا کے تاریک لاشعور میں سے دفعتاً نمودار ہو کر اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔

کیمرہ سنبھال کر وہ ٹیلوں پر سے اترتا سائیں سائیں کرتے اونچے درختوں کے جنگل میں داخل ہوا جہاں سنگ سرخ کے کھنڈر چاروں طرف دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔

منقش ستونوں والے پویلین کے "مُون اسٹون" پر بیٹھ کر وہ اپنا کیمرہ فوکس کر رہا تھا جب اسے اچانک وہ نظر آگئی۔ وہ دوسری طرف سے سیڑھیاں اتر کر پراکرم باہو کے "پچاس کمروں والے محل" کی سمت جا رہی تھی۔ وہ فوراً اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ گھاس پر بکھری ہوئی زرد پتیوں پر اس کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ پیچھے مڑی۔

"ہائی ـــــ" لزلی مارش نے مسکرا کر کہا۔

"ہائی ـــــ" جواباً وہ بھی مسکرائی۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "یہ اس قدر خوبصورت جزیرہ ہے کہ سمجھ میں نہیں

آتا کیا کیا جائے ۔" اس نے بات شروع کی ۔

" ہاں ـــ" کاسنی ساری والی لڑکی نے جواب دیا ۔" ہماری مقدس کتاب راماین میں لکھا ہے کہ سبز اور سنہرا لنکا اس قدر دلفریب تھا جیسے آکاش پر باغ لگا ہو ۔"

" کتنا حسین طرز تعمیر ہے یہ ـــ" لزلی مارش نے محل کو دیکھتے ہوئے ٹھٹک کر کہا ۔

" میں جب کبھی ایشیا آتا ہوں اپنے آپ کو بے حد حقیر محسوس کرتا ہوں ۔"

" تم نے جنوبی ہند کے مندر دیکھے ہیں ؟"

" ہاں ـــ تم بھی ہندوستانی ہونا ؟"

" ہاں ـــ وہ دیکھو ـــ سات محل وہار ـــ اسے رانی روپ وتی نے بنایا تھا ـــ میں نے ابھی گائیڈ بک میں دیکھا ۔"

" میرا نام ڈاکٹر لزولسنٹ مارش ہے ۔ میں ہارورڈ سے آیا ہوں ۔"

" میں ڈاکٹر میر چندانی ہوں ۔ میں نے ۱۹۵۵ء تک کولمبیا میں پڑھا ہے ۔"

" مس میر چندانی یا مسز میر چندانی ؟"

" میر چندانی میرا میڈن نام ہے ۔"

" تمھیں معلوم ہے میں کولمبو سے لے کر یہاں تک تمھارا تعاقب کرتا آیا ہوں ۔ تم نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ۔"

" ہارورڈ کے لوگ تو بہت سنجیدہ اور معقولیت پسند مشہور ہیں ۔"

" ہاہاہا ـــ تم کولمبیا میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر ایڈورڈ مارش کو جانتی ہو ؟ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے ـــ"

کھنڈروں کے چکر لگاتے ہوئے انھوں نے امریکہ کی باتیں شروع کر دیں ۔ وہ اسی پس منظر سے نکل کر آیا تھا جس میں وہ خود اتنے عرصے رہی تھی اور جہاں اس نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا ۔ شاید اسی لئے اس اجنبی امریکن سے اس نے ایک عجیب سی یگانگت

محسوس کی۔

"انتھروپولوجی اور آرکیالوجی میرے محبوب مضمون ہیں لیکن یونیورسٹی میں پلیٹکل سائنس پڑھاتا ہوں۔ آج کل ایک کتاب لکھنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ تم بھی کتاب لکھنے آئی ہو؟"

"نہیں تو —— وہ دیکھو" اس نے جلدی سے گائڈ بک کھولی "وہ رانیوں کے نہانے کے لئے کنول کی شکل کا تالاب —— یہاں لکھا ہے کہ زمین دوز نالی کے ذریعہ پراکرم سمدر سے پانی لاکر اس میں بھرا جاتا تھا"

وہ سارے میں گھومتے پھرے۔ لنکا تلک مندر —— جیت ون دیہار —— رانی روپ وتی کا بنایا ہوستوپ —— پراکرم باہو کی ملکہ سبھدرا کا بنایا ہوا کیری دیہار —— جنوبی ہند کی طرز کے ٹوٹے پھوٹے شوالے —— اینٹوں سے بنایا ہوا بے تحاشا اونچا گوتم بدھ جو سیدھا کھڑا تھا اور جس کے گوتھک وضع کے مندر کی چھت گر چکی تھی۔ گھاس پر سرمئی چٹانوں کے درمیان لیٹا ہوا گوتم بدھ جسے پری نروان حاصل ہو چکا تھا اور جس کے سرہانے آنند ہاتھ باندھے اپنے آقا کی موت پر اداس کھڑا تھا —— ایک وسیع و عریض چبوترے پر پدم آسن میں بیٹھا ہوا گوتم بدھ جس کے سامنے درختوں پر پجاریوں نے اپنی اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لئے سفید کترنیں باندھ رکھی تھیں —— اور جس کے چاروں اور سنہالی عورتیں آ آ کر سجدے میں گر رہی تھیں —— موروں اور ہاتھیوں اور راج ہنسوں کی رلیف والے نفیس اور سبک مون اسٹون۔ لزلی ایک ایک چیز دیکھ کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔

"وہ دیکھو، سات محل پرساد ——" لزلی نے سامنے اشارہ کیا "اس زمانے میں لوگ سات سات منزلیں تعمیر کر لیتے تھے۔ کمال ہے"

"راہاین میں تلسی داس نے لکھا ہے کہ لنکا کے محل خود وشوکرم نے خدائے دولت کوبیر

کے رہنے کے لئے اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔" سیتا نے کہا۔

"ہیں — ہیں ؟ پھر سے کہنا۔" اس نے فوراً اپنی نوٹ بک نکالی۔ سیتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اور یہ بھی لکھو — وشنو نے جادو کا شہر بسایا تھا۔ اس میں شہزادی وشنو موہنی رہتی تھی۔" وہ ایک شکستہ ستون پر بیٹھ گئی۔ لزلی نے نوٹ بک بند کر دی۔

"تمھیں ایک بات بتاؤں۔" اس نے کہا۔ "ہندو دیو مالا اور رامائن کی کہانی پڑھ کر میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ سیتا کیسی ہوگی۔"

"اور وہ تم نے آج دیکھ لی۔" وہ اور زور سے ہنسی۔

فضول — فضول —

واپسی میں انھیں دور سے رن کوٹ وہار کا عظیم الشان ستوپ نظر آیا جس کے وسیع و عریض گنبد پر گھنا جنگل اگ آیا تھا۔ "کتنی ڈراؤنی بات ہے۔" سیتا نے کہا۔ "انسان جنگل کے سامنے بے بس رہ جاتا ہے۔"

"ہاں۔" لزلی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔"

ریسٹ ہاؤس کے سامنے پہنچ کر اس نے سیتا سے کہا۔ "اگر تم یہ نہیں چاہتی ہو کہ میں دوبارہ تمھارا تعاقب شروع کردوں تو تم میری کار میں آجاؤ — اور اپنے ڈرائیور سے کہہ دو کہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔"

سیتا نے ایسا ہی کیا۔

پولونرُوا کے کھنڈر عقب میں چھوڑ کر پھر وہ سیدھی سڑک پر آگئے۔ سیتا نے سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند لیں۔ پچھلے سال وہ عرفان کے ساتھ بہاولپور کی گرد آلود سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ عرفان اس وقت کولمبو میں تھا، جمیل بھی کولمبو میں تھا۔ وہ لیزلی ونسنٹ مارش کے ساتھ سگریہ جارہی تھی۔

رات ہوگئی۔

ساوتری نے کہا تھا ـــــ رات ہمارے چاروں اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ سورج ڈوب چکا ہے۔ رات کے حیوان چاروں کھونٹ گھوم رہے ہیں اور بڑی بے رحمی سے طنزیہ قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کے چلنے سے پتیاں کھڑکھڑا رہی ہیں۔ جنوب مغرب سے آتی ہوئی گیدڑوں کی بھیانک چیخیں میرے دماغ کو تھرّا رہی ہیں ـــــ میرے دماغ کو ـــــ میرے دماغ کو ـــــ

رات کی تاریکی میں سگریہ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سکوت طاری تھا۔

"تمہارا ریزرویشن موجود ہے؟" لیزلی نے کار سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ـــــ"

"آپ کا کمرہ اس طرف کے ونگ میں ہے ڈاکٹر مارش ـــــ" ریسٹ ہاؤس کے منیجر نے سامنے آکر کہا۔

"اچھا ـــ تھینکس"، وہ اٹیچی کیس اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسرے برآمدے کی سمت روانہ ہوگیا۔

صبح کو جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تو وہ برآمدے میں بیٹھا بڑی تندہی سے ٹائپ کر رہا تھا۔

"گڈ مارننگ!" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"گڈ مارننگ ٹو یو پروفیسر!" سیتا نے جواب دیا اور قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ ٹائپ کرنے میں مصروف رہا۔

"کیا لکھ رہے ہو؟"

لیزلی نے ٹائپ شدہ کاغذات اس کی طرف کھسکا دیئے۔

"جنوبی ایشیا پر کمیونزم کا اثر": سیلون میں سری لنکا فریڈم پارٹی کا ڈھونگ۔ دوسرے باب کا پہلا عنوان تھا ـــــ وہ چند صفحوں پر نظر دوڑا کر کوفت کے ساتھ باہر دیکھنے لگی ـــــ

"تمھاری باتوں سے لگا تھا کہ تم معقول قسم کے ڈیمو کریٹ ہو ــــ" چند منٹ بعد اس نے کہا۔

لیزبی ٹائپ رائٹر بند کر کے ہنسنے لگا: "میں نے کل شام پولونروا میں تم سے بحث کرنے کے بعد طے کر لیا تھا کہ اتنے خوبصورت لمحات سیاسی گفتگو میں برباد نہیں کروں گا کیونکہ جب تم تقریر شروع کر دیتی ہو تو دوسرے کو کوئی اور بات نہیں کرنے دیتیں اور اس طرح بہت قیمتی وقت ضایع ہوتا ہے۔ تم ایسی حسین لڑکیوں کو انٹلکچوئیل بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔"

سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے ساتھ بریکفاسٹ کی میز کی طرف چلی گئی۔

ناشتہ ختم کر کے اس نے گھڑی دیکھی۔

"اب جلدی سے سگریہ دیکھ آنا چاہیئے۔"

"کیوں ــــ؟ جلدی کیا ہے ــــ؟" لیزلی نے اس کا سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "میرا جی تو چاہ رہا ہے کہ ایک دو دن یہیں رہا جائے۔"

"مجھے منگل کی صبح کولمبو واپس پہنچنا ہے۔"

"کولمبو پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟

"انگریزوں کے بسائے ہوئے اس کولونیل شہر میں کیا رکھا ہے؟"

وہ میز پر ماچس کی تیلیوں سے حروف بنانے میں منہمک رہی۔ ایک بہت کم عمر سنہالی جوڑا جن کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں ماہِ عسل منانے آیا ہے، اپنے کمرے سے نکل کر کاؤنٹر پر آیا۔ لڑکی کولمبو ٹرنک کال کر رہی تھی۔

"مما ــــ ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ بہت اچھا ــــ کھانا ــــ؟ ہاں کھانا بہت اچھا ہے ــــ ہاں ہاں ــــ میں نے اوولٹین پیا ہے ــــ میں رتنا کو بہت سے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجوں گی ــــ جارج سے بات کیجیے"

قہوہ ختم کر کے لیزلی اٹھ کھڑا ہوا ــــ "جو تمھاری مرضی ــــ چلو سگریہ دیکھ آئیں۔"

سگریہ کی چھ سو فیٹ اونچی ہیبت ناک چٹان کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ گیا۔ ہوا بہت تیز تھی اور مدھم دھوپ نیچے حدِ نظر تک کھیتوں پر پھیلی ہوئی تھی ـــ دور افق پر تیز نیلی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

چوٹی پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے یک لخت لیزلی سے کہا۔

"احساسِ جرم سگریہ کی چٹان کی طرح مہیب اور اٹل اور سیاہ اور خوف ناک ہے۔"

"تم بعض دفعہ ایسی گنجلک باتیں کرتی ہو کہ ان کے لئے باضابطہ فٹ نوٹس کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے ـــ بتاؤ دنیا کی کس لائبریری میں تمھاری باتوں کے اشارے مل سکیں گے ؟" لیزلی نے کہا۔

سیتا نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

فضول ـــ فضول ـــ فضول ـــ

ایک اور چٹان کی سطح پار کر کے وہ فریسکوز کی طرف جانے والی آہنی سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گئے ـــ لیزلی نے ایک قدم منڈیر پر رکھ کر اوپر دیکھا۔

"اگر وہاں سے گر جائے آدمی تو کیسا رہے ؟" اس نے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کرتے ہوئے پھر چاروں طرف دیکھا ـــ دفعتاً اس نے مڑ کر سیتا سے سوال کیا "تم احساسِ جرم کی کیا بات کر رہی تھیں ـــ ؟"

"کچھ نہیں ـــ !!" وہ منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"مجھے ضرور بتاؤ ـــ" لیزلی نے ضد کی۔

"رات میں سگریہ کی کہانی پڑھ رہی تھی ـــ" سیتا نے بات ٹالنے کے لئے کہنا شروع کیا ـــ "کہ پانچویں صدی عیسوی میں دھتوسین لنکا کا راجہ تھا۔"

لیزلی نے فوراً نوٹ بک نکال لی اور گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے سامنے بیٹھ گیا ـــ

"اس کے دو بیٹے تھے ـــ" سیتا نے ہوا کے تھپیڑے سے اڑتے ہوئے پلو کو کمر کے

گرد لپیٹتے ہوئے کہا ـــــ "کیشیپ اور موگلنا۔ راجہ کی بیٹی کی شادی اس کے سیناپتی سے ہوئی تھی ــــ ایک روز راجکماری نے اپنے باپ سے کہا کہ اس کے شوہر نے اسے کوڑوں سے مارا ہے۔ دھتوسین نے غصے میں آکر اس کی ساس کو زندہ جلوادیا۔ سیناپتی بادشاہ پر خود حملہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے کیشیپ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور کیشیپ نے بغاوت کرنے کے بعد باپ کو زندہ دفن کیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ موگلنا جان بچاکر ہندوستان بھاگ گیا مگر اس کے بعد مہاراجہ کیشیپ کو احساس جرم نے ستانا شروع کر دیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ انتقام کی دیوی اسے اس کے جرم کی سزا دے گی۔ لہذا اس مستقل خوفزدہ بادشاہ نے سگریہ کی اس اونچی چٹان پر اپنا قلعہ بنایا تاکہ دنیا سے محفوظ رہ سکے۔ اس چٹان کی سطح پر اس نے محل دو محلے اور تالاب اور حوض بنوائے اور یہاں رہنے لگا۔ مگر اٹھارہ سال بعد ـــــ" منڈیر سے اٹھ کر اس نے پھر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ لیزلی نوٹ بک سنبھالے ساتھ ساتھ سر جھکائے بڑے دھیان سے کہانی سنتا جارہا تھا ــــ چلتے چلتے ایک سیڑھی پر سیتا کا پیر رپٹا۔

"ارے ارے ـــــ سنبھل کر چلو ـــــ" اس نے گھبرا کر کہا ـــــ "ہاں۔ پھر ـــ؟"

"اٹھارہ سال بعد موگلنا فوج لے کر ہندوستان سے لوٹا اور اس چٹان کے نیچے اپنے بھائی سے جنگ کی اور کیشیپ نے میدان جنگ میں خودکشی کر لی ـــــ"

انھوں نے خطرناک آہنی زینہ چڑھنا شروع کیا اور چند منٹ میں اوپر پہنچ گئے۔ چوٹی کے بالکل کنارے کنارے 'گیلری' تھی جس کی دیوار پر اجنتا کی نقل میں فریسکو بنے تھے۔

"پھول برساتی ہوئی اپسرا ـــ ری پروڈکشن اتنی مرتبہ دیکھا ہے کہ اس وقت اسے سچ مچ میں دیکھ کر یقین نہیں آرہا ہے ـــــ" لیزلی نے کہا۔

"تم نے اجنتا کے فریسکو دیکھے ہیں؟" سیتا نے پوچھا۔

"نہیں ـــــ اب جاکر دیکھوں گا ـــــ ذرا سوچو یہ خوبصورت تصویریں کن فن کاروں نے کتنی جوکھم میں پڑ کر بنائی ہوں گی۔"

"اجنتا دیکھنے کے بعد یہ پانچ چھ چھوٹی چھوٹی تصویریں بالکل مسخرہ پن معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی خواہ مخواہ اتنی اوپر چڑھ کر آئی ــــ چلو اب نیچے گریفٹی دیکھ لیں ــــ" سیتا نے گائیڈ بک کھول کر کہا۔ لینرلی تصویریں دیکھنے میں محو تھا۔ وہ اس کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔

"تمھاری تصویر اگر کسی قدیم سنگلاخ دیوار پر اسی طرح بنائی جاتی تو کیسی لگتی ــــ؟"

لینرلی نے پلٹ کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جانے یہ لڑکیاں کون رہی ہوں گی ــــ"

سیتا نے بالوں کی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر آہستہ سے کہا ــــ "وجولتا ــ بجلی کی شہزادی، میگھ لتا ــــ بادلوں کی شہزادی ــــ اپسرائیں ــــ رمبھا ــــ مینکا ــــ"

فریسکوز سے آگے بڑھ کر وہ گریفٹی کی طویل دیوار کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ نیچے شیر کے عظیم الشان پنجوں کے درمیان سے نکل کر چند سیاح سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ سنہاگیری کا ہولناک سایہ دور دور تک کھیتوں پر پڑ رہا تھا۔

"اس دیوار پر صدیوں پہلے سگریہ آنے والے سیاحوں نے جو کچھ لکھا تھا اسی طرح محفوظ ہے ــــ" سیتا نے گائیڈ بک کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ "اس گریفٹی پر جو شیشے کی دیوار کہلاتی ہے چھ سو اسی تحریریں منقش ہیں جنھیں ہماری آپ کی طرح سیاحوں نے لکھا ہوگا ــــ بہت سی مذاقیہ نظمیں سوال جواب کی صورت میں ہیں۔

"دوست ــــ ایک جگہ لکھا ہے ــــ ان سنہری لڑکیوں کی تصویریں جگہ جگہ سے خراب ہوگئی ہیں ــــ کہیں کہیں پہ ان کا رنگ اڑ گیا ہے ــــ کیا اب کوئی ایسا باقی نہیں جو اُن کے زمانے میں ان سے پیار کرتا تھا؟

"ایک کسی عورت نے لکھا ہے۔ "سنو سنو ــــ ہم لڑکیاں تم سے مخاطب ہیں ــــ تم احمقو! تم جو سگریہ آئے ہو ــــ گیت گانے اور نظمیں لکھنے کے علاوہ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم عورتیں ہیں اور ہمیں مدد را چاہیئے ــــ"

کینڈی میں شاطو کے دریچے میں سے جھیل نظر آرہی تھی۔ جس کے چاروں طرف پہاڑیوں پر سرخ چھتوں والی کوٹھیاں پام کے گھنے جھرمٹوں میں چھپی کھڑی تھیں۔ پہاڑیوں پر بل کھاتے ہوئے سایہ دار ڈرائیوز تھے جن کے نام سابق برطانوی گورنروں کی بیویوں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ لیڈی ہورٹن ــــ لیڈی بلیکس ــــ لیڈی مک کیلم ــــ آسمان کے مقابل، بائبل روک استادہ تھی۔

شاطو کا مالک کوئی رومن کیتھولک بیرسٹر تھا جس کا آدھا نام پرتگالی، آدھا سنہالی اور آدھا تامل تھا۔ نچلی منزل کے ڈرائینگ روم میں اپنے فیملی گروپ آویزاں تھے۔ اوپر کھانے کے کمرے میں بیرسٹر کے کسی پرکھ کی روغنی تصویر سجی تھی۔ تصویر کے نیچے اس کا نام لکھا تھا ــ "ڈون فرنینڈیز ڈی کوسٹا سمرسنگھا رونا مدلیار"

"کولونیل مشرق اور سامراجی مغرب کا یہ ناجائز اختلاط مجھے ہانگ کانگ سے لے کر گوانک ہر جگہ دیکھنے کو ملتا ہے ــــ" لیزلی نے نیپکن اٹھاکر دریچے کے قریب کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے کینڈی کی رقاصاؤں کا ناچ دیکھا ہے ؟" سیتا نے پوچھا۔

"ہاں ــــ میں جنگ کے زمانے میں برما جاتے ہوئے چند روز کے لئے یہاں ٹھہرا تھا اتفاق سے اسی شاطو میں ٹھہرا تھا ــــ جس زمانے میں کینڈی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا ــــ" پھر وہ رک کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"کیا سوچتے ہوئے ؟" سیتا نے سلاد کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ــــ" وہ چونک کر بولا ــــ "برما میں بری طرح زخمی ہوا تھا اور کئی سال جنگی قیدی رہا تھا۔ میرے دو چھوٹے بھائی ٹوکیو پر بمباری کرتے ہوئے مارے گئے تھے ــــ جنگ بڑی خوف ناک چیز ہے ہنی "

"اور اب تم ایک اور جنگ چاہتے ہو "

"کیوں کہ تمھارے اس خوبصورت ایشیا کو کمیونزم سے بچانا لازمی ہے ہنی۔"
سیتا نے ایک بار پھر خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔
"چلو اچھے سیاحوں کی طرح دانت کا مندر دیکھ آئیں۔" کھانے کے بعد اس نے ذرا اکتا کر لیزلی سے کہا۔
کینڈی کے مشہور و معروف "دانت کے مندر" میں شام کی پوجا ہو رہی تھی۔ اس سے ملا ہوا کینڈی کے آخری بادشاہ وکرم راج سنگھ کا چھوٹا سا چوبی محل سنسان پڑا تھا۔ لیزلی اس کی دیواروں کے چوبی نقش و نگار انگلیوں سے چھوتا پھرا ــــ اس بادشاہ کو ۱۸۱۵ء میں انگریزوں نے شکست دے کر لنکا پر قبضہ جمایا تھا ــــ سیتا کو یاد آیا ــــ اس نے کولمبو میوزیم میں سری وکرم راج سنگھ کی رانی کا اطلسی بلاؤز ایک شوکیس میں رکھا دیکھا تھا جس کے شانے پر خون کا مدھم سا دھبہ تھا۔ بلاؤز کے نیچے ایک پرچی پر لکھا تھا ــــ کینڈی کو تاراج کرنے کے بعد راج محل پر حملہ کرتے ہوئے برطانوی سپاہیوں نے مہارانی کے کانوں سے جو بالیاں نوچی تھیں یہ اس کا خون ہے ــــ!
جھانسی کی لکشمی بائی ــــ لکھنؤ کی ملکہ حضرت محل ــــ کینڈی کی مہارانی ــــ
شام کو واپس آ کر رات کا کھانا کھانے کے بعد لیزلی سے مزید باتیں کرنے کے بجائے وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس سے تین دن تک متواتر باتیں کرتے کرتے اب اکتا گئی تھی۔

رات گئے تک لیزلی کے کمرے سے ٹائپ رائٹر کی آواز آیا کی۔ شاید وہ اس وقت ــــ جنوبی ایشیا میں کمیونزم کے اثرات کا تیسرا باب لکھ رہا تھا۔
دوسرے روز سویرے وہ کینڈی سے روانہ ہوئے۔ شہر سے باہر مہاویلی گنگا میں ہاتھی نہا رہے تھے۔ چند میل کے فاصلے پر سیلون یونیورسٹی کی سنگ سرخ کی خوبصورت عمارات دور دور تک سرسبز پہاڑیوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ سایہ دار ستونوں پر سوتی ساریوں میں ملبوس سانولی

سلونی لڑکیاں کتابیں اٹھائے ادھرادھر آجارہی تھیں ــــ جانے ان بے چاریوں کی قسمتوں میں کیا کیا لکھا ہے ــــ کار میں لینرلی کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اس نے سوچا ــــ وہ بھی کسی زمانے میں اسی طرح ذوق وشوق سے کتابیں سنبھالے پڑھنے جایا کرتی تھی ــــ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی سسرال کی بڑی بوڑھیاں کنواری لڑکیوں کے سلام کے جواب میں "اللہ نصیبہ اچھا کرے!" کیوں کہا کرتی تھیں ــــ اور بڑی خالہ، منجھلی خالہ، چھوٹی خالہ تینوں اس کے جواب میں اسے "بوڑھ سہاگن بنو" اور "مانگ سے ٹھنڈی رہو" کی دعائیں دیتی تھیں ــــ!!

کینڈی سے آگے اچانک زیادہ بلند پہاڑ شروع ہو گئے۔ پام کے جھنڈ اب ختم ہو رہے تھے اور ان کی جگہ اونچے اونچے الپائن درختوں نے لے لی تھی۔

تیسرے پہر کو وہ نوارا ایلیا کے ہل اسٹیشن پر پہنچ گئے ــــ نیورا ایلیا ــــ "روشنیوں کا شہر ــــ"

انگریزی کنٹری ہاؤس کی وضع کا دو منزلہ "گرینڈ ہوٹل" ایک پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو چکی تھی۔ ہوا میں پہاڑی گلابوں کی تیز مہک تھی۔ ہر طرف ڈیزی اور کارنیشن کے پودے لہلہا رہے تھے۔ ہوٹل کے اندر سے مدھم مغربی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔

"افوہ ــــ" لینرلی نے کار سے اتر کر ہوا کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یکایک ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ایشیا کے تند و تیز سحر سے بچ کر ایک بار پھر اپنے محفوظ اور سرد مغرب میں واپس آگیا ہوں۔"

جتنی دیر میں سیتا اپنا سامان سنبھال کر برساتی میں اتری وہ ہال میں جا کر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک سے بات کرنے میں مصروف ہو چکا تھا ــــ وہ بھی قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

کلرک نے رجسٹر کھولا اور لینرلی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ڈبل روم سر ــــ؟"

"ہاں ـــــ" لیزلی نے جواب دیا۔

"نام ـــــ؟"

"مسٹر اینڈ مسز لیزلی مارش ـــــ" لیزلی نے جواب دیا۔

کلرک نے لکھ لیا۔

"تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہنی ـــــ؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ چُپ رہی۔

دوسری صبح پہاڑوں پر بہت گہرا کہرا چھایا ہوا تھا۔ دھند چھٹی تو سیتا ہاؤس کوٹ پہن کر دریچے میں گئی اور سرخ پھولوں والا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔

"آج کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے پلٹ کر لیزلی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ"۔ اس نے شیو کرتے ہوئے سنگھار میز کے سامنے سے جواب دیا ـــــ

ـــــ "میں تمھارے ہاتھوں میں ہوں۔"

سیتا کھڑکی کے سرد شیشے سے ناک چپکائے دیر تک باہر کا منظر دیکھا کی۔

لیزلی اب انتہائی بے سری آواز میں جنوبی پلانٹیشنز کا ایک اداس نیگرو نغمہ گنگنا رہا تھا باہر چوٹیوں پر بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ دور پہاڑوں پر آبشار تیزی سے گر رہے تھے۔

نوارا ایلیا میں زمین ایک فٹ تک سیاہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سیتا کو بچانے کے لئے یہاں آکر ہنومان نے سارے پہاڑ کو آگ لگا دی تھی جب ہی سے یہ زمین جلی ہوئی ہے۔ سیتا یہیں کھوئی گئی تھی ـــــ راون نے سیتا کو لاکر اسی جگہ پر قید کیا تھا۔

دوپہر کو سیتا اور لیزلی پہاڑوں پر گھومتے پھرتے ایک آبشار کے کنارے جا پہنچے۔ "ذرا یہاں رکنا"۔ سیتا نے لیزلی سے کہا۔ آبشار سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا مندر کھڑا تھا۔ وہ کار سے اتر کر چٹانیں پھلانگتی مندر کی سمت گئی۔ لیزلی بھی کیمرہ سنبھال کر پیچھے پیچھے لپکا۔ مندر کے نیچے پہاڑی ندی کا شور مچاتا ہوا پانی بہہ رہا تھا۔ اندر سے پجاری نکلا۔ امریکن ٹورسٹ کو دیکھ کر

وہ بے حد خوش ہوا کہ آج خدائے دولت کے درشن ہو گئے۔ دس روپے سے کیا ہی کم بخشش دے گی۔

"یہ سیتا پر میشوری کا مندر ہے۔" بالوں کا جوڑا بنائے سر پہ ہاتھی دانت کی کنگھی اڑسے ایک راہ چلتا سنہالی سیتا کو بتا رہا تھا — "دیکھئے میڈم — وہ جو آبشار کے برابر میں چھوٹی سی سرنگ ہے اس کے ذریعہ سیتا کو ایلا سے کھانا لا کر پہنچایا جاتا تھا — راون یہاں سے اڑتیس میل دور ایلا میں رہتا تھا۔"

"گڈ گاڈ —" سیتا زور سے ہنسی۔ لیکن لینرلی بڑی عقیدت سے اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔

"یہ سب باتیں میری کتاب میں عوامی عقائد کے باب میں آئیں گی۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تمھاری ساری کمیونزم کے باوجود پورے ایشیا میں — ہندوستان، پاکستان، لنکا ہر جگہ عوام کس شدت سے اپنے اپنے مذاہب کے پابند ہیں اور اپنی مذہبی روایات میں کتنا اٹل اور گہرا یقین رکھتے ہیں — اب اس بے چارے غریب سنہالی مزدور کو دیکھو — یہ کتنے وثوق سے تمھیں بتلا رہا ہے کہ راون یہاں سے اڑتیس میل دور ایلا میں رہتا تھا — یہ مشرق کی لازوال طاقت ہے۔ ہنی جسے تمھاری انڈین کمیونسٹ پارٹی یا برما کے تخریب پسند یا یہاں کی اشتراکی اور ہمسفر — کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔"

سیتا چٹان پر جھک کر اس سرنگ کے اندر جھانکنے کی کوشش میں مصروف رہی جس کے ذریعے سیتا کے لئے کھانا سپلائی کیا جاتا تھا۔

لینرلی نے مندر کی نیم تاریک کوٹھری کے اندر جا کر پجاری کا انٹرویو شروع کر دیا۔ پجاری نے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ ڈاکٹر لینرلی مارش نے بڑے ذوق و شوق سے سرخ اور سفید تلک لگوایا — ماتھے پر تلک لگائے ہوئے وہ بے حد مسخرہ معلوم ہوا۔ بے چارہ — بے وقوف امریکن —

نوارا ایلیا کے اس کنٹری ہاؤس کے اس سرخ پھولدار پردوں والے کمرے میں جس کے

باہر پہاڑی گلاب کھلے تھے اور دور سے آبشاروں کی آواز آتی تھی۔ وہ چار دن تک رہے۔

(۱۳)

"____ اور ہنومان جی راکھشش کے محل کے اندر گئے مگر سیتا وہاں نہیں تھی۔ اس محل کے برابر ایک اور محل تھا جس کے اندر ہری کا مندر بنا تھا۔ یہاں وی بھی شن رہتا تھا جو ہری بھگت تھا اور اس نے ہنومان جی سے کہا ____ میں اس جگہ پر اس طرح رہتا ہوں جیسے دانتوں کے بیچ میں زبان۔

"____ رگھوپتی نے لکشمن سے پوچھا۔ بھائی تم نے جنک کی بیٹی کو جنگل میں تنہا چھوڑ دیا ____ جہاں چاروں طرف راکھشش گھومتے پھر رہے ہیں ____؟

" رام جنگل میں پوچھتے پھرے ____ پرندو، جانورو، بھنورو ____ تم نے مری مرگ نینی سیتا کو کہیں دیکھا ہے؟ ممولے، طوطے، ہرن، مچھلیاں، بجلی، کنول، خزاں کا چاند، سانپ، کام کا ترکش، بطخیں، ہاتھی، شیر، اب اپنے اپنے حسن پر دوبارہ نازاں ہو سکتے ہیں۔ سنو جانکی! بیل، کاہل، سونا اور کیلا اب خوش ہیں کیوں کہ تم جا چکی ہو۔ وہ مطمئن ہیں کہ حسن میں ان کا رقیب اب کوئی نہیں رہا۔

" رام نے جنگل سے گزرتے ہوئے لکشمن سے کہا ____ دیکھو لکشمن ____ جنگل کتنا خوبصورت ہے، کون اس کا حسن دیکھ کر مضطرب نہ ہوگا؟ جب ہرن ہماری آہٹ پر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ہرنیاں ان سے کہتی ہیں، ڈرو نہیں ____ تم تو جنم جنم کے ہرن ہو۔ لیکن یہ دونوں تو ایک سنہرے ہرن کی تلاش میں آئے ہیں ____ بھیا! دیکھو بسنت رت کتنی خوبصورت ہے۔ کام دیو سیتا کے کھو جانے کی وجہ سے مجھے اداس دیکھ کر جنگل اور شہد کی مکھیوں اور چڑیوں کی اعانت سے میرے اوپر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ درختوں پر پھیلی ہوئی بیلیں اس کی فوج کے خیمے ہیں۔ کیلے اور تاڑ کے پتے اس کے علم، پھلوں کی جھاڑیاں اس کے تیر انداز اور کوئل کی آواز گویا اس کے

جنگلی ہاتھی کی چنگھاڑ ہے۔ بگلے اور مینائیں کام دیو کے اونٹ ہیں، مور اور راج ہنس ان کے عرب گھوڑے، یاموز پرندے اور جنگلی تیتر اس کے پیادے ہیں ـــــ چٹانیں کام دیو کے رتھ ہیں، آبشار اس کے نقارے، معطر ہوائیں اس کے جاسوس۔ اے لکشمن! جو کام دیوتا کی فوج کا مقابلہ کر سکے وہ سچ مچ بڑا بیری ہے۔ کام دیوتا کا سب سے بڑا ہتھیار عورت ہے۔

"ـــــ اب سبز زمین گھاس سے اس طرح ڈھک گئی ہے کہ پگڈنڈیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ جس طرح مقدس صحیفے بدعتیوں کے مباحثوں میں چھپ جاتے ہیں۔ ابر آلود رات کے اندھیروں میں جگنو اس طرح چمک رہے ہیں جیسے ریاکاروں کا خفیہ جلسہ ہو رہا ہو۔ تھکے ہوئے مسافر ادھر ادھر اس طرح آرام کر رہے ہیں جیسے حسیات گیان حاصل کرنے کے بعد آرام کرتے ہیں۔

"لیکن لکشمن! دیکھو ـــــ ساون بیت گیا۔ خزاں آ گئی۔ زمین اب پھولوں کی نقرئی گھاس سے، اس طرح ڈھک گئی جیسے بڑھاپا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ راستوں پر بہتا ہوا بارش کا پانی اس طرح خشک ہو گیا ہے جیسے آسودگی ہوس کو ختم کر دیتی ہے۔"

(۱۴)

اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے نیچے کالیتی گنگا شور کرتی ہوئی اودی چٹانوں پر بہہ رہی تھی۔ درختوں میں پرندے رات کا بسیرا لینے سے پہلے زور زور سے چہچہا رہے تھے۔ ہرا ناریل کے جھرمٹ میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سیتا بہت دیر تک کھڑکی میں بیٹھی ندی کی تاریک لہروں کو دیکھتی رہی تھی۔ نوواراآیلیا سے واپس لوٹتے ہوئے یہاں پہنچ کر لیزلی مارشل نے اسے خدا حافظ کہا تھا اور اپنے سفر پر آگے روانہ ہو چکا تھا۔ نیووارا ایلیا میں اسے کیبل ملا تھا کہ اسے فوراً کولمبو لوٹ کر تین دن کے اندر کلکتہ پہنچ جانا چاہئے۔

سیتا نے اسے خدا حافظ کہنے کے بعد اپنے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ یہ ڈاک بنگلہ سیلون کے گھنے جنگلوں میں چھپے ہوئے باقی ڈاک بنگلوں کی مانند ماڈرن اور جگمگاتا

ہوا نہیں تھا۔ اس کا فرنیچر بھی دقیانوسی تھا۔ فرش پر مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سنگھار میزوں کے آئینے بہت دھندلے تھے۔ کوئی اور غیر ملکی سیاح اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ سارے ریسٹ ہاؤس میں بالکل تنہا تھی۔ امریکن ایکسپریس کا ڈرائیور کار کو گیراج میں بند کرنے کے بعد شاگرد پیشے کی طرف جا چکا تھا۔ کھانا کھلاتے وقت بیرے نے دانت نکوس کر اس سے کہا تھا "میڈم ——! برج اوّن رِوَر کوائی کی شوٹنگ اسی جگہ پر ہوئی تھی۔ وہ سامنے وادی گھاٹی جس میں گنگا بہہ رہی ہے وہ برج اسی پر بنایا گیا تھا ——! الیک گنس اور ولیم ہولڈن اور سب بڑا بڑا ایکٹر اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ بڑی رونق رہی تھی —— میڈم !!" تو اس اطلاع سے بھی وہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ کمرے میں جا کر کھڑکی میں بیٹھی رہی تھی اور اس کے بعد روشنی بجھا کر پلنگ پر لیٹ رہی تھی۔ کل صبح اسے کولمبو واپس جانا ہے۔

رات گہری ہوتی گئی —— رات جو چندن کے جنگلوں میں آوارہ تھی، لونگ اور الائچی کی جھاڑیوں میں سو رہی تھی۔ رات کینڈی کے مندر کی سیڑھیوں پر بکھرے ہوئے سفید پھولوں میں لیٹی تھی۔ رات کالینی گنگا کے کنارے دریائی گھاس میں سانپ کی طرح سرسرا رہی تھی۔ رات جو تاریک جنگلوں میں چھپے ہوئے ڈچ اور پرتگالی گرجاؤں کی طرح خاموش تھی۔ رات جو ندی کی تہہ میں سنگلاخ چٹانوں پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ رات جو کینڈی کے شاہی ہاتھیوں کے شاہی مہاوت کی طرح باوقار اور مغرور تھی۔ رات جو مہاویلی گنگا میں نہانے والے ہاتھیوں کی طرح سیاہ فام اور سست رو تھی۔ کینڈی میں ٹارچ لائٹ جلوس نکل رہا ہے۔ بدھ کے دانت کا جلوس۔ بدھ کا دانت سونے چاندی میں مستغرق ہاتھی کے جگمگاتے ہودے کے اندر ہیرے جواہرات کے صندوقچے میں رکھا ہوا ہے۔ گھاس پر لیٹا ہوا بدھ دانت نکوسے ہنس رہا ہے۔ اس نے نقلی دانت لگا رکھے ہیں۔ مہاتما بدھ کے دانت کھانے کے اور ہیں دکھانے کے اور۔

رات جو ہنٹروں کی آواز ہے، بانسری کی آواز، بیگ پائپ کی آواز، ستاروں کی آواز۔ پریام میورہ پرتی نرتیتی —— مور اپنی محبوبہ کی طرف ناچتا ہوا جا رہا ہے، پریام ——

ارے میں تو ساری زبانیں بھول گئی، بھلا میں کتنی زبانیں جانتی ہوں ــــ؟ ایک بھی نہیں میں بالکل گونگی ہوں۔

الفاظ کے بادشاہ ــــ اے الفاظ کے بادشاہ ــــ وانی اور وِنایک کو میرا پرنام۔ جنھوں نے الفاظ اور ان کے معانی ایجاد کئے۔ میں وِساکھ دت ہوں مہاراجہ بھاسکر دت کا بیٹا۔ میرے سر پر بادلوں کی گھن گرج ہے۔ میرا پریتم بہت دور ہے۔ یہ کیا ہوا ــــ؟ ارے یہ بھی یہ کیا ہوا ــــ؟ امر بوٹیاں برفیلے پہاڑوں پر ہیں۔ اور سر پر کنڈلی مارے ناگ بیٹھا ہے، کنڈلی مارے ناگ۔

ابو الحماقت قمرالاسلام چودھری نے مجھے چنڈی داس کا وہ کون سا گیت سنایا تھا؟ "رات اندھیری ہے اور بادل گھرے۔ تم ایسی رات میں کیسے آسکے؟ وہ پھول بن میں کھڑا بارش میں بھیگتا ہے، میری ساس نندیں بہت ظالم ہیں۔ چنڈی داس کہے ــــ سکھی ری ــــ سکھی ری ــــ

اور مہا بدھو پادھیائے شری پرو جیش کمار چودھری نے ودیا پتی کے کون سے گیت کے معنی بتائے تھے ــــ؟ رادھا کی نیم باز آنکھوں کی پتلی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول پر بھنورا بیٹھا ہو ــــ ہاہاہا ــــ اور ہوا کے جھونکے زور سے پنکھڑیوں کے اندر سرک جاتے ہیں ــــ نہانے کے بعد اس کی آنکھیں کاجل لگا کر ایسی لگتی ہیں جیسے کنول پر سیندور لگا ہو ــــ اور ــــ

ای ای ک ــــ ای ای ک ــــ

ــــ اور وہ رات کو شب رنگ ساری پہن کر کرشن سے ملنے جاتی ہے۔

اجی سنا دے سنا دے کرشنا، تو بنسری کی تان سنا دے کرشنا۔ آں آں آں ــــ سنا دے ــــ

راماین میں لکھا ہے تلسی داس جی نے، کہ نوجوان عورت شعلے کی لو کی مانند ہے۔ اے آتما! تو اس کا پروانہ نہ بن ــــ مگر کوئی الّو کا پٹھا تلسی داس جی کی بات نہیں سنتا۔

رتن پورہ میں اگر مجھے وہ چنتامنی ہیرا مل جائے جو ساری خواہشیں پوری کر دیتا ہے۔
سری لنکا کے سارے پہاڑ ترچھے ہو گئے۔
خدا کرے خزاں جو وشنو کے جسم کے مانند زرد ہے
تمھاری مشکلیں دور کرے
گہرے پانی ہیبت ناک مچھلیوں کے تیرنے سے مضطرب ہیں۔
تمھارا حکم تازہ پھولوں کے گجرے کے مانند
میں نے اپنے سر پر لیا ہے۔
بیلا پھوٹے آدھی رات گجرا میں کئے کئے گرے ڈاروں —— ارے بھائی گجرا میں کئے کئے گرے ڈاروں۔
مہاراج کی جے ہو۔ ایک شخص جس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا۔ ایک خط کے ساتھ ہمارے کیمپ سے فرار ہونا چاہتا تھا —— اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔
تھرڈ ڈگری کس طرح کیا جاتا ہے؟ تھرڈ ڈگری ایف۔ بی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے۔ ایل۔ ایم۔ پین امریکن۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل۔
پتیوں سے عاری درخت اس طرح کھڑے ہیں جیسے کسی کی ارتھی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔
اب میں شمشانوں میں جا کر پریت منتر جگاتی ہوں۔ جے کالی کلکتے والی۔ ماری پور کے راستے میں شمشان گھاٹ تھا۔ اس میں بے چارے مسلمان ریفیوجیوں نے جھونپڑیاں ڈال لیں۔
جے کالی کلکتے والی۔
کائنات کی ابتدا کا اسرار کالی کے جسم کے مانند تاریک ہے شفق کی سرخی کالی کا غیض ہے۔ طوفان اور وبائیں اور موت اس کے ساتھی ہیں —— ہم بنگال والے صدیوں سے کالی کے قہر کا تماشہ دیکھ رہے ہیں —— شری پردجیش کمار چودھری کا اسٹیٹمنٹ ٹو دی پریس ——

بوگس ایکسپریشنسٹک تصویریں بنانے والا ـــــ بوگس بوگس بوگس ۔ کالی کا تصور ایکسپریشنسٹک ہے ۔ بوگس ۔

میری ریکھا کھانچی بالکل بے کار گئی ۔

انسویا نے کہا، سنو راج کماری ۔

تقدیس ، پتی ورتا ، معصومیت ، وفاداری ۔ ہائے ہائے ۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمن ـــــ کامریڈز پائیوتے بہنو ـــــ ! آپ سب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سیتا آج کی دنیا کے خوفناک جنگل میں کھوگئی ۔ اس سیتا کو آج کی دنیا کا راون اڑا کے لے گیا ۔ حضرات ! یہ آج کی دنیا جو دو کیمپوں میں بٹی ہے ۔ اینگلو امریکن سامراج کی شکار دنیا جس میں معصوموں کو تھرڈ ڈگری کیا جاتا ہے تو انھیں کوئی ہنو مان بچانے نہیں آتا ـــــ لتا ڈیر مائیکروفون فیل ہوگیا ـــــ ارے کیلاش ناتھ ماتھر ـــــ ذرا کرنٹ تو منگاؤ جلدی سے ـــــ ہاں تو حضرات میں کہہ رہی تھی کہ آج کی دنیا میں جہاں ہائیڈروجن بم کے راون اپنے بان سے شہروں کو آن کی آن میں بھسم کرنے والے ہیں ۔ جہاں ایشیا اور افریقہ کی سیتائیں اغوا کرلی جاتی ہیں ـــــ اے راماین پڑھنے والے بگلہ بھگتو ـــــ تم نے ۱۹۴۷ء میں کتنی مسلمان سیتائیں اڑائی تھیں ۔ ذرا ان کا حساب لگاؤ ـــــ اور اے یزید اور شمر پر لعنت بھیجنے والے مسلمان مجاہدو ـــــ تم ـــــ جو ـــــ

سیتا میر چندانی ـــــ رول نمبر ۹۶۳ ـــــ ؟

یس پلیز ـــــ

جی ہاں میرا ہی نام سیتا ہے ۔

آمار سہنیر ـــــ آمار پریو سیتا ۔

ہائی سیتا ـــــ ہنی ـــــ

سیتا میری جان ۔

جان من ۔

سیتا ڈارلنگسٹ۔
بتاؤ تمھاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟
میری خواہش؟ وہی کہ سری لنکا کے جواہرات کے شہر رتن پورہ کے سارے ہیرے مجھے مل جائیں۔ پھر دیکھو تم سب کا کیسا بیڑا کرتی ہوں ——
ہائے ہائے میں بڑی سخت پٹی بورژوا ہوں۔
ہلو ہلو —— آوازیں —— کیسی کیسی آوازیں۔ ٹیلی فون کے تاروں کی جھنجھناہٹ۔ ریل کے پہیوں کی چھک چھک چھکا چھک —— موٹر بوٹ کی گھڑ گھڑ، طیارے کے انجن کی زوں زوں گھوں گھوں، شائیں شائیں ٹائیں ٹائیں فش۔ چیں پٹاخ، ریں ریں —— رواں رواں دھائیں دھائیں چھُوا چھُو —— دھوبی کی آواز —— بلقیس بٹیا لادی لے لیجئے —— بیگم صاحب آج کیا کیا پکے گا۔ تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار۔
ڈول۔ بنارس کے مندروں کی روشن چرکی۔ قیصر کی برات کا بینڈ۔ راجہ کی آئے گی برات۔ سنڑے کے سنڑے —— محرم کا تاشہ —— جعفر باندی کا نوحہ —— ارے بلبل کو گل پسند، گلوں کو ہوا پسند —— ہم بوترابیوں کو ہے خاکِ شفا پسند —— تجھ کو ارم پسند ہمیں کربلا پسند ہمیں کربلا —— ہمیں کربلا پسند —— راون جلتا ہے، سیتا جلتی ہے، لنکا جل کر راکھ ہوگیا۔
یہ راہل ہنسا؟ راہل کی ہنسی، جمیل کا قہقہہ، شراب کے گلاسوں کی کھنکھناہٹ۔ دو بوڑھے میاں بیوی جو بروک لِن برج پر کھڑے چپکے چپکے کسی بات پر ہنستے تھے، بچّوں کی طرح مسرور ——
میں مرجاؤں گی —— موت —— اور میری ٹانگیں ہیم کی اور کر دی جائیں گی تاکہ میری آتما ناؤ میں سوار ہوکر سندھ مہاساگر پر سے گذر سکے۔ چتا کے شعلے، موم بتیاں، تازہ پھول، قبر کی تازہ مٹی، تلسی پور کا قبرستان، جہاں جمیلہ باجی کو دفن کرنے لے گئے تھے۔ ارے جمیلہ باجی کون تھیں ——؟ اور ان کے میاں جو دھائیں دھائیں، سوں سوں، بھوں بھوں رہے تھے۔ بلقیس نے بتایا کہ اسی سال دوسری شادی رچانے کی فکر میں لگ گئے۔ سوائین —— آل من آر

سوائین ۔

جمیل ڈارلنگ میں اب بھی رات میں اکثر وہی پریشان خواب دیکھتی ہوں کہ میں ایم۔ اے۔ کا پرچہ کر رہی ہوں جو کسی ایسی زبان میں لکھا ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تین گھنٹے پورے ہونے والے ہیں ـــــ دو گھنٹے ـــــ ایک گھنٹہ ـــــ بیس منٹ ـــــ پانچ منٹ ـــــ ایک منٹ ـــــ

GIVE ME FIVE MINUTES MORE

ONLY FIVE MINUTES MORE

ONLY FIVE MINUTES MORE OF YOUR CHARM

GIVE ME FIVE MINUTES MORE

IN — YOUR — ARMS

ہاتھی کی شکل کی چٹان ـــــ اونچی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کرو تو پاؤں رپٹ جاتا ہے۔ میں سگریہ سے بھی اونچی چٹان پر جا کر چھپوں تب بھی پکڑی جاؤں گی۔

آپ کی تعریف ـــ؟

جی میں ـــ؟ مسز بیچ لکژری ہوٹل ۔

اور آپ ـــ؟ شری اشوکا ہوٹل ـــــ؟ پدھاریئے پدھاریئے ۔

انڈیا ڈیٹ از بھارت نے مہاراج دھیراج اشوک کے ستون دریافت کئے ۔ اشوک چکر دریافت کیا۔ اشوکا ہوٹل دریافت کیا۔

اور آپ کی تعریف ؟

یہ میری نند ہیں ۔ نند بجلی بسنت ۔ بلقیس انور علی ـــــ نمبر ون ایکٹریس پروڈیوسر انٹلکچوئیل ـــــ اے جمنی بیگم ـــــ امراؤ بیگم ـــــ کھیتو بیگم ـــــ سب جتنے

ادھر آؤ۔ اے یہ کاگا نو جن کیا مچی ہے۔ جمیل کی دلہن اپنی ایڑی دیکھو کہیں نظر نہ لگ جائے۔ تم پر ٹپکی پڑے بھوری بیگم ایسا پائینچہ بھاری کر کے بیٹھیں کہ بس آئیں دو گھڑی کے لئے جُھدا اتارنے ـــــ بُندی بوا ـــ اے بُندی بوا کل سے جمیل بھیا کا پنڈا پھیکا ہے۔ میرے دل کو تو پنکھے لگ رہے ہیں۔ رات میں نے مولا مشکل کشا کے نام کا روپیہ دھو کے اٹھایا ـــ اور سنو کیا کیا کھیتو بیگم نے بُندی نگوڑی پہ تو تیے جوڑے جیسے خود تو بڑی ست ونتی بیوی ہیں ـــ عروج کی دلہن بڑی دھونتال ہیں۔ ان کے بھرے میں بھی نہ آیئے گا اماں ـــ وہ کسی کو کیا کھلائیں گی ـــ ماگھ ننگی بیسا کھ بھوکی ـــ رات مولا مشکل کشا خواب میں تشریف لائے۔ جمیل بھیا ـــ اے جمیل بھیا ـــ

AM A COW

مسٹر سینڈ ٹین ـــ مسٹر سینڈ ٹین ـــ میرے جی کے ورندا بن میں۔

IN MY LITTLE CORNER OF THE WORLD

TONIGHT MY LOVE ـــ TO NIGHT MY LOVE.

بدھ سمادھیوں پر رات اتر آئی ہے۔

اے یہ رات نے مجھ پر پھر حملہ کر دیا ـــ؟

ہوا کتنی تیز ہو گئی۔

ہوا پرا کرم سمدر پر بہتی آرہی ہے۔ کالینی گنگا پنہ بہہ رہی ہے۔ کولمبو کی سمت پھُسر پھُسر روتی ہوئی رواں ہے۔ ہوا۔

ہوا۔

چاند۔

چاند صندل کی ڈالیوں پر ستا ہے۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں جو پرانی کاٹوں میں سو رہے ہیں۔ صدیوں کی نیند ہے ـــ ڈون فرینینڈیز ڈی کوسٹا سمر سنگھا رونا مدلیار۔ رتن سنگھ جے سوریہ۔

گن پال گن وردن۔ ان کی آنکھوں میں جنگل کی نیند ہے۔ زرہ بکتر پہنے پرتگالی ڈچ قلعوں پر حملہ کرنے جارہے ہیں۔ انگریز پلانٹرز کی روحیں مہامنیا کی سڑک کے کنارے کھڑی امریکن سیاحوں سے مکھن چینی مانگ رہی ہیں۔ چاندا ب مہادیلی گنگا میں نہارہا ہے۔ ہاتھی جو ہزاروں برس کی جنگل میں مقید روحیں ہیں۔

چاند۔

رات۔

رات سیتا مہارانی کے بال ہیں۔ رام رگھورائے کا سانولا بدن ہے۔ کالی کا چہرہ ہے۔ تخلیق سے پہلے کی تاریکی۔ ہم سب ہر وقت اسی تخلیق سے پہلے کی تاریکی میں مقید ہیں اور سمجھتے ہیں بڑا ایوولیوشن ہوگیا۔ سیاہ۔ سیاہ۔ سیاہ۔ رات

میں نے اپنی نیند نیویارک میں کھودی۔ جنگلوں میں تاڑ کے سیاہ درخت اونچے ہوکر سرخ آسمان سے جالگے۔ لنکا تلک کا کھنڈر دانت نکالے ہنستا ہے ــــ ہی ہی ہی ــــ کنول کا تالاب بے خواب آنکھ کی طرح کھلا ہوا ہے ــــ لیلاوتی ــــ روپ وتی ــــ سیتاوتی ــــ

رن کوٹ و پہار کے ستوپ میں ہڈیاں ایک دوسرے سے انٹرنیشنل سچویشن پر گفتگو کررہی ہیں۔ پراکرم باہو اوّل ایشیا میں کمیونزم کا پانچواں باب لکھ رہا ہے۔ جنگل نے مجھے کھالیا۔

میرے گہنے کیسے کیسے تھے جو بڑی خالہ مجھے رونمائی میں دیئے۔ دلہن کے گہنے ــــ رتن پورہ کے سنار جڑاؤ چندن ہار بنا رہے ہیں۔ روشنی ــــ روشنی ــــ چمک چمک چمک ــــ جنگل کی آوازیں، چڑیوں کی، سمندر کی، سڑکوں کی، ہار بر کی، پہاڑوں کے سناٹے کی آوازیں۔

آواز ــــ

صرف ایک ہے۔

یہاں آؤ ــــ میرے پاس آؤ ــــ میرے پاس آؤ ــــ آؤ ــــ

(۱۵)

"میں ابھی ابھی آکر پہنچی ہوں — کیا نیوز ہے —؟" سیتا نے ماؤنٹ لیونیا میں اپنے کمرے سے شام کے وقت فون کیا۔

"اوہ — ہلو سیتا —! تم آگئیں !! ہاؤ ونڈرفل — اجازت ہو تو اوپر تمھارے کمرے میں آجاؤں"۔

"آیئے —"

وہ پانچ منٹ بعد کمرے میں موجود تھا — "تم تو بے حد بشاش معلوم ہو رہی ہو۔ جنگل کی ہوا نے تم پر بہت اچھا اثر کیا۔ آئی ایم سو گلیڈ!"

"بیٹھئے —"

وہ پہلی دفعہ اس کے کمرے میں آیا تھا اور ذرا گھبرایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کا ایک چکر لگا کر وہ کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا، وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی نٹنگ میں مصروف رہی۔

"کیا بُن رہی ہو؟"

"راہل کے لئے سوئٹر کوٹ — میں نے سوچا تھا مکمل کر کے جمیل کو دوں گی کہ لے جا کر راہل کو دے دیں — مگر مجھے معلوم ہی نہیں اب وہ کتنا بڑا ہے۔ پتہ نہیں۔ یہ اسے آئے گا بھی یا نہیں۔ اٹکل سے بُن رہی ہوں"۔

وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا — "اور بتاؤ — پھر کیا ہوا؟"

"پھر —؟ پھر —" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم ایک ہفتہ بے طرح یاد آئیں۔ کانفرنس میں کسی طرح جی نہ لگا میرا — نہ جانے رپورٹ میں کیا انٹ سنٹ لکھ کر آیا ہوں — تمھارا سفر بہت دلچسپ رہا —؟"

"بہت دلچسپ ــــ" اس نے سلائیاں تبدیل کیں۔
"امریکن بڑھیاں کیسی تھیں؟"
"امریکن بڑھیاں تو نہیں ایک امریکن ٹورسٹ پولونرواسے ساتھ لگ گیا تھا اور وہ بوڑھا نہیں تھا۔"

BITCH ــــ عرفان نے یک لخت زیرلب کہا اور چپ ہو گیا۔
"آپ نے اپنی عادت کے مطابق پوچھا نہیں کہ پھر کیا ہوا ــــ" چند لمحوں کی مکمل خاموشی کے بعد سیتا نے پوچھا۔
"تم خود ہی بتاؤ ــــ"
"ار ــــ وہ امریکن آرکیالوجسٹ تھا۔"
"پھر تو تم نے خوب اس کے ساتھ لنکا کی تاریخ ڈسکس کی ہوگی ــــ جیسے تم نے مجھے سندھ کی ہسٹری پڑھائی تھی۔"
"ہاں ــــ" وہ بے تعلقی سے نٹنگ میں مشغول رہی۔
وہ کچھ دیر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر یکبارگی آگ بگولا ہو کر صوفے سے اٹھا۔ اس کے ہاتھوں سے سلائیاں اور اون جھپٹ کر ایک طرف پھینکی اور اسے کھینچتا ہوا دریچے میں لے گیا۔
"تاریخ ڈسکس کرنے کے علاوہ اور کیا ہوا ــــ؟" اس نے گرج کر پوچھا۔
وہ سفید پڑ گئی۔
"میں پوچھتا ہوں اور کیا ہوا ــــ بولتی کیوں نہیں؟"
دفعتاً وہ غصے سے سرخ ہو گئی ــــ "شٹ اپ ــــ آپ کو اس طرح کے سوال کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ حد سے آگے بڑھے جاتے ہیں۔"
وہ ہونٹ کاٹتا رہا ــــ "حق تو تمہارے اوپر قانونی شوہر کا بھی کچھ نہیں ہے جسے چھوڑ کر

تم دو سال سے رنگ رلیاں منا رہی ہو ــــ"

"شٹ اپ عرفان ــــ" وہ پوری قوت سے چیخی ــــ "گیٹ دی ہل آؤٹ آف ہیر ــــ گیٹ آؤٹ ــــ گیٹ آؤٹ ــــ ورنہ میں ابھی ــــ میں ابھی گھنٹی بجا کر بیرے کو بلاتی ہوں ــــ" وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

ایک لمحے تک وہ ساکت کھڑا اسے تکتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم رکھتا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دروازے کے باہر جا کر اس نے بڑی نارمل اور نیچی آواز میں سکون کے ساتھ کہا ــــ

"بڑی کوششوں کے بعد جمیل نے ملاقات کا وقت دیا ہے۔ آخر کار وہ آج رات کو ملنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ میں ان سے گال فیس ہوٹل میں ڈنر پر ملاقات کر رہا ہوں ــــ اس کے بعد ان کا جواب تم تک پہنچا دوں گا۔ ــــ گڈ نائٹ ــــ"

رات کو بارہ بجے کے بعد اس کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی دیر تک بجتی رہی مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔

(۱۶)

وہ رات بھر روتی رہی تھی۔ اتنا وہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اس رات بھی نہیں روئی تھی جس کی صبح وہ اور اس کے خاندان والے کراچی سے کاٹھیاواڑ روانہ ہوئے تھے یا جب نیویارک میں جمیل نے اسے اس کے گھر سے باہر نکالا تھا۔ قرول باغ میں وہ اکثر راتوں کو جاگ کر راہل کے لئے چپکے چپکے رویا کرتی تھی اور صبح صبح آنگن میں لگے ہوئے نلکے پر جا کر آنکھوں پر خوب اچھی طرح چھپکے مارتی تھی تاکہ اس کے باپ کو اس کے الم کا پتہ نہ چلنے پائے۔ مگر اس وقت ماؤنٹ لیونیا کے اس خوبصورت کمرے میں اس کے آنسو دیکھ کر پریشان یا رنجیدہ یا پشیمان ہونے والا کوئی نہ تھا اس لئے وہ اطمینان سے بستر پر لیٹی رہی۔ اس کے سامنے سارا دن، ساری زندگی، ساری دنیا

خالی پڑی تھی۔ بھیانک تاریک خلا کا طوفانی سمندر جس کا کہیں پر کوئی کنارا نہ تھا آٹھ بجے کے قریب بیرہ ناشتہ لے کر آیا۔ مہربان، شفیق مسکراہٹ والا بوڑھا سنہالی جو اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر متفکر نظر آیا کیوں کہ وہ بھی دو جوان بیٹیوں کا باپ تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

دس بجے کے قریب تیار ہو کر اس نے ریزرویشن کے لئے ہوائی جہاز کے دفتر فون کیا اور نیچے ٹیرس پر اتر آئی۔ سمندر پر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چمک آنکھوں کو بری لگ رہی تھی۔ ساحل پر چند انگریز بچے ریت کے قلعے بنانے میں مصروف تھے۔ بہت دور مونگوں کے ہار بیچنے والی عورت سر جھکائے ایک سمت کو جا رہی تھی اور گیلی ریت پر اس کے پیروں کے نشان بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ دن بڑا اجاڑ تھا۔ سارا ماؤنٹ لیونیا، سارا کولمبو، ساری دنیا اجاڑ تھی۔ اجاڑ اجاڑ اجاڑ۔

چند منٹ ریلنگ کے سہارے کھڑے رہنے کے بعد اس نے طے کیا کہ دوپہر تک شہر کا چکر لگاتی رہے اور پیکنگ کرنے کے بعد وقت سے بہت پہلے ہی ایرپورٹ چلی جائے۔ اسی وقت ہال پورٹر نے آ کر اس سے کہا کہ ریسپشن میں اس کے لئے فون رکھا ہے۔

—— ہوائی جہاز کے دفتر نے اسے اطلاع دی تھی کہ مختلف کانفرنسوں میں آئے ہوئے مندوبین واپس جا رہے ہیں اس لئے تین دن تک جگہ ملنا بڑا مشکل ہے۔

اس نے بیگ کھول کر ٹریولرز چیک کے کتابچے پر نظر ڈالی۔ چیک ختم ہونے والے تھے۔

"میڈم آپ نے کیلانیا مندر دیکھ لیا——؟" ریسپشن کلرک نے اس سے پوچھا۔

"نہیں اب جا کر دیکھوں گی ——" اس نے چونک کر جواب دیا اور باہر چلی گئی۔

ڈرائیو پر آ کر اس نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ سے بلایا۔

"کیلانیا ٹمپل ——"

"سوری میڈم ——" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"کیوں ــــ ؟"

"شاید کرفیو لگ جائے۔ شہر میں ٹامل سنہالی جھگڑے کا اندیشہ ہے۔"

او مائی گاڈ ـــ وہ ایک درخت سے ٹک گئی ـــ یہاں بھی

اب کیا کروں ـــ ؟

یکایک اسے رتن سنگھ جے سوریہ کا خیال آیا۔ اس اجنبی ملک میں وہ عرفان اور لیزلی مارش کے علاوہ صرف تیسرے آدمی جے سوریہ سے ملی تھی۔ شاید وہ کوشش کرکے ہوائی جہاز میں جگہ دلوا دے۔

اندر لوٹ کر اس نے جے سوریہ کو فون کیا۔ اس وقت جے سوریہ کے اخبار کے دفتر میں ایک ہنگامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اس کی آواز سن کر کافی متعجب ہوا۔

"ہلو ـــ ہلو ـــ ڈاکٹر میر چندانی! ـــ کیسے یاد کرلیا؟"

اس نے ریزرویشن کے متعلق پوری بات بتائی۔

"اوہو ـــ سنئے ـــ اس وقت میں بیحد مصروف ہوں ـــ آپ نے صبح کا اخبار پڑھ لیا ہوگا ؟"

اس نے صبح کا اخبار نہیں پڑھا تھا۔

"اگر آپ ہی زحمت کرکے یہاں چلی آئیں ـــ مسٹر عرفان کب واپس جا رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں ـــ"

"اوہ ـــ اچھا آجائیے ـــ میں آپ کا منتظر ہوں۔"

اخبار کے دفتر میں ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ ٹیلی پرنٹرز اور ٹائپ رائٹروں کی لگاتار کھٹ کھٹ، سب اڈیٹروں اور رپورٹروں کی بھنبھناہٹ اور ٹیلی فون ایکس چینج پر بیٹھی ہوئی کالی لڑکی کی بے انتہا مصنوعی شیریں آواز میں یکساں ـــ "لنکا دیپ ـــ گڈ مارننگ" کی تکرار

نے اس کی دل کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد چیف اڈیٹر نے اسے اندر بلوا بھیجا۔ وہ ہال سے گذرتی ہوئی جے سوریہ کے کیبن میں داخل ہوئی۔

وہ ایک لمبے چوڑے ڈیسک پر بیٹھا دو ٹیلی فونوں پر بیک وقت بات کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں انٹرکوم پر کچھ بولتا بھی جاتا تھا۔ وہ کونے میں رکھی ہوئی کرسی پر ٹک گئی۔ جے سوریہ نے ایک طرف کا ٹیلی فون بند کرتے ہوئے گھومنے والی کرسی اس کی طرف ذرا سی پھیر کر اسے ایسی عجیب نظروں سے دیکھا کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگئی ـــــ ڈرٹی اولڈ مین ـــــ اس نے شدید کراہت کے ساتھ زیرلب کہا۔ جے سوریہ نے دوسرا ریسیور بھی ہاتھ سے رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

"گڈ مارننگ ڈاکٹر میر چندانی ـــــ اجازت دو تو تمھیں سیتا کہہ کر پکاروں ـــــ آرام سے بیٹھ جاؤ ـــــ کل رات عرفان نے ساری بات بتائی۔"

دوسرے فون کی گھنٹی بجی اور اس نے فوراً اس پر سنہالی میں گفتگو شروع کر دی ـــــ سیتا کو چکر آگیا ـــــ اس نے مضبوطی سے کرسی کا ہتھا پکڑ لیا اور چند لمحوں کے لیے سر جھکا کر آنکھیں بند کرلیں ـــــ کیوں نہیں زمین پھٹتی کہ میں اس میں سما جاؤں ـــــ مگر چونکہ یہ سیتا اور ساوتری کی دنیا نہ تھی، کالی یگ تھا، اس لئے نہ زمین پھٹی نہ سیتا اس میں سمائی۔ دوسرے لمحے اس نے پرس سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ جلایا۔

جے سوریہ فون پر بات ختم کرکے اس کی طرف مڑا ـــــ "اوہ معاف کرنا ـــــ میں نے تمھیں سگریٹ پیش نہیں کیا" ـــــ اس نے سیتا کو ذرا غور سے دیکھا ـــــ وہ بے انتہا سفید نظر آرہی تھی ـــــ اس بے چاری کے اعصاب ضرورت سے زیادہ کمزور ہیں۔ اس نے دل میں سوچا پھر اس سے کہا "گھبراؤ مت ـــــ میں عرفان کا پرانا رازدار ہوں۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ وہ اور میں کئی سال تک جرمنی میں اکٹھے رہے ہیں ـــــ اس وقت تم بہت چھوٹی سی رہی ہوگی ـــــ" اس نے ایک بار پھر سیتا کو انھی لرزہ خیز نظروں سے دیکھا ـــــ "عرفان کی نجی اور جذباتی زندگی کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں ـــــ تمھارا راز بھی میرے پاس محفوظ رہے گا ـــــ

بعض دفعہ جرنلسٹوں پر بھی بھروسہ کیا جاتا ہے !! — اچھا — اب ایک خوش خبری سن لو — آج کرفیو نہیں لگ رہا ہے — کافی پیو گی — ؟" اس نے گھنٹی بجائی ۔

" نہیں — شکریہ —" سیتا کو اپنے سارے وجود سے انتہاء نفرت محسوس ہوئی ۔ میں یہاں کیوں آئی ؟

" میں — ذرا — وہ — ہوائی جہاز کی سیٹ —" اس نے شدید نقاہت کے ساتھ کہا ۔

" شیور — شیور — مائی ڈیر — مجھے فوراً کل کا ایڈیٹوریل لکھنا ہے — اپنے سکریٹری سے کہتا ہوں ۔"

وہ انٹرکوم کی طرف جھکا —" رتنا ذرا مارٹن کو بھیج دو — اور تم بھی آؤ —"

دوسرے لمحے اس کی سنہالی سکریٹری اور کلرک اندر آئے ۔ ان کے پیچھے نیوز ایڈیٹر لپکا ہوا آیا اور ڈیسک پر جھک کر اس سے جلدی جلدی کچھ کہنے لگا ۔

ایک بار پھر جے سوریہ سیتا کی موجودگی فراموش کر کے اپنے کام میں منہمک ہو گیا ۔ وہ چند لحظوں تک بیٹھی چھت کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی — اس کمرے میں گھنگھریالے بالوں اور گہری سانولی رنگت کا ایک ٹامل نوجوان کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے سڑک پر ٹریفک دیکھ رہا تھا — شاید وہ بھی جے سوریہ سے ملاقات کا منتظر تھا ۔ سیتا نے زینے کی طرف جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جے سوریہ کی سکریٹری اسے بلانے کے لئے دوڑی آئی اور اسے دوبارہ کیبن میں جانا پڑا ۔ اتنے میں جے سوریہ نے انٹرکوم پر کہا ۔" رتنا — مسٹر رتنا سوامی کو آنے دو ۔"

پردہ اٹھا اور وہی ٹامل نوجوان کمرے میں داخل ہوا ۔ اس نے متبسم نظروں سے سیتا کو دیکھا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا ۔

اپنے اسٹاف سے باتیں کرتے کرتے کرسی سیتا کی طرف گھما کر جے سوریہ نے کہا —" سیتا یہ میرا بے حد شریر نوجوان دوست راما سوامی ہے ۔ ہمارے ملک کا شعلہ بیان کالم نگار ہے ۔ ہمارے

مخالف اخباروں کے لئے لکھتا ہے لیکن مجھ ایسے فرقہ پرستوں سے بھی کبھی کبھار مل لیا کرتا ہے۔ بیٹھو —— رام ——! ہماری ہندوستانی مہمان ڈاکٹر میر چندانی سے ملو —— ہندوستانی ہونے کے ناتے ممکن ہے یہ تمھاری ہم خیال نکلیں ——!" اس تعارف کے بعد جے سوریہ پھر اپنی گفتگو میں منہمک ہو گیا۔

راما سوامی نے سیتا کو نمستے کیا اور بڑی شائستہ بے تکلفی سے اس سے باتیں کرنے لگا۔ کیا وہ بمبئی سے آئی ہے ؟ اچھا! دہلی سے —— وہ بھی دہلی میں نامہ نگار کی حیثیت سے کئی سال رہ چکا ہے —— دہلی میں وہ فلاں فلاں صحافیوں کو جانتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا آدھا خاندان مدراس میں رہتا ہے مگر وہ خود "اوورسیز انڈین" ہے۔

اور اس وقت دفعتاً ایک بڑی انوکھی بات ہوئی —— اجنبی سنہالیوں کے مجمع میں گھرے ہوئے سیتا نے اپنے ہم عمر اس ٹامل نوجوان کے لئے ایک عجیب سی یگانگت محسوس کی —— جس طرح صدیوں پرانے ابدیت پرست پولونروا کے سنسان کھنڈروں کے درمیان اس نے جدید انسان —— لیزلی مارش —— کے لئے اس جذبے کو محسوس کیا تھا —— کیوں کہ وہ اس کی مانوس بیسویں صدی کی، مغربی مادہ پرست دنیا کا ایک فرد تھا —— پولونروا ابدیت تھی، ڈاکٹر لیزلی ونسنٹ مارش تاریخی وقت —— جس طرح اس لیزلی مارش کے مقابلے میں پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ہوئے بالوں کے جوڑے بنائے اور سیرونگ پہنے سنہالی کسان مردوں اور عورتوں کے لئے یگانگت محسوس کرتی تھی کیوں کہ وہ اس کی اپنی تہذیب کا ایک حصہ تھے۔ اور لیزلی مارش غیر ملکی مسیحی مغربی انسان تھا —— جس طرح ماؤنٹ لیونیا کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے فیشن ایبل مردوں اور عورتوں کے مقابلے میں پاکستان سے آیا ہوا عرفان بالکل اس کا اپنا معلوم ہوتا تھا کیوں کہ اس کے برصغیر کا رہنے والا تھا۔ اس کی تہذیب کا ایک حصہ تھا —— انسان اپنی پیچیدہ زندگی میں بیک وقت کتنی مختلف اور متضاد سطحوں پر زندہ رہتا ہے۔

اب راما سوامی بھی جے سوریہ کے ساتھ کسی بحث میں الجھ چکا تھا۔ کیبن میں باتوں کا

شور بڑھ گیا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اچانک بے انتہا متوحش ہو کر وہ کیبن سے باہر نکلی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گئی۔

دوکانوں کے سامنے برآمدے میں بلا مقصد ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ کتابوں کے اسٹال پر جا کھڑی ہوئی اور اسٹال والے سے آئی۔اے۔سی۔ کے دفتر کا پتہ دریافت کیا۔

"چلئے میں آپ کو وہاں پہنچا دوں۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راما سوامی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"شکریہ —— مجھے صرف پتہ سمجھا دو، میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"تمھارے چلے آنے کے بعد مسٹر بج سوریہ بہت پریشان ہوئے کہ تم کہاں غائب ہو گئیں۔ مگر اس ٹامل سنہالی کرائسس کی وجہ سے وہ اتنے چکرائے ہوئے ہیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اس وقت جب تم اٹھ کر چلی آئیں وہ فون پر اپنے بڑے بھائی سے بات کر رہے تھے جو کابینہ میں وزیر ہیں۔ آج ان کی وزارت بھی خطرے میں ہے۔"

وہ برآمدے میں سیتا کے ساتھ چلنے لگا۔

"یہ جھگڑا کیوں ہو رہا ہے —؟" سیتا نے گھڑی دیکھتے ہوئے بے خیالی سے سوال کیا۔

"آؤ دس منٹ کہیں بیٹھ کر کافی پی جائے —— تم آج ہی دہلی واپس جانا چاہتی ہو؟"

وہ ایک قہوہ خانے میں داخل ہوئے جہاں یونیورسٹی کے طالب علم اور اخبار نویس زور شور سے بحثوں میں مصروف تھے۔ یہاں بھی بڑا شور ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ایک میز پر بیٹھ گئے۔ سیتا آہستہ آہستہ انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔ کتنا شور تھا۔ ساری دنیا میں کتنا رولا پڑ رہا تھا۔

"اوہ —— معاف کرنا —— میں ابھی آتا ہوں ——" اتنا کہہ کر رام تیزی سے مرشد آبادی ریشم کی ساری میں ملبوس ایک لڑکی کی طرف گیا جو اسی وقت قہوہ خانے سے باہر جا رہی تھی —— دروازے کے نزدیک ٹھٹھک کر وہ دونوں چند منٹ تک جلدی جلدی ایک دوسرے سے کچھ کہتے

رہے۔ لڑکی نے پلٹ کر قہر بھری نگاہوں سے سیتا کو دیکھا اور باہر چلی گئی۔ رام رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا واپس آکر بیٹھ گیا۔

"یہ میری منگیتر تھی ـــــ" سیتا کی سوالیہ نظروں سے نظریں ملا کر اس نے ذرا جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کتنا کم عمر اور جوشیلا تھا!

وہ اس کا ہم سن تھا۔ وہ اس کی زبان، اس کا جوش، اس کا جذبہ سمجھ سکتی تھی۔

"تھی ـــ کیا مطلب؟ اب نہیں ہے؟" سیتا نے تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"اس کا انحصار تازہ ترین سیاسی صورتِ حال پر ہے۔"

"اگر تم کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے سمجھاؤ کس طرح ـــــ؟!"

قہوہ کی پیالی کو اداسی سے دیکھتے ہوئے اس نے بتایا ـــــ یہ لڑکی سنہالی بدھسٹ ہے ـــــ وہ خود ٹامل ہندو گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے لڑکی کے ماں باپ اس شادی کے خلاف ہیں۔ لڑکی بالکل غیر سیاسی ہے مگر وہ اسے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس لڑکی کا باپ یو۔ این۔ پی۔ کا لیڈر بھی ہے اور اس کا سارا فیوڈل خاندان بے انتہا دولت مند، ری ایکشنری اور امریکہ پرست ہے۔

"پچھلے ہفتے میں اس سے لڑ بیٹھا ـــــ میں مصر تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر سول میرج کرلیں اور اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے مدراس چلے جائیں، مگر وہ اس چیز کے لئے تیار نہیں ـــــ ڈرپوک گلہری کہیں کی۔ نہ جانے کیوں میں اپنی داستان سنا کر بور کر رہا ہوں تمھیں ـــــ"

"مجھے اپنے متعلق اور بتاؤ ـــــ" سیتا نے اس کے لئے قہوے کی دوسری پیالی منگاتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں نیٹیو لوگوں سے ملیں؟"

"سوائے بجے سوریہ کے اور تو کسی سے نہیں ملی۔ اور ایک ڈچ برگر لڑکی کا گانا سنا ـــــ"

"یعنی مسٹر بجے سوریہ کے علاوہ میں پہلا خالص نیٹیو ہوں جس سے آپ کی مڈبھیڑ ہوئی؟

ڈچ برگر یہاں کے اینگلو انڈین ہیں ــــ اتنے دنوں اور کیا کیا ــــ؟

"بس سارا وقت نورا ایلیا میں گزر گیا۔"

"پھر تو تم صحیح معنوں میں غیر ملکی سیاح ہو! تمھیں مسٹر جے تورریہ نے اپنے ڈنر میں مدعو کیا تھا؟"

"ہاں تمھیں کیسے معلوم؟"

"شاید تم کو اس کا اندازہ نہیں کہ کولمبو چھوٹا سا شہر ہے اور تم نے اس میں کافی کھلبلی مچا رکھی ہے۔ میری ایک رفیق کار نے اپنے اخبار کے سوشل کالم میں تمھارا ذکر بھی کیا تھا ــــ ماؤنٹ لیونیا میں ٹھہری ہوئی دلفریب ہندوستانی خاتون جو بے انتہا خوبصورت ساریاں باندھتی ہیں۔ وہ تمھارا انٹرویو بھی کرنا چاہتی تھی مگر تم کسی صورت دستیاب نہ ہو سکیں!"

"گڈ گاڈ!"

رام نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں؟"

خدایا ــــ خدایا ــــ یہ بھی ــــ

"میرا مطلب ہے ــــ میں محض اتنا کہہ رہا ہوں کہ چند روز قبل تم سے ملاقات ہو جاتی تو میں تمھیں یہاں کی اصلی دھڑکتی ہوئی زندگی کی جھلک دکھلاتا۔ تمھیں ٹامل گھرانوں میں مدعو کرتا۔ اپنی بہنوں سے ملواتا۔"

"اور اپنی منگیتر سے نہیں؟"

"وہ میرے گھر کب آتی ہے۔" وہ پھر غمگین ہو گیا۔ "اور میں یہ تمنا کر رہا ہوں کہ وہ اپنا محل چھوڑ کر میرے تین کمروں کے فلیٹ میں آ رہے گی ــــ!! سیتا تم نے کینڈی کے فیوڈل طبقے کی اور یوروپین پلانٹرز کی زندگی نہیں دیکھی ــــ برطانیہ کی حسین ترین کراؤن کالونی واقعی ان لوگوں کے لئے جنت تھی، اور اب بھی ہے۔ تم تو مڈل کلاس ہو نا؟"

"ہاں بلکہ لوئر مڈل کلاس۔" سیتا نے جواب دیا۔

"میری بے انتہا ارسٹوکریٹک ویلیا ابھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم ہندوستان کی کس فلائینگ مہارانی کو کوفی پلا رہے ہو ——!!!"

سیتا ہنس پڑی۔

"آج صبح کی خبریں تو بڑی پریشان کن ہیں۔ شمال میں اتنا فساد ہوا۔" اس نے رام کے ہاتھ سے اخبار لے کر کہا۔

میز کے برابر سے گذرتے ہوئے چند دوستوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اتنا بدشکل سیاہ فام شخص مگر اس کے چہرے میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کے دانت بے حد خوبصورت تھے اور وہ ہنستا ہوا بڑا اچھا لگتا تھا۔ سیتا اسے بے دھیانی سے دیکھا کی —— "ہیں —— بتاؤ ——" اس نے سرنیہوڑا کر کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا —— "تمہارے یہاں اتنا جھگڑا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ملک کے باسی ہو کر آپس میں جھگڑتے ہو ——"

"سب کچھ جانتے ہوئے اس قدر جہالت کا سوال شاید تم اس لئے کر رہی ہو کہ واقعی اب بہت بور ہو چکی ہو —— تمہارے لئے کافی اور منگوائی جائے —— بوائے" اس نے آواز دی — "تمہارے یہاں جھگڑا کیوں ہوتا ہے؟ تم لوگ بھی ایک ملک کے باسی تھے۔ تم اور ہم دونوں سرمایہ دار بورژوا سیاست کے شکار ہیں۔"

اس کے لہجے کی تلخی نے سیتا کو یاد دلایا۔ ایک بار نیویارک میں جمیل کا تعارف ان کے بڑے بھائی کے ایک ہم وطن سے جب کرایا گیا تھا تو جمیل نے اسی تلخی کے ساتھ جواب دیا تھا "جی نہیں —— میں اب بھی اسی ملک کا آزاد شہری ہوں جسے آپ حضرات چند سال اُدھر 'جنت نشان' کہتے تھے۔"

"تم تامل لوگوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مین لینڈ کی طرف دیکھتے ہیں —— جس طرح سارے اوورسیز چینی مین لینڈ چائنا کی طرف دیکھتے ہیں ——" سیتا نے اس سے کہا۔

"میں نے دہلی کے اخباروں میں لنکا کے انڈین پرابلم کے متعلق سلسلہ وار مضمون لکھے

تھے۔ تم کو ان کی کٹنگ بھیجوں گا ـــــ شام کو میرے گھر کھانا کھاؤ۔"

"تمھیں کولمبو سے بھاگنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ تمھارے ایسے خوبصورت مہمان ہمارے یہاں روز روز کب آتے ہیں۔"

"کیوں؟ ہمارے ہندوستانی فلم اسٹارز اور ڈانسرز تو یہاں اکثر آتے رہتے ہیں!" سیتا نے اس کی آواز کی بڑھتی ہوئی جذباتیت سے گھبرا کر بات مذاق میں ٹالنا چاہی۔

"تمھیں پتہ ہے ـــــ تم لنکا دیپ کے اس کمرے میں جب داخل ہوئیں تو مجھے ایسا لگا جیسے کشمیر کی خوشگوار ہوا کا جھونکا کہیں سے آگیا۔"

"میں سندھی ہوں۔"

"ہاں۔ لیکن بالکل کشمیری معلوم ہوتی ہو!"

"سندھی بھی بدصورت نہیں ہوتے!"

وہ ہنسنے لگے۔ اس وقت ـــــ کولمبو کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے دو نوجوان ـــــ ایک سیلونی "اور سیز انڈین" ٹامل ـــــ ایک ہندوستان سے آئی ہوئی پاکستان کی "سندھی شرنارتھی" ـــــ بیک وقت کتنے مسرور اور کتنے اداس معلوم ہو رہے تھے ـــــ انھیں معلوم تھا کہ زمین ان کی آج کی نوجوان نسل کے قدموں کے نیچے سے سرک چکی ہے اور ساری دنیا کا مستقبل ان کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ کیا ان کے باپ یہ جانتے تھے کہ ان کی نسل کے سیاستدانوں کی بنائی ہوئی دنیا میں ان کے بچوں کو کیا کچھ سہنا پڑے گا؟

"چلو تمھیں کولمبو گھما دیا جائے ـــــ" رام نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر ایر لائنز کا دفتر ـــــ"

"جہنم میں جائے تمھارا ایر لائنز کا دفتر۔ یہ لنچ ٹائم ہے۔ سارے

دفتر تین بجے تک بند رہیں گے ـــــ فکر مت کرو۔ تمھیں کل ہوائی جہاز میں بٹھا دیا جائے گا۔"

"ـــــ غالباً تم اس کا مداوا نہیں کر سکتیں کہ لوگ تم میں ادبدا کے دلچسپی لیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی حد تک تم بھی ان کا دل نہیں توڑنا چاہتیں ـــــ"

"تم نے کون جگہ اب تک نہیں دیکھی ہے؟ ٹیکسی کا دروازہ بند کر کے رام پوچھ رہا تھا۔

"کیلانیا ٹمپل ـــــ" اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مندر کی چڑھائی پر پہنچ کر چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے سیتا نے کہا "تمھارے یہاں کی سیاسی صورتِ حال جو کچھ بھی ہو مجھے تو پچھلے آٹھ دس دن سے برابر ایسا ہی لگ رہا ہے کہ میں جنوبی ہند میں ہوں۔ ویسے ہی مناظر ہیں، اسی طرح کی کلچر ـــــ" وہ تھک کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ دنیا میں اتنا رولا کیوں مچتا ہے؟

"گائیڈ ـــــ لیڈی ـــــ؟ فرسٹ کلاس گائیڈ ـــــ" ایک سنہالی نے اچانک نمودار ہو کر پوچھا۔

وہ سیڑھیوں پر سے اٹھی ـــــ "تمھارے بدھسٹ مندروں میں اتنے ہندو دیوی دیوتاؤں کا زور کیوں ہے؟" اس نے عمارت کی طرف چلتے ہوئے سوال کیا۔ رام سر جھکائے خاموشی سے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

"یہ ہندو دیوی دیوتا لوگ لنکا میں، ہمارے بدھ دھرم کے محافظ ہیں ـــــ" گائیڈ نے بڑے وثوق سے بتایا۔

"لوشن لو بھئی ـــــ" سیتا نے رام سے کہا۔ اور اسے ڈاکٹر نیرلی مارش یاد آگیا۔

"پرتگالیوں کے آنے سے پہلے تک لنکا تہذیبی لحاظ سے بالکل ایک تھا اور برطانوی تسلط سے قبل تامل سنہالی جھگڑے کا وجود بھی نہیں تھا۔" رام نے کہنا شروع کیا مگر پھر اکتا کر چپ ہوگیا۔ نارنجی کپڑوں میں ملبوس بڑے بڑے تاڑ کے پنکھے اٹھائے بھکشوؤں کی ایک ٹولی سامنے سے گزری۔

"تم مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں ____ تم سوسیولوجسٹ ہونا ____ تم ابھی جنوبی ہند کی بات کر رہی تھیں۔ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ سنہالی طریقۂ زندگی بنیادی طور پر ہندو طریقۂ زندگی ہے۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدھ ازم یا کم از کم لنکا کی بدھ ازم محض ہندو مت کا ایک ورژن ہے یا اسے علیحدہ مذہب اور کلچر سمجھا جائے؟ سنہالی سماج کی بنیاد کاسٹ پر تھی۔ حالانکہ کاسٹ سسٹم بدھ ازم میں نہیں ہے۔ بہت سے سنہالی بدھسٹ ہندوؤں کے خداؤں کو پوجتے ہیں ____ پھر قومی کلچر کیا ہے؟ خالص سنہالی قومی کلچر ____؟ خالص ہندوستانی قومی کلچر؟ خالص پاکستانی قومی کلچر؟"

"میں نے جے سوریہ کے ڈرز میں اس روز مین لینڈ سے آئے ہوئے چند ہندوستانی اور پاکستانی مہمانوں سے پوچھا تھا کہ کیا پاکستانی اسلام وہی ہے جو سعودی عرب اور مصر میں رائج ہے؟ اور کیا ہندوستان کے ہندو عوام کا کلچر وہی ہے جو اشوک کے زمانے میں تھا؟ جب میں جے سوریہ سے کہتا ہوں کہ تم لوگ تاریخ کے ارتقا کو کس رخ سے دیکھ رہے ہو تو وہ فوراً ہم جلاوطنوں کی نفسیات پہ ایک تقریر شروع کر دیتا ہے۔"

"یہاں برطانوی دور کی نئی مڈل کلاس نے ملازمتیں اور سیاسی مراعات حاصل کرنے کے لئے ایجی ٹیشن کیا ہوگا ____ اور مڈل کلاس کے مختلف نسلی اور مذہبی فرقوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے تھے ____" سیتا نے پوچھا۔

"ہاں ____ اب بدھسٹ کانگریس کا مطالبہ ہے کہ لنکا کی تاریخ از سر نو لکھی جائے۔ ایشیا کے ہر نئے ملک میں لکھی جا رہی ہے ____ مگر تاریخ کو کس زاویئے سے انٹرپریٹ کیا

جائے گا ــــ؟"

مندر کی پہلو کی دیوار پہ دوسرے خداؤں کے ساتھ راون کے چھوٹے بھائی بھگوان وبھیشن دانت باہر نکالے مسکرا رہے تھے۔ بھگوان وبھیشن غریب چونکہ بھگوان ہونے کے باوجود راکھشس بھی تھے اس لئے ان کے دو دانت باہر نکلے ہوئے تھے ــــ "گھر کے بھیدی یہی مہاشے تھے ــــ" سیتا نے رام سے کہا اور پھر اسے اس اردو محاورے کا مطلب سمجھایا۔

اندر ہال میں آرٹ اسکول کا ایک طالب علم فریسکوز کی نقل اتارنے میں مصروف تھا۔ رام کو اس سے باتیں کرتا چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

برابر کے کمرے میں گوتم بدھ ــــ کے طویل لیٹے ہوئے مجسّمے کے قدموں میں پجارنوں میں سے کسی ایک کا ننھا سا بچہ میلے سے کپڑے میں لپٹا میٹھی نیند سو رہا تھا اور اس کی ماں ٹھنڈے مرمریں فرش پر سجدے میں پڑی تھی۔

راہل ــــ راہل ــــ راہل ــــ

بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے قدم رکھتی کہ کہیں اس کے پیروں کی آہٹ سے بچہ جگ نہ جائے۔ وہ دوسرے کمرے میں گئی جہاں ایک اور سنہری گوتم بدھ حسب معمول کھلے ہوئے کنول پر سکون سے بیٹھے تھے۔ وہ ذرا کے ذرا آنکھیں بند کر کے مورتی کے سامنے مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی چند لمحوں کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے عرفان کھڑا تھا۔

۱۷

اس نے خاموشی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور دیوار کی تصویروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ عرفان آگے بڑھا ــــ "سیتا ــــ سنو ــــ دیکھو ــــ بات سنو ــــ گوتم بدھ امن کے شہزادے تھے ــــ میں ان کے سامنے جھک کر تم سے معافی مانگتا ہوں ــــ معاف

کردو ـــ معاف کردو ـــ سیتا ـــ"

وہ فریسکو زپر نظریں جمائے رہی ۔

"سیتا ـــ سن رہی ہو ـــ؟ سیتا ـــ سیتا ـــ سیتا ـــ"

(۱۸)

"کل تو میں حضور قلب حاصل کرنے مہاتما بدھ کے مندر میں گیا تھا مگر آج میری موڈ اتنی ڈرامائی نہیں ہے ـــ لہذا آج شام کو چلو شہر کو سرخ رنگ دیں ـــ" ماؤنٹ لیونیا کی بالکنی پر جھکے ہوئے عرفان نے تجویز کیا ۔

"چلئے ـــ" سیتا نے بشاشت سے جواب دیا۔

"لٹل ہٹ جاکر چینی کیبرے دیکھیں گے ـــ سارے نائٹ کلبوں میں جائیں گے۔"

"جائیں گے۔"

"شان شیل جاکر ڈچ برگر لونڈیا سے اپنی فرمائش کے گانے سنیں گے۔"

"سنیں گے۔"

"زو میں جاکر ہاتھی کو ہارمونیم بجاتے دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے۔"

"مگر تمھیں تو اپنے جرنلسٹ دوستوں کے گھر جاکر اوورسیز اور اسٹیٹ لیس ہندوستانیوں کے مسائل کے تجزیئے کی پروجیکٹ پر کام کرنا تھا۔"

"اوہ عرفان ـــ واقعی ـــ!" وہ قہقہہ لگاکر ہنسی ۔

"تم بھی کیسے کیسے بھانت بھانت کے لوگوں کو کہاں کہاں سے پک اپ کرلیتی ہو۔ کمال ہے!!"

عرفان کے لہجے میں کوئی طنز، کوئی تلخی نہیں تھی ۔ وہ ایک بے تکلف ساتھی کی طرح بات کر رہا تھا ـــ جو حاسد، بدگمان، تنگ، کم ظرف عاشق نہیں تھا بلکہ محض ایک پرانا دوست تھا ـــ انسان کس طرح

لحظہ بہ لحظہ مختلف ہوتا رہتا ہے۔

"ارے بھئی اپنے اس ہنومان کو فون تو کر دو کہ نہیں آسکتیں اس کے ڈنر پہ۔"

"ہنومان کون ؟"

"وہی تمہارا راما سوامی اور آیا سوامی کون ہے ؟"

یہ واقعہ تھا کہ اس وقت تک وہ راما سوامی کو بالکل بھول چکی تھی۔ عرفان نے اسے کب کا واپس بلا لیا تھا۔ راما سوامی کی کم سنی، سیاسی ہم خیالی، تہذیبی یگانگت، ہر چیز اس کے دماغ سے کیلا نیا کے مندر ہی میں محو ہو گئی تھی ـــــ دنیا میں آدمی صرف ایک تھا ـــــ عرفان ـــــ عرفان ـــــ اول و آخر ـــــ عرفان ـــــ پرسوں شام جب عرفان نے اس کی توہین کی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی ـــــ وہ خوفناک صبح جب اسے بے سوریہ کے دفتر میں ـــــ بیٹھنا پڑا تھا ـــــ وہ اجاڑ دوپہر جب اس نے راما سوامی کے ساتھ سگرٹوں کے دھوئیں سے بھرے قہوہ خانے میں سیلون کی سیاست پر باتیں کی تھیں ـــــ وہ سب یکسر اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ لحظہ ـــــ حال ـــــ لحظہ موجود ہے ـــــ جو تمہارے ہاتھ میں ہے ـــــ اسے تھامے رکھو ـــــ مضبوطی سے تھامے رکھو ـــــ کیوں کہ دن اور رات تیزی سے سرکتے جا رہے ہیں ـــــ

وقت عنقریب ختم ہونے والا ہے۔

(۱۹)

اس رات عرفان نے ٹل ہٹ سے لوٹتے ہوئے پہلی مرتبہ جمیل کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ لڑائی والی رات اس نے بارہ بجے یہ بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ جمیل سے ملاقات تو ہوئی تھی مگر ان کے ہاں کچھ اور لوگ آ گئے اس لئے کوئی بات نہ ہو سکی۔ لیکن کل شام کو تو وہ ضرور بالضرور جمیل سے مل رہا ہے۔

"میں آپ کی ان ملاقات کی کوششوں اور آدر ملاقاتوں سے اتنی بور ہو چکی ہوں اب مجھے

قطعی کوئی پرواہ نہیں۔" سیتا نے بے دھیانی سے جواب دیا۔" میں جاتی ہوں دتی واپس۔"

لیکن اس کے دوسرے روز صبح ہی صبح اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"کیا ہے ؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ——— اور جاکر دروازہ کھولا۔

"آچھیں ———" عرفان چھینکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"ارے ——— آپ کیسے ہیں ؟" سیتا نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں ——— فکر نہ کرو ——— قمروالا حشر میرا نہیں ہوا ——— دراصل کل رات بہت دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلنے کی وجہ سے زکام ہوگیا ——— ہوا بہت تیز تھی۔"

"اچھا ——— ! تو آپ سمندر کے کنارے ٹہلے ——— !! کس کے ساتھ ؟"

"ہلو ——— !!" عرفان نے اسے غور سے دیکھا۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ خوش دلی سے ہنسا۔

"تمھارے شوہر نامدار کے ساتھ ———" وہ بے انتہا اچھی موڈ میں تھا ——— "بھئی بہت لطف آیا۔ ——— تمھارے میاں سے بہت دوستی ہوگئی ہماری ——— خوب چیز ہیں۔" وہ سگریٹ جلانے کے بعد خوب ہنسا۔

"بات تو بتائیے ———" سیتا نے تکیے کے سہارے اوندھے لیٹ کر سوال کیا۔

عرفان اسی بشاشت سے ہنستا رہا ———" ارے بھئی تمھارے پران ناتھ کا جواب نہیں ——— واللہ ——— کل شام جب میں گال فیس پہنچا تو انھوں نے مجھے اوپر کمرے میں بلالیا۔ بھائی حسب معمول بہت سخت ڈرنک تھے۔ نہ سلام نہ دعا۔ چھوٹتے ہی انھوں نے مجھے پدماوت کا "سنگلدیپ کھنڈ" سنانا شروع کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملک محمد جائسی کی روح آپ ہی میں حلول کر گئی ہے۔ دوہے پڑھتے جاتے تھے اور تم کو یاد کر کر کے زار زار روتے تھے ——— جب "سنگلدیپ کھنڈ" پڑھ چکے تو اپنی موجودہ بیوی کی تصویر دکھائی اور علامہ اقبال کے اسپین والے اشعار پڑھنے لگے۔"

موجودہ بیوی کے ذکر پر عرفان نے محسوس کیا کہ سیتا کے چہرے پر ایک ہلکا سا بادل گذر گیا اور اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی ——— عرفان نے ذرا گڑبڑا کر کہا۔" سیتا ——— تم ناشتہ کس وقت

کرتی ہو ۔۔۔؟"

"ناشتے کی فکر مت کیجئے ۔۔۔ بات بتائیے ۔۔۔"

"اچھا صاحب ۔۔۔" اس نے حلق صاف کیا ۔۔۔" اس کے بعد جمیل صاحب جو تھے ان کے اندر تلسی داس جی کی روح حلول کر گئی اور انھوں نے راماین کی چوپائیاں دے دنادن پڑھنا شروع کر دیں ۔۔۔ اس شخص کو ان گنت چوپائیاں ازبر ہیں ۔۔۔ واقعی تم نے کس کریک سے شادی کر لی تھی!"

سیتا کو یہ بات بہت ناگوار گزری ۔۔۔" وہ بالکل کریک نہیں ہیں ۔ لٹریری آدمی ہیں ۔۔۔ آپ جیسے ٹھس لوگ پدماوت اور راماین کیا جانیں ۔۔۔"

"اوہو ۔۔۔ خفا ہو گئیں، ارے بھئی تم حکم دو تو میں ساری مہابھارت، سارا کالیداس، سارا دیوان حافظ، سارا شیکسپیئر، سارا ایلیٹ جو چاہو سنا دوں ۔۔۔ مگر اس فراڈ میں یقین ہی نہیں رکھتا ۔۔۔ تم عورتیں ان ہی چیزوں کے چکر میں آکر تو بیوقوف بنتی ہو ۔۔۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ زبردست شاعر اور افسانہ نگار لوگ جو محبت اور زندگی کے حسن کی تعریف میں ہزاروں صفحے سیاہ کرتے ہیں اور جانے کیا کیا زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں گھروں کے اندر اپنی بیویوں سے ان کا سلوک کیسا ہوتا ہے ؟ چلو ۔۔۔ خیر ۔۔۔ اچھا تو بھئی رامائن کے بعد وہ پھر "سنگلدیپ کھنڈ" پر لوٹ آئے ۔۔۔ اور اب کی دفعہ ساتھ ساتھ مجھے بھی ڈانٹتے گئے کہ میں بھی آتنی ہی زیادہ شراب کیوں نہیں پی رہا ۔۔۔ پھر ایک ایک دوہا دس دس مرتبہ مجھ سے بھی پڑھواتے ۔۔۔ کیا کمال کا آدمی ہے واللہ ۔۔۔ گریٹ مین ۔۔۔ بہت بھلا آدمی ہے بے چارہ ۔۔۔"

عرفان اپنے اپارٹمنٹ میں اٹھ کر دریچے کے قریب چلا گیا ۔ وہ بے حد خوش تھا ۔

"ایک دو دوہے تم بھی سنو گی ۔۔۔؟" اس نے پلٹ کر سیتا سے پوچھا ۔

"نہیں ۔۔۔"

"نہیں کیسے ۔۔۔ سننا پڑیں گے ۔۔۔ تم کو شکایت ہے کہ میں لٹریری آدمی نہیں ۔۔۔"

اس نے ٹہل ٹہل کر حلق صاف کیا۔" کہتا ہے استاد کہ ؎

سنگلدیپ کتھا اب گاؤں   ادسو پدمن ہرن سناؤں

——سناؤں——؟"

"نہیں——"

"اجی تمھارے تو اچھے بھی سنیں گے۔ جیسا تمھارے میاں نے میرا کونڈہ شریف کیا ہے میں تمھارا کونڈہ شریف کیوں نہ کروں——لو سنو——بیچارے جمیل نے کس قدر رو رو کر سنایا ؎

راگھو جو سیتا سنگ لائی   راون ہر بی کون سدہ پائی

یہ سنسار سپن کر لیکھا   بچھڑ گئے جانو نہ دیکھا

ہائے ہائے——اور سنو ؎

سنگلدیپ جونا نہ نبھاؤ   یہی ٹھانوں سا نکر سب ساہو

ہا——اس کا کچھ اندازہ تو مجھے بھی ہے——!"

سیتا کو بے ساختہ ہنسی آگئی——وہ اپنے جوش میں ٹہلتا ٹہلتا پھر دریچے کے پاس چلا گیا اور اس کے نچلے پٹ پر کہنیاں ٹیک دوہے پر دوہا سناتا رہا۔ وہ واقعی اس قدر خوش تھا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کرکے آیا ہو——سیتا نے اسے آج تک اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

"اور سنو کیا کہہ گیا ہے ظالم——

محمد جیون جل بھرن رہنت گھری کی ریت

گھری جو آئی جیون بھری ڈھری جنم کا بیت[1]

آں——چھیں——"

"آپ پر بھی میرے پتی کی کرکیت کا اثر ہو گیا ہے——" اس نے عاجز آکر کہا——"اب

---

[1] اے محمد! یہ زندگی گھڑی رہٹ کی مانند ہے جس میں پانی بھرتا ہے اور ڈھلتا رہتا ہے۔ گھڑی کا پانی بھرنا گویا زندگی ہے اور پانی کا ڈھلنا موت۔

اصل بات کی طرف آئیے ــــ"

"اور سن لو ــــ سن لو ــــ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ــــ ارے ہائے ہائے ــــ" وہ اس کی سنی ان سنی کر کے کہتا رہا ــ

ہی کی جوت دیپ جو سوجھا ــــ یہ جو دیپ اندھیرا بوجھا
جو پی ناہیں استھروسا ــــ جگ اجار کا کیجئے بسا

"کیا مطلب ــــ؟" سیتا نے دریافت کیا۔

"کہتا ہے ملک محمد کہ دل کی روشنی میں سنگلدیپ نظر آیا ــــ اور اس تاریک دنیا میں بالکل اندھیرا تھا۔ جب محبوب ہی بس میں نہیں تو دنیا آباد ہو یا ویران ــــ اور سنو ــــ" وہ اچک کر لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا۔

محمد چنگ ــــ بیم کی سُن گگن ڈرائے ــــ دھن برہن او دھن ہیا جیہیں یہ آگ سمائے[1]

پھر اس نے سیتا کو اس دوہے کا مطلب سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔

"آپ بھی بڑے گنوان نکلے ــــ!" سیتا نے کہا۔

اس نے جھک کر تسلیم کی "ارے تم کو کیا پتہ۔ میں بڑا زبردست چھپا رستم ہوں۔ کیا سمجھتی ہو۔ خالی تمہارے جمیل خاں ہی استاد ہیں؟"

"آپ دیوانے ہیں بالکل ــــ!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"سیتا ــــ"

"جی ــــ!"

اب وہ یکبارگی بے حد سنجیدہ ہو کر غور سے اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا اضطراب

---

[1] اے محمد! محبت کی چنگاری سے تو زمین اور آسمان تک ڈرتے ہیں۔ آفرین ہے محبت کرنے والے اور اس کے دل پر جس جس میں یہ آگ سمائی ہے۔

چھپانے کے لئے قلمدان میں رکھی ہوئی پنسلوں سے کھیلنا شروع کر دیا ــــ "سیتا ــ!" اس نے دوبارہ کہا۔

" جی ــــ؟ جمیل نے ــــ جمیل نے کیا کہا ــــ" سیتا نے سانس روک کر پوچھا۔

" جمیل کو میں نے ساری بات سمجھائی۔ آدھی رات کو جب میں ان کو سمندر کی ٹھنڈی ہوا کھلائی تو وہ سو بر ہو چکے تھے ــــ میں نے ان سے کہا کہ تمھیں طلاق دے دیں ــــ کیونکہ ــــ کیونکہ ــــ کیونکہ ــــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ــــ سچویشن بے حد گھسی گھسائی پٹی پٹائی ہے نا ــــ؟ مگر تم پاکستان نہیں آؤ گی ــــ یا آجاؤ گی ــــ؟"

گھڑی کی ٹک ٹک تیز ہو گئی۔ باہر سمندر کا شور یک لخت بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے کامل سکوت کے بعد سیتا نے کہا۔

" آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں ..."

" میرا فرض کرنا نہ کرنا قطعاً میرا اپنا فعل ہے ــــ اور میں جہاں تک میرا خیال ہے اپنے فعل کا مختار ہوں۔ آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

" آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

" کہاں ــــ؟ کمرے سے باہر ــــ؟ چلا جاؤں گا۔ ایک دفعہ تم پہلے ہی نکال چکی ہو ــــ ویسے یہ سمجھ لو کہ میں آدمی ہوں کافی ڈھیٹ ــــ سنو ــــ اگلے مہینے میں پیرس پہنچ رہا ہوں ــــ تم ایک کام کرو ــــ" اس نے نروس ہو کر پھر پنسلوں سے کھیلنا شروع کر دیا ــــ "تم یہ کرو کہ وہاں آجاؤ ــــ"

وہ پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ " جو ہو گا دیکھا جائے گا ــــ اب جائیے۔"

" اچھا ــــ ایک دوہا اور سن رکھو اور اس پر غور کرنا ــــ" دروازے میں جا کر اس نے کہا ۔

محمد مدھ جو بیم کا ہیے دیپ نیہہ راکھ!
سیس نہ دئی پتنگ جیون تب لگ جائے نہ پاکھ[1]

(۲۰)

"ـــــ اور جب کام دیو شمبھو کی تسخیر کے لئے چلا تو سارے مقدس صحیفے بیکار ہو گئے تزکیۂ نفس، صبر، سنیاس، فرض، معرفت، علم، بے نیازی سب میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خرد کتابوں میں جا چھپی ـــــ رتی کا پتی اپنا تیر کمان سنبھالے اس قدر غیض میں کس کو اپنا شکار بنانے جا رہا ہے؟ ساری کائنات محبت میں گرفتار ہو گئی۔ درخت جھک کر بیلوں پر چھا گئے ـــ ندیاں سمندر سے جا ملیں ـــــ جل تھل ایک ہوئے ـــــ چرند اور پرند، دیوتا اور عفریت، انسان اور ناگ، لطیف ارواح اور غول بیابانی، مرگھٹ کے بھوت اور سادھو سنت بھی اس کے طلسم میں مبتلا ہوئے۔

" خردمند جو اب تک دنیا کو برہما کا سایہ سمجھتے تھے۔ ساری دنیا اب ان کو عورت کے روپ میں نظر آنے لگی ـــــ اس عالم میں کام دیو شمبھو کے قریب پہنچا[2]"

" اس سمے مدن کے بان پر جو آم کی کلیوں سے سجا تھا بہار نے شہد کی سیاہ مکھیاں اس طرح بٹھا دی تھیں گویا وہ خیال سے پیدا ہوئے خدا کے نام کے حرف تھے۔ ہلال کے ایسے پھول ناخنوں کے نشان کی مانند تھے جو بسنت رت کے لپٹنے سے جنگل کے بدن پر پڑ گئے تھے ـــ بہار تلک ـــ کا پھول لگا کر بھنوروں کے سیاہ کاجل سے مزین ہو، اپنے ہونٹوں کو (جو آم کے بور تھے) صبح کے آفتاب کی سرخی سے سجایا ـــــ پیال کے درختوں سے گرتے زرگل سے ہرنوں کی آنکھیں دھندلا گئیں اور وہ جنگل کے پتوں پر کلیلیں بھرتے پھرتے ـــــ کوکل کی آواز خود عجبت کی آواز

---

[1] اے محمد! محبت کی شراب سے دل کا چراغ روشن کر۔ پروانے کی مانند جب تک سر نہ دے دیا جائے تب تک اس کے پاس کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ [2] راماین از تلسی داس۔

بن گئی ـــــ کوکل کی آواز جو مغرور عورتوں کی سرد مہری توڑنے میں بڑی ماہر ہے ـــــ مدن کے حکم سے درخت ساکت، بھنورے خاموش، چڑیاں چپ چاپ، ہرن سکوت میں کھو گئے ـــــ سارا جنگل ایسا دکھائی دینے لگا جیسے ایک بڑی تصویر ہو[1]۔"

(۲۱)

پیرس میں سیتا اور عرفان کئی مہینے رہے۔ عرفان کے پاس بولوار سوتشے میں ایک بڑا خوبصورت فلیٹ تھا۔ جسے سیتا نے اور زیادہ نفاست سے سجایا۔ عرفان صبح کو دفتر چلا جاتا۔ سیتا بازار سے سودا خرید کر لاتی، کھانا تیار کرتی ـــــ عرفان کے کپڑوں پر استری کرتی، گھر کی صفائی، جھاڑو بہارو کرتی، شام کو وہ کام سے لوٹتا تو جلدی سے اس کے گرم سلیپر اس کے صوفے کے نیچے آتشدان کے پاس رکھتی۔ سونے کے وقت سے بہت پہلے اس کے سلیپنگ سوٹ کو گرم پانی کی بوتل پر لپیٹ کر اس کے بستر پر رکھ دیتی۔ وہ ایسی مکمل اور سکون بخش اور آرام دہ ہاؤس وائف تھی کہ عرفان متعجب ہوتا تھا۔

وہ روزانہ صبح کو ڈاک کا بڑی شدت سے انتظار کرتی تھی۔ شاید آج نیویارک سے اس کا طلاق نامہ آجائے ـــــ شاید ـــــ مگر دن گذرتے گئے اور طلاق نامہ نہ آیا۔ وہ کولمبو سے دلّی واپس جا کر کسی سے نہیں ملی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا کہ اسے پیرس میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ جا رہی ہے۔ وہ لوگ اب اس سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ نہ کسی قسم کے سوالات کرتے تھے۔ اس طرح کی باتوں کا وقت کب کا نکل چکا تھا۔ پیرس جانے سے ایک روز قبل اس نے کناٹ پیلس سے بلقیس اور ہما کو فون پر خدا حافظ کہا تھا۔

"اب کب تک آؤ گی ـــــ؟" بلقیس نے پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں میرا دل نہیں لگتا اور اگر ایک دفعہ یوروپ پہنچ گئی تو وہاں

---

[1] کالیداس

سے نیویارک جانے میں آسانی رہے گی ـــــ راہل کو دیکھنے ـــــ "

" ٹھیک کہتی ہو ـــ " بلقیس نے جواب دیا تھا ـــــ " مگر کبھی کبھار خط تو لکھ دیا کرنا "

" برابر لکھوں گی ـــــ "

بلقیس نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ پیرس کیوں جارہی ہے ۔ اسے معلوم تھا۔

چھٹی کے روز وہ سین کے کنارے ٹہلنے جاتے ۔ کارتر لاطین میں آوارہ گردی کرتے کسی قہوہ خانے میں سیاہ کافی پیتے ہوئے وہ سوچ میں ڈوب جاتی تو وہ اس سے پوچھتا ـــــ " کیا سوچ رہی ہو ـــ ؟ "

" میں اب سوچنا ختم کرچکی ہوں ۔ صرف محسوس کرتی ہوں " وہ سر اٹھا کر جواب دیتی۔

کسی پُل کی منڈیر پر جھک کر باتیں کرتے کرتے وہ یک لخت خاموش ہو جاتی تو وہ اسے سگریٹ جلا کر دیتا ـــــ " لو سگریٹ پیو ـــ لگے دم ـــ مٹے غم ـــ "

ایک دفعہ عرفان نے اس سے کہا " تم سے مادرا ایک اور تم ہو ـــــ جب تم دفعتاً چپ ہو جاتی ہو میں پھر اکیلا رہ جاتا ہوں ـــــ تم مجھ سے ہزاروں میل دور چلی جاتی ہو تم بہت بلندی پر ہوتی ہو ۔ میں تمھاری باتیں سمجھنا چاہتا ہوں ۔ مگر ڈر لگتا ہے ـــــ " کبھی کبھی وہ اپنی ان طویل خاموشیوں سے جھنجھلا کر خود کہتی ـــــ " عرفان ـــ باتیں کرو ـــ "

" باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ـــ " وہ جواب دیتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دونوں اسپین گئے ۔ وہاں مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر چاندنی رات میں انھیں ایک پاکستانی طالب علم ملا جس نے بے حد پیاری آواز میں گٹار پر اقبال کی نظم سنائی ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

" اب مجھے اس کا مطلب سمجھاؤ " سیتا نے عرفان سے کہا ۔

بہت دیر تک اشعار کی تشریح کرنے کے بعد عرفان نے جھنجھلا کر اس سے کہا " تم اپنا کالی داس، تلسی داس کرتی رہو، اقبال تمھارے بس کی بات نہیں "

ایک روز امریکہ سے ایک خط آیا۔ اس نے کھول کر پڑھا اور پھر خاموشی سے کپڑوں پر استری کرنے میں مصروف ہوگئی۔

"سیتا۔۔۔!" عرفان نے کمرے میں داخل ہوکر اسے پکارا۔

"کیا ہے۔۔۔" اس نے چڑکر کہا اور استری کا سوئچ بند کرکے دریچے میں چلی گئی۔

"آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں ہیں۔ ہم سے وحشت کی نہ لیجئے آئیے!"۔۔عرفان نے آتشدان کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف باہیں پھیلا کر کہا۔

وہ اسی طرح دریچے سے باہر دیکھتی رہی۔

"سیتا کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

"کچھ نہیں عرفان۔۔۔" اس نے مڑکر جواب دیا۔۔۔" مامی کا خط نیویارک سے آیا ہے۔۔۔ وہ لکھتی ہیں کہ اب وہ کس کس کے ناموں کے نقطے تبدیل کریں گی؟"

وہ خاموش رہا۔

"عرفان۔۔۔میرا خیال ہے ہم نے بہت سخت غلطی کی ہے۔ میں کب تک اس طرح تمھارے ساتھ رہتی رہوں گی؟"

"کیوں؟" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا۔۔۔"چند ہی مہینوں میں گھبرا گئیں۔۔۔گیری نندنی اوما نے تو شمبھو سے بیاہ کرنے کے لئے ایک ہزار برس تپسیا کی تھی۔۔۔ کمار سمبھو پڑھو۔"

"مجھے نہیں چاہئے تمھارا کمار سمبھو ومبھو۔۔۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہاہا۔۔۔اب آیا تمھاری عقل میں؟ میں نہ کہتا تھا کہ تمھارا سارا کالی داس والی داس، شاعری، ادب، فلسفہ سب فراڈ ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سامنے سب خرافات معلوم ہوتا ہے کہ نہیں؟"

آخر ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے بلقیس کو خط لکھا۔۔۔پیرس کے موسم کا ذکر کیا۔ فرخندہ باجی اور چھوٹی خالہ کی خیریت دریافت کی مگر یہ پوچھنے کی پھر بھی ہمت نہ پڑی کہ جمیل نے ان لوگوں کو اس کے متعلق کچھ لکھا ہے یا نہیں۔

بلقیس کا فوراً نہایت مفصل جواب آگیا۔ بڑا نارمل اور بشاش اور غیر شخصی سا خط تھا جو کسی بھی تذکرے کے بجائے محض تھیٹر کی تازہ ترین خبروں سے پُر تھا۔

—— اپٹا کی آٹھویں سالانہ کانفرنس کا اس سال ڈاکٹر رادھا کرشنن نے افتتاح کیا۔ بہت سارے روسی ڈیلی گیٹ بھی آئے تھے۔ گوپی ناتھ بھی ناچا۔

—— اس مرتبہ نٹ راج نگری میں تم بہت یاد آئیں۔

—— "نئی نوٹنکی" والے نوٹنکی کی طرز پر "مٹی کی گاڑی" پروڈیوس کر رہے ہیں۔ خاصا دلچسپ تجربہ رہے گا —— للتا کل تمھیں بہت یاد کر رہی تھی۔

—— بمبئی کا سٹل بیلے گروپ "میگھ دوت" اسٹیج کرنے والا ہے —— "شکنتلا" —— "آگرہ بازار" —— "مٹی کی گاڑی" —— ہماچل پردیش کے فوک آرٹسٹ —— خط بے دلی سے ایک طرف پھینک کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

عرفان کے ساتھ رہتے ہوئے اسے یہ باتیں کسی دوسرے کرے کی خبریں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک مہینہ اور گذر گیا۔

"عرفان بتاؤ اب میں کیا کروں؟" اس نے عاجز آکر سوال کیا۔

"پھر بلقیس کی خوشامد کرو اور کیا —— ؟" اس نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا اور کوٹ پہن کر دفتر چلا گیا۔

چنانچہ دریچے کے سامنے بیٹھ کر ریتا نے بلقیس کو لکھنا شروع کیا۔

"میں جمیل سے کولمبو میں بات نہیں کر سکی۔ بات کرنا تو درکنار ان کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پائی۔ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ یہ جنگلی بطخ کا تعاقب تھا۔ خدا کے لئے انھیں لکھو کہ مجھے جلد از جلد آزاد کر دیں۔ وہ مجھے کافی سزا دے چکے ہیں۔"

یکبارگی اس کے آنسو ٹپ ٹپ کاغذ پر گرنے لگے۔ وہ صفحے پر صفحے لکھتی چلی گئی اور ایک

لمبا سانس لے کر لفافہ بند کر دیا۔

اس خط کے جواب میں بلقیس نے لکھا۔

"تم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ بلونت گارگی کا "سوہنی مہیوال" ماسکو میں چھ مہینے سے چل رہا ہے ـــــ پٹنے کے اپٹا والوں نے تال کٹورہ ڈرامہ فیسٹول میں اب کے سے اپنا ڈرامہ "بیر علی" دکھلایا۔ اس کا ایک ایکٹر تمھارا پرانا کلاس فیلو نکلا۔ تم کو اس نے سلام کہلوایا ہے۔

ـــــ ہری نالنی سارا بھائی گجراتی میں نو تمثیلیں پروڈیوس کر رہی ہیں۔

ـــــ یونٹی تھیٹر والے فیروز شاہ کوٹلہ کے اوپن ایر تھیٹر میں "اورنگ زیب" اسٹیج کرنے والے ہیں۔

ـــــ اور آغا حشر کی تجدید کے سلسلے میں تم یہ جان کر خوش ہو گی کہ دہلی پلے ہاؤس والے "رستم و سہراب" پیش کر رہے ہیں۔

ایک شام سینما سے واپس آکر وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے لگے تو کونسی آرژ[1] نے ایک کیبل سیتا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ عرفان تالا کھول کر اندر جا چکا تھا۔ سیتا نے دہلیز پہ کھڑے کھڑے لفافہ چاک کیا۔ اس کے بھائی کی طرف سے اطلاع آئی تھی ـــــ "ڈیڈی گذر گئے۔"

جب عرفان کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آیا اس وقت وہ آتشدان کے سامنے دوہری ہوتی بیٹھی تھی

"کیا بات ہے لٹل وومین ـــــ؟" عرفان نے جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کچھ نہیں ـــــ" اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر عرفان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ اس نے کیبل عرفان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اوہ ـــــ آئی ایم سوری ـــــ" کاغذ پر نظر ڈالتے ہی عرفان نے آہستہ سے کہا۔

---

[1] CONCIERGE

"میں دلّی جا رہی ہوں۔"

"اچھا ۔۔۔"

"میں ممّی کے ساتھ کچھ عرصہ رہوں گی۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے ۔۔۔ ضرور جاؤ ۔۔۔" عرفان نے رسان سے جواب دیا۔

رحمت منزل قرولباغ واپس پہنچ کر وہ کئی ہفتے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ بلقیس کے "ماڈرن تھیٹر گروپ" نے تعزیت کے لئے اس کے پاس آنا چاہا مگر اس نے بلقیس اور شہزاد کے ذریعہ سب کو منع کروا دیا۔ ایک مہینے میں وہ پیلی پڑ چکی تھی۔

ایک روز اس کی ماں نے کہا "یہ تو نے اپنی کیا دُرگت بنا رکھی ہے۔ جا باہر گھوم آ ۔۔۔ کیا بیمار پڑے گی؟"

اس کی ماں نے اب تک اس سے پیرس یا عرفان کے متعلق ایک لفظ بات نہیں کی تھی۔ اب وہ اسٹیج آ چکی تھی کہ ان کی لڑکی کی نجی زندگی بالکل خالصتاً اس کا ذاتی معاملہ تھا۔

آخر ایک روز وہ تیسرے پہر کو تیار ہو کر جانکیہ پوری گئی۔ بلقیس کے ہاں سب نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا۔ فرخندہ باجی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں۔ اسی وقت نئی تمثیل کا اسکرپٹ لے کر کیلاش آن پہنچا۔

۔۔۔ کے بعد باتوں باتوں میں اس نے سیتا کو مخاطب کیا۔

"سیتا جی ۔۔۔! آپ کو پرو جیش بابو بہت پوچھتے تھے۔ دلّی آ کر جب کبھی ہم لوگوں سے ملتے ہیں برابر آپ کا ذکر کرتے ہیں ۔۔۔ مگر آپ نے تو ہم سب سے روٹھ کر ولایت ہی کو اپنا دیس بنا لیا ہے۔"

وہ بڑے اخلاق سے مسکرائی۔ "آج کل پرو جیش بابو کہاں ہیں؟"

"ان کی نمائش ہو رہی ہے۔ اس کے لئے آئے ہوئے ہیں۔"

"کہاں ٹھہرے ہیں ؟"

"وہیں ــــ اپنی پرانی جگہ ــــ بلقیس ــــ بھئی یہ للتا کا پارٹ دیکھ لو ــــ" سیتا اٹھ کر لاؤنج میں چلی آئی ۔

"ابھی کہاں جارہی ہو ــــ رات کو اسکریبل کھیلیں گے ــــ" اسے جاتے دیکھ کر بلقیس نے ڈرائنگ روم میں سے آواز دی ۔

"نہیں بلی ۔ اب میں چلوں ۔ ممی گھر پہ بالکل اکیلی ہیں ۔"

"تھوڑا اور ٹھہر جاؤ ۔ رات کو تمھارے دولھا بھائی پہنچا آئیں گے ۔" چھوٹی خالہ نے کہا ۔

"آج ہم لوگ فرنچ لفظ بنائیں گے ۔ تم تو بہت زیادہ فرنچ جان گئی ہوگی ۔" بلقیس نے کیلاش سے گفتگو کرتے کرتے پھر کہا ۔ مگر اب اس کی آواز میں مصروفیت تھی ۔ سیتا باہر آگئی ۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا چلا گیا ۔ شروع شروع میں عرفان اسے پابندی سے ہر ہفتے خط لکھتا تھا ۔ پچھلے چند ماہ سے وہ بالکل خاموش تھا ۔ سیتا اب تک اسے ان گنت خط بھیج چکی تھی ۔ مگر کسی کا جواب نہیں ملا تھا ۔ عرفان نے اسے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ دفتر کے کام سے جرمنی جارہا ہے ۔ مگر اس بات کو بھی عرصہ ہو چکا تھا ۔

اب وہ اسی شدت سے عرفان کے خط کا انتظار کرتی جس طرح وہ اب تک جمیل کے طلاق نامے کا انتظار کرتی تھی ۔ اس کی ماں کو کلیم کے معاوضے کے تھوڑے روپے مل گئے تھے ۔ اور اس کا بھائی درگا پور سے اپنی آدھی تنخواہ بھیج دیتا تھا ۔ اس امید پر کہ وہ بہت جلد عرفان کے پاس واپس چلی جائے گی اس نے ملازمت کی تلاش بھی نہیں کی ۔ سارا دن وہ ماں کے پاس بیٹھی رہتی ۔ چھوٹی بہنیں شام کو کالج سے لوٹتیں تو ان سے باتیں کرتی ۔

زندگی تاریک تر ہوتی گئی ۔

اس رات کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا ۔ کھانا کھانے کے بعد آنگن کے نلکے پر ہاتھ دھوتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ کوئی اس کا دوست نہیں ۔ اتنی بڑی دنیا میں ، اتنے بڑے عظیم الشان جگمگاتے

ہوئے دارالسلطنت میں، شناساؤں کے اتنے بڑے ہجوم میں کوئی اس کا ہمدرد نہیں ـــ کیوں نہیں ـــ؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا ـــ؟ پرو جیش نے ایک دفعہ اس سے کہا تھا ـــ 'سیتا دیبی! تم ایسی عجیب و غریب لڑکی ہو کہ تم کو اس دنیا میں مسرت ذرا مشکل ہی سے ملے گی ـــ جس طرح کی مسرت کی تمھیں تلاش ہے۔ پرو جیش ـــ!!

" ممی ـــ میں ذرا باہر جا رہی ہوں ـــ" ہاتھ پیر پونچھنے کے بعد اوور کوٹ پہن کر اس نے گلی میں اترتے ہوئے کہا۔ اس کی ماں نے آنگن میں آکر ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

نئی دہلی جانے والی بس تقریباً خالی تھی۔ وہ ایک کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب مجھے ایسا لگ رہا ہے، اس نے اپنے دل میں کہا۔ جیسے رات کے اندھیرے میں بہت سی کشتیاں گھاٹ سے لگ جائیں اور مجھے معلوم نہ ہو کہ ان میں سے میری کشتی کون سی ہے۔

پرو جیش کے جائے قیام پر پہنچ کر اس نے کلرک سے پوچھا۔

" مسٹر چودھری ہیں ؟"

" کون سے مسٹر چودھری ؟"

" جو کلکتے سے آئے ہیں۔"

" وہ جو ایکٹر ہیں ؟"

" نہیں ـــ جو آرٹسٹ ہیں۔"

" اوہ ـــ جی ہاں ـــ ادھر سے آئیے۔"

جب وہ اندر چلی گئی تو کلرک نے سر کھجا کر دل میں کہا۔ خوب ـــ سال ڈیڑھ سال ہوا مجھے یاد پڑتا ہے۔ یہ اسی طرح رات کو آئی تھیں، تب کلکتے والے ایکٹر مسٹر چودھری پوچھتی تھیں۔ یہ سب کیا گھپلا ہے۔

پرو جیش کمار چودھری کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ " سیتا دیبی ـــ" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر بڑے ڈرامائی انداز میں

کہا "مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تم ضرور واپس آؤ گی۔"
گوری کامنی سیتا، سانولی رنگت کے پروجیش کمار چودھری کے بازوؤں میں اس طرح جاگری جس طرح گنگا کا شفاف پانی، جمنا کے تاریک، غضب ناک پانیوں سے جا کر ملتا ہے۔

بہت جلد دہلی کے فن کاروں کے حلقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شری پروجیش کمار چودھری کا "سندھی پیریڈ" شروع ہو چکا ہے۔

چھ مہینے اور نکل گئے ـــــ سیتا پروجیش کے ساتھ "سپرنگ فیسٹول" کے لئے سری نگر گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے لوٹ کے اس کے ہمراہ کلکتے چلی گئی۔ آخر دسمبر میں پروجیش کے جاپان جانے کے بعد وہ دہلی واپس آئی۔ آتے کے ساتھ ہی اس کی ماں نے اسے دو لفافے دیئے۔ ایک پر روم کی مہر تھی۔ بہت مختصر خط تھا:
"تازہ ترین خبریں جو تمھارے متعلق سنی ہیں صحیح ہیں؟
عرفان

دوسرا لمبا لفافہ نیویارک سے آیا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جمیل کا خط ـــــ جمیل کے ہاتھ سے لکھا ہوا اس کا نام ـــــ اس کے ہاتھ لرزنے لگے ـــــ شام ہو رہی تھی، کھڑکی میں جا کر اس نے پڑھنا شروع کیا ـــــ یہ خط بھی بہت مختصر تھا۔
راہل اچھی طرح ہے۔ میں تم کو طلاق دے رہا ہوں۔ تم اب آزاد ہو اور جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ راہل کو میں اگلے سال دلّی جامعہ ملیہ بھیج رہا ہوں تاکہ اپنے ملک میں رہے اور ہندوستانی بنے۔ یہاں وہ ایک دم امریکن ہو گیا ہے۔ وہ دلّی آجائے تو تم فرخندہ بجیا کے ہاں جا کر اس سے مل بھی سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فقط
جمیل

اسے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑکی کے پاس دری پر بیٹھ گئی۔ اور دیوار کے سہارے ٹیک کر ہنومان کی تصویر دیکھنے لگی جو ہتھیلی پر پہاڑ اٹھائے اڑے چلے جا رہے تھے۔

دوسرے روز اس نے عرفان کو اتنا ہی مختصر جواب لکھا ـــــ میں بھائی کا انتظار کر رہی ہوں وہ یہاں آجائے تو ممی اور لیلا، موہنی کو اس کے ساتھ درگاپور بھیج کر فوراً تمھارے پاس پہنچوں گی۔ میرا انتظار کرو ـــــ میں تمھیں ـــــ اور صرف تمھیں چاہتی ہوں۔ اور انت سمے تک اسی طرح چاہوں گی ـــــ

وقت نکلا جا رہا ہے۔ وقت سرپٹ بھاگا جا رہا ہے۔ اب مجھے زیادہ دیر نہیں لگانا چاہئے۔ اس نے لفافہ بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

لیکن اب وقت کی کیا پرواہ ہے۔ اس نے دوبارہ خود کو یاد دلایا ـــــ اب وہ بہت جلد مسز عرفان بن جائے گی۔ وہ اب قانونی طور پر آزاد ہے۔ وہ عرفان سے شادی کرے گی جو انٹلکچوئیل یا بوہیمین یا برافروختہ نوجوان نہیں ہے، سمجھ دار، سیدھا سادا، SOLID آدمی ہے ـــــ پھر وہ پاکستان چلی جائے گی۔ اور پاکستانی شہری کی حیثیت سے اپنے شہر کراچی واپس جائے گی جو اب اس کا نہیں لیکن پھر اس کا ہو جائے گا ـــــ شاید ـــــ پھر وہ ان جگہوں پر دوبارہ جائے گی ـــــ حیدرآباد ـــــ سادہ بیلا ـــــ سکھر ـــــ ملتان ـــــ پنج ند کا وہ ڈاک بنگلہ جہاں رات کی رانی مہکتی تھی۔

جمیل، قمر دونوں نے اس کی روح کو مالامال کرنے کے بجائے الٹا اس کی روح کو گھائل کیا۔ پرو جیش اپنی عظمت میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس کی روح کے قریب پھٹکا ہی نہیں ـــــ لیکن عرفان ـــــ عرفان ـــــ

سیتا میرچندانی ـــــ سیتا جمیل ـــــ سیتا عرفان ـــــ اور اب بہت جلد اس کے پرانے دوست بلقیس، ہما، للتا اس کے لئے غیر ملکی ہوں گے۔ اس کی ماں، اس کے بھائی بہن، سارے ہندوستان میں بکھرے ہوئے اس کے لوگ ـــــ سندھ مہا ساگر اب جن کا نہیں ہے ـــــ لیکن

سیتا میرچندانی سندھو دیش واپس جارہی ہے۔ اسے بالآخر اپنا گھر مل گیا ہے ـــــ عرفان کا خیال اس کے لئے اب ایسا تھا جیسے اماوس کی رات میں دفعتاً چاند نکل آئے۔

دو ہفتے اسے سفر کی تیاریوں میں لگ گئے۔ جس روز وہ جلدی جلدی اپنی ساریاں استری کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی اس کی ماں نے اس کے کمرے میں آکر پوچھا۔

"ـــ اب کہاں چلیں ـــ؟"

"ممی ـــ میں عرفان سے شادی کرنے جارہی ہوں۔" اس نے سوٹ کیس بند کر کے سکون سے جواب دیا۔

دوپہر کے وقت کناٹ پیلس میں ایرلائنز کے دفتر سے باہر نکل کر اس نے سوچا کہ سب دوستوں کو آخری بار خدا حافظ کہے۔ کافی ہاؤس ابھی خالی پڑا تھا ورنہ للتا اور کیلاش کا گروپ عموماً شام کے وقت یا اتوار کی صبح کو وہیں مل جاتا تھا۔

آٹو رکشا میں بیٹھ کر وہ سب سے پہلے نظام الدین ویسٹ گئی۔ یہاں چاروں طرف دور دور تک نئی کوٹھیوں میں زیادہ تر متوسط طبقے کے پنجابی آباد تھے۔ وہ پہلی مرتبہ للتا کے ہاں جارہی تھی۔ بڑی دقت سے اسے للتا کا چھوٹا سا گھر ملا۔ وہ اندر آنگن میں سلیپنگ سوٹ پر شال اوڑھے دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اس کا بچّہ اسکول سے لوٹ کر آنگن میں ٹرائی سیکل چلاتا پھر رہا تھا۔ اس کا میاں ابھی دفتر سے واپس نہیں آیا تھا۔ رسوئیا باورچی خانے میں کھانا بنا رہا تھا۔ سیتا جاکر للتا کے پاس کھرّی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"آج جمعدارنی ابھی تک نہیں آئی۔ سارے گھر میں اتنا کوڑا پڑا ہے ـــ" للتا نے مطمئن آواز میں اس سے کہا۔ اسے زکام ہورہا تھا۔ "اس طرف آجاؤ، ابھی دھوپ وہاں سے سرک جائے گی۔"

نئی ہندوستانی اسٹیج کی یہ بلند پایہ اداکارہ اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ کتنے سکون سے بیٹھی تھی۔

وہ گھنٹہ بھر تک سیتا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے کبھی سیتا سے زیادہ سوالات نہیں کئے۔ جب دھوپ آنگن پر سے اتر گئی تو اس نے کہا آؤ سامنے چل کر بیٹھیں۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر آ گئی۔ جہاں منے سے لان پر دو مونڈھے ڈال کر للتا نے اس سے بیٹھنے کو کہا۔

"اب چلوں ــــ" کچھ دیر بعد سیتا نے کہا۔

"واہ کھانا کھا کر جانا ــــ"

"نہیں دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا موہن کا تو انتظار کر لو ــــ ابھی آتے ہوں گے۔"

"اچھا ــــ"

سامنے چند قدم کے فاصلے پر نظام الدین اولیاء کے مقبرے کی دیوار پر دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ فضا میں بڑی بے چینی اور اداسی تھی۔ سیتا نے سراسیمہ ہو کر پہلو بدلا۔ للتا چپ چاپ بیٹھی سڑک کو دیکھتی رہی۔

نظام الدین اولیاء کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ فضا کا سناٹا گہرا ہو گیا۔

"للتا! اب میں چل ہی دوں۔ کیلاش، پردیپ، کامران سب کو میرا سلام کہنا اور کافی ہاؤس والے سارے کراؤڈ کو ــــ"

"اچھا ــــ"

نوکر آٹو رکشا لے آیا۔

سڑک پر بگولے اڑ رہے تھے۔ وہ للتا کو خدا حافظ کہہ کر آٹو رکشا میں آ بیٹھی۔ آٹو رکشا والے سردار جی کی لمبی سفید داڑھی جاڑے کی سرد ہوا میں لہرا رہی تھی۔

للتا اپنے چھوٹے سے پھاٹک پر جھکی دیر تک سڑک کو دیکھا کی۔

املتاس کے زرد پتے بگولے میں چکر کاٹ رہے تھے۔ دھوپ اب بہت ہلکی پڑ گئی تھی۔

"کہاں چلوں بی بی جی ــــ؟" سردار جی نے باہر کی سڑک پر آ کر پوچھا۔

بلقیس کے گھر میں اس وقت دھوبی کی آمد آمد تھی۔ چھوٹی خالہ پچھلے برآمدے میں سبزی والے سے آلو تلوا رہی تھیں۔ فرخندہ باجی کے بچے اسکول سے لوٹ کر حسب معمول پڑوس کے بچوں کے ساتھ پچھلے لان پر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بلقیس لاؤنج میں بید کی کرسیوں کے غلاف اتارنے میں مصروف تھی۔

"اس کمرے میں آجاؤ —— میں ذرا یہ چادریں وادریں اتارلوں۔" سیتا کو دیکھ کر اس نے سکون کے ساتھ کہا۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار

ڈرائننگ روم کے میز پوش سمیٹ کر وہ فرخندہ باجی کے بیڈ روم میں آگئی۔

"ادھر والا دروازہ بند کر دو۔ بڑا سخت جھگڑ چل رہا ہے۔" اس نے سیتا سے کہا۔ پھر وہ جلدی جلدی سنگھار میز کی چیزیں ہٹاہٹا کر فرش پر رکھنے لگی۔ سیتا جھاڑ پونچھ میں اس کی مدد کرتی گئی۔ بلقیس نے فرخندہ باجی اور دولہا بھائی کی مسہریوں کے پلنگ پوش اتارے، راکھ دانیاں صاف کیں۔ نیلے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہندوستان ٹائمز کے انبار پر سے دھول جھاڑی۔ دولہا بھائی کے کپڑے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ان کو سمیٹا۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار

برابر کے کمرے میں چھوٹی خالہ نے ہیٹر جلایا اور شال میں سر سے پاؤں تک لپیٹ کر اکڑوں بیٹھ گئیں اور ڈلی کاٹنے لگیں۔ باہر سے بچوں کے ہنسنے اور جھگڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سردی اب زیادہ ہوگئی تھی۔ چانکیہ پوری کے ڈپلومیٹک آنکلاو میں اعلیٰ افسروں کے سرکاری فلیٹ اور سفارت خانوں کی عمارات دور دور تک بے نیازی سے بکھری ہوئی تھیں۔ مسرور اور مطمئن انسان ان عمارتوں میں رہتے تھے۔ دور اشوکا ہوٹل گرد و غبار کے دھندلکے میں لپٹا اپنی عظمت میں سربلند اور منجمد سنگ سرخ کے اونچے پہاڑ کی طرح ایستادہ تھا۔ باغوں میں موسم سرما کے پھول کھل چکے تھے۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار

لاؤنج کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کیلاش آیا تھا۔ پردیپ کا فون آیا۔ کسی بچے نے ڈائننگ روم میں چھن سے گلاس توڑا۔ بتول باجی نے برآمدے میں نماز کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

جانکیہ پوری سے روانہ ہو کر سیتا کمشنر لین پہنچی۔ پیلی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑی ہوئی دو تین لڑکیوں نے اسے نمستے کیا۔

گارڈن ہاؤس میں ہما اپنے بچے کو لے کر بیڈ روم میں جا چکی تھی۔ اس کا میاں لندن سے واپس آگیا تھا اور وہ تین چار دن بعد اس کے ساتھ اپنی سسرال جانے والی تھی۔

گارڈن ہاؤس کے باہر گھاس پر دو ننھے منے تبتی کتے کھیل رہے تھے ـــ "چنگ اور چاؤ" شہزاد نے ان کو گودی میں اٹھا کر سیتا سے ان کا تعارف کرایا۔ "یہ دونوں دلائی لامہ کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔"

"اچھا ؟!"

"اقبال لے کر آیا ہے۔ سرحد سے وہ دلائی لامہ کے قافلے کے ساتھ ڈیوٹی پر تھا نا۔ پتہ ہے اقبال اب لفٹننٹ کرنل بننے والا ہے۔"

"ہاؤ ونڈرفل ـــ"

اماں باہر نکل آئیں۔

"اری سیتا۔ بہت دنوں بعد دکھی ـــ کیسی ہے ؟"

"اچھی ہوں اماں۔"

"شام ہو گئی ہے۔ سردی میں مت کھڑی رہ۔"

"اچھا اماں۔"

ـــ اس سمے جب دونوں وقت ملتے ہیں تب مہادیو جی اور پاروتی جی کیلاش سے اتر کر سارے میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک سرد شام کو اماں نے اسے بتایا تھا۔

ہما اور شہزادے سے رخصت ہو کر وہ رات گئے قرولباغ لوٹی۔ صبح سویرے وہ پیرس کے لئے پرواز کرنے والی تھی۔

(۲۲)

جنوری ۱۹۶۱ء کی اس تاریک سہ پہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جب ٹیکسی بولیوار سو شے کی ایک مانوس عمارت کے نیچے جا کر رکی۔ سیتا کو ایسا لگا جیسے وہ صدیوں بعد اپنے گھر واپس آئی ہے۔ کیوں کہ جہاں عرفان ہے وہاں گھر ہے۔ جمیل اس کی نو عمری کا رومان تھا جو چند ماہ بعد ہی ختم ہو گیا۔ قمر کے لاابالی پن نے اسے اپنی طرف سے کھینچا تھا۔ پردجیش چودھری سے اسے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ شہرت اور عزت اور دولت اور مقبولیت ان چاروں چیزوں کی اس کے پاس فراوانی تھی۔ عورتیں اس پر جان دیتی تھیں۔ مرد اس پر رشک کرتے تھے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ ایسا بیکس سا معلوم ہوتا تھا۔ سیتا کو پہلی مرتبہ یہ محسوس کر کے شدید طمانیت ہوئی تھی کہ اب تک اس کو قابلِ رحم سمجھا جاتا تھا مگر اب وہ خود بھی کسی پر رحم کھا سکتی تھی۔ اس رات پردجیش نے کونسٹی ٹیوشن ہاؤس میں سیتا سے کہا تھا ـــــ "سیتا دیبی! میں ساری عمر بے انتہا تنہا رہا ہوں۔ دنیا میری تصویروں کو سمجھ لیتی ہے مگر مجھے نہیں سمجھ پاتی۔ میرے دوست، میرے نقاد، میرے مداح کوئی بھی اصل پردجیش کمار چودھری کو نہیں جانتا ـــ کوئی اس پردجیش چودھری کو نہیں جانتا جو ایک زمانے میں آدھی رات کو کلکتے کی سنسان گلیوں میں اپنی روح کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ اور اب شہرت اور عظمت کے سب سے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی خوش نہیں۔ ان گنت حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئیں۔ سیتا دیبی! ـــ لیکن میری روح کی گہرائی تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکی ـــ سیتا کو معلوم تھا کہ پردجیش کمار چودھری زبردست گپ ہانک رہا ہے مگر پردجیش کے اسی فراڈ پر تو اسے ترس آ گیا ـــ جب وہ بچوں کی طرح اس سے کہتا مجھے تمھاری ضرورت ہے سیتا دیبی ـــ تو اس کے اندر چھپی ہوئی ماں جاگ اٹھتی۔

مگر عرفان ـــ عرفان ـــ

اب تک وہ قانونی طور پر مسز جمیل تھی۔ مگر اب کہ یہ کاغذ امریکہ سے آچکا ہے خود کو مسز عرفان کہلانے کا حق اب کوئی اس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ جلد از جلد شادی کرلیں گے۔ عرفان اب اس کا "عاشق" نہیں ہوگا ــــ اس کا "شوہر" ہوگا۔ مجازی خدا ــــ دیوتا ــــ سب رشتوں سے اتم مقدس خوبصورت، پیارا رشتہ ــــ اس کا قانونی شوہر ــــ

وہ تیزی سے زینہ طے کرکے اوپر آئی۔ اور اپنے فلیٹ کے دروازے پر جاکر زور زور سے گھنٹی بجانے لگی۔

دروازہ کھلا، اندر سے ایک اجنبی صورت نے سر نکالا۔

"کون ــــ؟"

"میں ــــ مادام عرفان ہوں ــــ"

"جی ــــ؟ مادام عرفان ــــ؟" اجنبی نے جو ایک ادھیڑ عمر کا فرانسیسی تھا کواڑ سے آدھے باہر نکل کر اسے غور سے دیکھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ آپ مادام عرفان ہیں؟"

"جی ہاں ــــ کیوں ــــ؟ کیا مطلب؟" غصے اور شرم اور خفت سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"مگر موسیو عرفان تو کل ہی صبح مادام عرفان کے ساتھ دو مہینہ کی رخصت پر کراچی گئے ہیں ــــ اتنے عرصے کے لئے اپنا فلیٹ مجھے دے گئے ہیں ــــ آئیے ــــ مادام ــــ اندر آجائیے۔"

"مادام عرفان ــــ؟" سیتا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں اس طرح کہا جیسے کنویں کے اندر سے بول رہی ہو۔

"وہی مادام ــــ جو پہلے مادموزیل مارسیل دوبیئر تھیں ــــ وہ موسیو عرفان کے دفتر میں کام کرتی تھیں ــــ شادی پچھلے اتوار کو ہوئی تھی مادام ــــ سابق مادموزیل دوبیئر نارمنڈی کی ملکۂ حسن رہ چکی ہیں۔ بہت کم عمر ہیں۔ کوئی انیس سال کی ہوں گی ــــ" رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بالکنی میں جاکر اس نے آسمان کو دیکھا۔

"کئی دن سے سورج نہیں نکلا۔ آج بڑی سردی ہے۔ جانے اب کے سال بہار کتنی دیر میں آئے گی ۔۔۔ آئیے اندر آجائیے ۔۔۔ یہاں ہوا بہت تیز ہے ۔۔۔" ۔

تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار۔

ابھی دن باقی ہے۔ پھر رات ہو گی ۔ پھر صبح ہو گی۔ ایک اور دن ۔۔۔ ایک اور رات۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات

دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔

تجھ کو پرکھتا ہے یہ۔ مجھ کو پرکھتا ہے یہ ۔۔۔ سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات ۔

دن اور رات کا حساب ۔۔۔ زندگی کوئی تمھاری ڈوکومنٹری فلم ہے کہ لے کے ساری زندگی لونگ شاٹ کلوز میں سمیٹ دو۔ بلقیس نے ایک مرتبہ صولت سے کہا تھا۔

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ

ہوا کے جھونکے نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

۱۹۶۰ء

چائے کے باغ
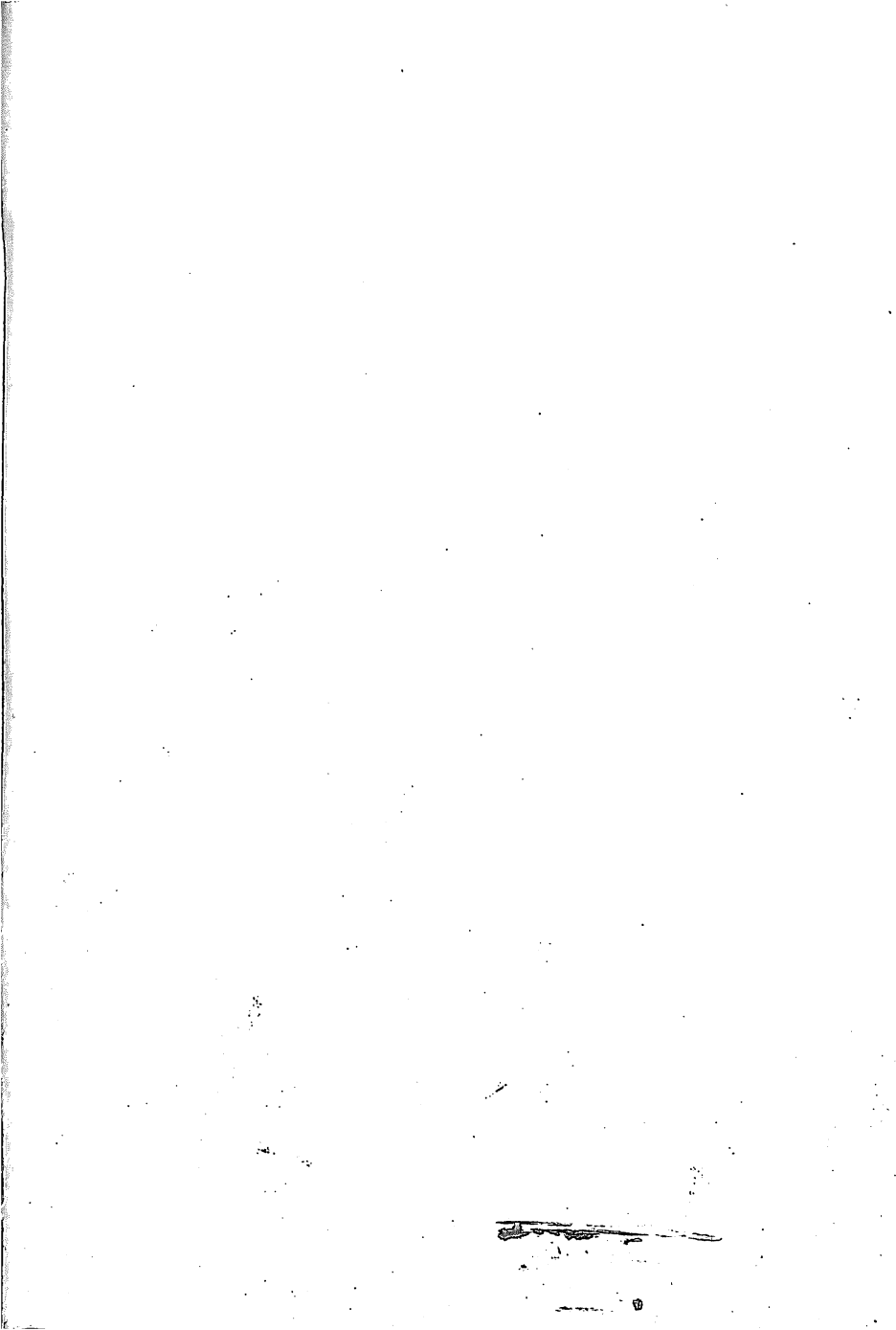
تصویر	آواز
فیڈ اِن	بنگالی لوک دھن
۱۔ کلوز اپ دو پتّیاں اور ایک کلی سوپر امپوز ٹائیٹل	〃 〃 〃
۲۔ چاء کی جھاڑی	〃 〃 〃
۳۔ چاء کا باغ ۔ مزدور لڑکیاں	〃 〃 〃
۴۔ لونگ شوٹ ۔ جنگل ۔ ندی	〃 〃 〃
(ماحول تعمیر کرو)	〃 〃 〃
	〃 〃 〃
۵۔ فنچو گنج کا پل ۔ دریا ۔ کشتیاں	چڑیوں کی چہکار ۔ پانی کی آواز ۔ بھٹیالی گیت ۔
۶۔ اسٹیمر گھاٹ	
۷۔ برم چال ریلوے اسٹیشن	"چائے کے باغات کی یہ حسین رومان پرور فضائیں
۸۔ مزدور مسکراتے چہرے	جہاں دھرتی کے جیالے بیٹے دھرتی کے مدھر
۹۔ چاء کی فیکٹری	حیات بخش گیت گاتے ہوئے چاء کی پتّیاں

۱۰۔ مزدور کام کر رہے ہیں تیار کرتے ہیں اور

۱۱۔ مزدوروں کا لوک ناچ۔ شگفتہ چہرے۔

سیکوئینس ۲

گھنا جنگل، (ماحول تعمیر کرو) ایک جیپ گزر رہی ہے، کلوز اپ۔ بندوقیں سنبھالے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کے مسکراتے چہرے۔

"چاروں طرف اندھیرے جنگلوں میں خوبصورت گھیلے اور ہرن اور دور دور سے آئے ہوئے سیلانی اور شکاری ——"

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ شمشیر نگر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ میں نے لکھنا ملتوی کر کے اسکرپٹ کے پہلے ڈرافٹ کے کاغذات بیگ میں ٹھونسے اور پلیٹ فارم پر اتری۔ شام ہو رہی تھی اور اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ سب ڈویژنل افیسر کو ڈھاکے سے تار دینے کے باوجود وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ کیوں کہ بنگال کے باسی وقت کے متعلق ایک نہایت فلسفیانہ نظریہ رکھتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک دیوہیکل امریکن اور جیت پتلون میں ملبوس سنہرے بالوں والی اس کی میم ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم کے پھاٹک کی طرف جا رہے تھے جس سے ذرا فاصلے پر چند جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں نے سوچا کہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ایس۔ ڈی۔ او۔ کو فون کرنے کی کوشش کروں حالانکہ مجھے مقامی ٹیلی فون سسٹم کا بھی خاصا تجربہ تھا۔

"السلام علیکم"۔ ایک گرجدار آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس ایک باریش بزرگ خوش خلقی سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

شاید یہی سب ڈویژنل افیسر تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آپ ——؟" انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"جی ــــ"

"بڑی خوشی ہوئی، بڑی خوشی ہوئی، مجھے اردو ادب سے اب دلچسپی نہیں رہی کہ وہ روز بروز مزید غیر اسلامی ہوتا جارہا ہے، مگر میری اہلیہ آپ کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔"

"جی" میں نے جھینپ کر انکسار کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی۔

"خاکسار کو بیگ کہتے ہیں۔ میں ٹی ریسرچ پر لگا ہوا ہوں۔ آئیے آئیے۔ میرے ہمراہ تشریف لے چلیے۔ میں ایک عزیز کو لینے آیا تھا۔"

میں نے ان کو بتایا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان کے عزیز (وہ بھی باریش تھے) سامان اٹھوا کر نزدیک آئے۔ جیپ میں اسباب رکھا گیا اور اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتے ہم لوگ سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔ امریکن کی جیپ دھول اڑاتی آگے آگے جا رہی تھی۔ دھول سے بچنے کے لئے میں سلولائیڈ کے پردے سے سٹ کر بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد گاڑی چلاتے چلاتے انھوں نے دفعتاً مڑکر مجھے مخاطب کیا "عزیزہ! اسلامی ناول لکھئے، ملّت کی کشتی" گیر بدلتے ہوئے انھوں نے کہا "ڈانوا ڈول ہے۔"

"جی ــــ"

"معاف کیجیے گا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے عین وسط میں ہے اور آج بالکل خالی پڑا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے رسان سے جواب دیا۔ "میں مشرقی پاکستان کے دور افتادہ ڈاک بنگلوں میں رہنے کی عادی ہوں۔" باریش بزرگ (وہ بزرگ قطعی نہیں تھے۔ سینتالیس اڑتالیس سال کے رہے ہوں گے۔ مگر ایک نہایت رعب دار سیاہ داڑھی اور بھاری بھرکم جثے نے شان بزرگی عطا کر رکھی تھی) میرے متعلق بہت خلوص کے ساتھ فکر مند نظر آرہے تھے۔ میرے اس طرح تن تنہا اور بے پردہ جنگل جنگل گھومنے سے ان کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ میں نے سوچا اور فوراً سر ڈھانپ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کلمہ جانتی ہیں؟" انھوں نے اچانک سوال کیا۔

"جی ۔"

"پانچوں کلمے؟"

"جی ۔"

"تعلیماتِ قرآنی پر عمل پیرا ہیں؟" پھر اسی اچانک پن سے وہ اپنے رشتے دار کی طرف مڑے۔ "میں کہتا ہوں ـــــ نوجوانو ـــــ اسلام کی خاطر انجن بن جاؤ ـــــ انجن بن جاؤ ـــــ" لفظ "انجن" انھوں نے تقریباً گرج کر ادا کیا۔ رشتے دار نے سر ہلایا۔

جیپ ڈاک بنگلے کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ "رات کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمائیے۔ میں اور میری اہلیہ گھنٹے بھر میں آن کر آپ کو لے جائیں گے۔" بارِیش بزرگ نے مجھ سے کہا۔

چوکیدار لپکا ہوا آیا۔

"کہو نور العباد۔ کیسے ہو؟" میں نے خوش ہو کر اس سے پوچھا۔ چھدری داڑھی اور نیلی تہمد والے نور العباد کی باچھیں کھل گئیں۔ بارِیش بزرگ نے خدا حافظ کہا اور جیپ زنّاٹے سے باہر نکل گئی۔ نور العباد نے ایک کمرہ کھول کر لالٹین میز پر رکھ دی۔

"تم کو یاد ہے نور العباد۔ ہم چار سال ہوئے یہاں آئے تھے؟"

"خوب یاد ہے مس صاحب۔ آپ لوگ ادھر مانی پوری ناچ کی فلم بنانے آیا تھا۔ شوٹنگ کرتا تھا۔"

"تمھارے بیوی بچے راضی خوشی ہیں نور العباد؟"

"اب چار ٹھو لڑکا اور ہو گیا ہے مس صاحب۔"

"اب کتنے بچے ہیں تمھارے؟"

"اب سب ملا کر نو ٹھو لڑکا ہے مس صاحب۔" اس نے خوشی سے جواب دیا۔ "میں چار لاتا ہوں۔"

مانوس کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر میں نے اطمینان سے سانس لیا۔ لوہے کا پلنگ ـــــ،

بھدّی، مدھم آئینے والی سنگھار میز، خاکی مچھر دانی، غسل خانے کی بالٹی اور ٹب میں تازہ پانی بھرا تھا اور تام چینی کا جگ اور چلمچی کھردری سفید میز پر سلیقے سے دھری تھی۔ کھڑکیوں سے نیچے اونچی اونچی گھاس لہرا رہی تھی۔ دور باورچی خانے میں لالٹین ٹمٹماتی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں شاگرد پیشے کی طرف گئی۔ نورالعباد کی سانولی سلونی بیوی بغیر بلاؤز کی اودی ساری لپیٹے دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کی بوڑھی ساس فرش پر بیٹھی نواں پوتا کھلا رہی تھی۔ میں ان دونوں سے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں باتیں کرتی رہی۔ نورالعباد نے باورچی خانے کے دروازے میں سے جھانک کر آواز دی۔ "مس صاحب چاء تیار ہے"۔

باہر ہارن بجا۔ بارلیش بزرگ اور ان کی اہلیہ آچکے تھے۔

ٹی ریسرچ اسٹیشن کے بنگلوں میں سے ایک کے سامنے بارلیش بزرگ نے کار روک لی۔ (اس وقت وہ اپنی سیاہ رنگ کی اسٹوڈی بیکر میں آئے تھے) برآمدے میں داخل ہو کر لیٹر بکس پر لکھے ہوئے ان کے پورے نام پر نظر پڑی۔ ایم۔ ایس۔ اے۔ بیگ، اس کے ساتھ سائنس کی متعدد ڈگریاں وابستہ تھیں۔ ان کی اہلیہ مشرقی یو۔ پی۔ کی ایک شرمیلی، کم عمر گھریلو لڑکی تھی جس نے کاسنی چھینٹ کے غرارے اور ڈوریئے کی چمپئی قمیض پر ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا نام کلثوم تھا۔ ڈرائنگ روم میں بہت سے مہمان جمع تھے جنھوں نے بارلیش بزرگ کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "آہاہا۔ مرزا صاحب آگئے"۔ مہمانوں میں دو ترک بھی شامل تھے جو چائے کی کاشت کی ٹریننگ کے لئے انقرہ سے آئے تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے اپنی کزن زرینہ کو ہری نگر ٹی اسٹیٹ فون کرنا چاہا مگر فون خراب ہو چکا تھا۔

"چلئے ہم لوگ کلب چلتے ہیں۔ وہاں آج فلم شو ہے۔ اس لئے یقیناً آپ کی ہمشیرہ بھی آئیں گی"۔ بارلیش بزرگ نے کہا۔

"کلب کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں۔ کوئی پچیس میل ہوگا۔"

"پچیس میل؟" نووارد رشتے دار نے دہرایا۔

"چائے باغان کے فاصلے اسی نوع کے ہیں برادر۔ سلہٹ میں ایک سو بیس باغات ہیں اور جب ہم لوگ دوستوں سے ملنے کی غرض سے نکلتے ہیں تو سو پچاس میل کا پالا مار کر آتے ہیں۔ آپ کے برادر نسبتی کی اسٹیٹ" باریش بزرگ نے اب مجھے مخاطب کیا۔ "یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔"

کھانے کے بعد موٹریں اور جیپ گاڑیاں کلب روانہ ہوئیں۔ باریش بزرگ کی اہلیہ نے بچے کو سلا کر جلدی سے سیاہ برقعہ اوڑھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آن بیٹھی۔ "میں پکچر دیکھنے کے لئے کبھی کبھار ہی کلب جاتی ہوں۔ ان کو یہاں کی سوشل زندگی پسند نہیں۔"

"خدا کرے زرینہ کلب میں مل جائے۔ ورنہ بڑی کوفت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "میں تو ارسلان بھائی کو پہچانتی بھی نہیں۔"

"آپ اپنے برادر نسبتی سے آج تک نہیں ملیں؟" باریش بزرگ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"آپ کے برادر نسبتی کلکتے کے بنگالی ہونے کے ناتے معقول اردو بولتے ہیں۔ اور بہت صالح مسلمان ہیں۔" باریش بزرگ نے مجھے مطلع کیا اور کار چلانے میں مصروف رہے۔

کلب کے احاطہ میں ان گنت موٹریں کھڑی تھیں۔ ہفتہ وار فلم شو کی وجہ سے دور دور کے باغات سے لوگ آئے تھے۔ قدیم برطانوی عہد میں بنی ہوئی عمارت کے اندر اسکاٹش ٹی پلانٹرز، قریبی اضلاع کے نئے کارخانوں کے چند امریکن اور جرمن، فینچوگنج کے نئے کھاد کے کارخانے کے جاپانی انجینیر اور ان کی خواتین، چار کے باغات کے نوجوان پاکستانی عہدیدار اور ان کی الٹرا ماڈرن بیگمات جمع تھیں۔ باغات میں عموماً ملک کے اونچے طبقے کے نوجوان کام کرتے تھے کیوں کہ یہ ایک فیشن ایبل اور انتہائی "ہائی کلاس" ملازمت تھی۔ یہ سب زیادہ تر مغربی پاکستان سے آئے تھے۔

میں کلثوم کے ساتھ چمڑے کے ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہال کی روشنیاں بجھیں اور ایک معمولی سا امریکن فلم شروع ہوا جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

باہر گھپ اندھیرے میں سینکڑوں میل تک چار بگان، جنگل اور گاؤں پھیلے ہوئے تھے پیچدار راستے، ندیاں اور ابدی سناٹا۔ نارنگی کی ڈالیوں کی موسیقی ریز سرسراہٹ، تاریکی اور وسعت اور تنہائی کے اس بھنور میں اس کلب کے اندر یہ تین چار سو افراد مخملیں، دبیز، جہازی صوفوں میں دھنسے ڈورس ڈے کا تماشہ دیکھنے میں منہمک تھے۔ ان کا اس دھرتی سے کوئی رشتہ نہ تھا سوائے روپے کے۔ کوئی ہمدردی نہ تھی، کوئی تعلق نہ تھا۔ اور انہی افراد کی طرح کے لوگ صرف چند میل دور سرحد کے اس پار، اسی معطر دھرتی، اسی زرخیز مٹی پر اسی سریلے اندھیرے میں آسام کے چار بگان میں اسی طرح برطانوی وضع کے کلبوں میں بیٹھے اسی قسم کی فلم دیکھنے میں مصروف ہوں گے۔ یہی ذہنیتیں، یہی تراش خراش اور وضع قطع، یہی اندازِ گفتگو، یہی دلچسپیاں، وہاں بھی دیسی عہدیداروں کی بیویاں اسی قسم کی ساریاں پہنے ایسی ہی سطحی گفتگو میں مشغول ہوں گی۔ ان سب لوگوں کا اس قدیم، دکھی، زخمی دھرتی سے کیا سمبندھ تھا؟ زمین کا رشتہ انسان سے کس طرح بندھتا ہے؟ کس طرح ٹوٹتا ہے؟ کس طرح استوار کیا جاتا ہے؟

روشنیاں جلیں۔ کلثوم نے فوراً منہ پر سیاہ جارجٹ کی نقاب گرالی۔ میں نے کھڑے ہو کر زرینہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور کلثوم بانو کے ساتھ ہال کے سرے پر آگئی۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے میرا نام لے کر خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری پھوپھی زاد بہن زرینہ سبز ساری پہنے، کندن کے زیوروں میں جگ مگ کرتی کھڑی تھی۔ ہم دونوں دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

اس اثنا میں کلثوم مجمع میں کھو چکی تھی۔ میں اور زرینہ باتیں کرنے کے لئے جلدی سے پاؤڈر روم میں گھس گئے۔ ایک اسکاٹش بڑھیا نے مسکرا کر آنکھیں پٹپٹائیں۔

"مسز مک ڈانلڈ —" زرینہ نے جلدی جلدی کہا "یہ میری کزن ہے۔ ہم تقسیم کے بعد

آج ملے ہیں۔" پھر اس نے پاؤڈر روم میں داخل ہونے والی مزید شناسا خواتین سے میرا تعارف کرانا شروع کر دیا۔

"زرینہ میں ذرا باہر جا کر اپنے میزبانوں کا شکریہ تو...."

"مسز عثمانی ــــ یہ میری کزن ــــ کیوں کہ میں آ۔ صرف تین سال ہوئے لکھنؤ سے شادی کر کے ــــ شادی ہو کے ــــ یہاں آئی ہوں ــــ اس لئے اب تک ــــ" اس نے ہڑبڑا کر پھر داستان شروع کی۔

"زرینہ، میرے میزبان ــــ"

میں جلدی سے باہر نکلی اور ہال میں کلثوم سے ٹکرا گئی۔

"آپ کے دولھا بھائی ارسلان احمد صاحب آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ اتنے میں بارلیش بزرگ بھی ہجوم میں سے نمودار ہوئے۔ میں نے ان دونوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور وہ میاں بیوی ہال کے بڑے دروازے سے نکل کر پارک کی طرف چلے گئے۔

خواتین کے انبوہ کلب کے کینٹین اسٹور کا رخ کر رہے تھے۔" چلو مجھے بھی تھوڑا سا سامان خریدنا ہے۔" زرینہ نے میرے قریب آکر کہا۔ اور اپنے شوہر سے ملوایا۔

اسٹور کے ایک کاؤنٹر کے پاس وہ سنہرے بالوں والی میم کھڑی تھی جسے میں نے شام ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ بہت سے حضرات اس کے گرد جمع تھے جن سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

"یہ عورت امریکن ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستانی ــــ میرا مطلب ہے پاکستانی ہے۔ شرط لگالو۔" دور سے اسے دیکھ کر زرینہ نے میرے کان میں کہا۔

"تم جانتی ہو اسے؟"

"نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ شاید تم بھی واقف ہو۔" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک نظر غور سے دیکھنے کے بعد میری کزن نے جواب دیا۔

ارسلان بھائی نے قریب آکر کہا "زرینہ مسٹر اور مسز فریزر بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کی جیپ خراب ہوگئی ہے۔ یہ لوگ کرنل مورگن کے یہاں جائیں گے۔" ارسلان بھائی اسٹور سے باہر چلے گئے۔ زرینہ امریکن خاتون کے پاس مارچ کرتی ہوئی پہنچی اور بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اردو میں پوچھا "معاف کیجیے گا۔ آپ راحت کاشانی ہیں نا؟"

میم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چند لحظوں تک دیکھتی رہی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اردو نہیں جانتی۔

"اوہ۔ کم آن راحت" زرینہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میرا نام ۔۔" میم نے بڑے وقار سے ایسی انگریزی میں جس میں امریکن لہجے کا برائے نام شائبہ تھا، جواب دیا "مسز چارلس فریزر ہے۔ ریٹا فریزر۔"

دوسرے لمحے چارلس فریزر نے اسے آواز دی اور وہ باہر چلی گئی۔

"اور تو اور ــــ یہ نام بھی بوگس ہے۔ شرط لگالو" زرینہ نے کہا۔

ارسلان بھائی کار کا دروازہ کھولے ہمارے منتظر تھے۔ مسٹر اور مسز فریزر ان کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار کلب سے نکل کر ٹی اسٹیٹ کی سمت روانہ ہوئی۔ ارسلان بھائی اور مسٹر فریزر باتوں میں منہمک تھے۔

کچھ دیر بعد زرینہ نے شرلک ہومز کے سے خطرناک اور پراسرار انداز میں ہونٹ لٹکا کر اور آگے جھک کر ذرا آہستہ سے کہا "مگر کمال ہے واقعی راحت تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ اور کیا عجیب حسنِ اتفاق ہے۔"

میم نے مطلق کوئی جواب نہ دیا۔ گو اب اس کا بشّاش بے تکلفی کا لہجہ غائب ہوچکا تھا جس میں وہ اب تک ارسلان بھائی سے تبادلہ خیال کر رہی تھی۔ "ہم لوگ کینیڈا واپس جائیں گے تو آپ کا یہ حسین ملک بہت یاد آئے گا۔ حالانکہ یہ میرے وطن امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ امریکہ آج تک نہیں گئی۔" زرینہ نے بہت آہستہ سے مجھے گوش گذار

کیا۔ مگر خدا کی قسم۔ واہ۔ واہ۔ کیا قابلِ تعریف خود اعتمادی ہے۔ جواب نہیں۔"
ہم لوگ پو پھٹتے منزلِ مقصود پر پہنچے۔ وادی کے نشیب میں کرنل مورگن کے بنگلے پر اموکوں کو اتار کر گھر کا رخ کیا۔

زرینہ کا بے حد خوبصورت اور شاندار بنگلہ چائے کے باغات میں گھری ایک نیچی سی پہاڑی پر استادہ تھا۔ اس کا ماحول خالص انگریزی تھا کیونکہ ارسلان بھائی سے قبل اس ٹی اسٹیٹ کے منیجر ہمیشہ انگریز ہوتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ڈرائنگ روم کے سرخ اینٹوں والے گہرے آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ مختلف اقسام کے کتے ادھر ادھر محوِ خواب تھے۔ جگمگاتے سرخ روغنی فرشوں والے جھل جھل کرتے کمروں میں پھولوں کی افراط تھی۔ غسل خانوں کے چینی کے ٹبوں کے نیلے پانی پر ربر کی بطخیں تیر رہی تھیں۔ مسہریوں پر اصل لیس کے پلنگ پوش بچھے تھے۔
صبح کو بیرے نے پھولوں سے گھرے برآمدے میں بریکفاسٹ سرو کیا۔ دوپہر کے کھانے شام کی چائے اور رات کے کھانے کے وقت میز کی چادر، نیپکن، برتن اور اسٹرلنگ سلور کے چھری کانٹے ہر مرتبہ مختلف تھے۔ اب میں یہ توقع کر رہی تھی کہ ارسلان بھائی ڈنر سے پہلے ڈنر جیکٹ پہنیں گے۔ زرینہ صبح کو برآمدے میں بیٹھ کر خواتین کے ساتھ ماہ جونگ کھیلتی تھی یا دوسری خواتین کے گھروں پر جا کر ماہ جونگ کی محفل منعقد کرتی تھی۔
"یا اللہ۔ زرینہ۔" میں نے بڑبڑا کر کہا۔
"کیوں۔ کیا ہوا؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔
"حد ہوگئی۔"
"مت بھولو کہ تمہارے لڑکپن تک تمہارے گھر کا بھی تقریباً اسی قسم کا ماحول تھا۔"
"ہاں۔ مگر اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔"
"کوئی نہیں بدلا ودلا۔"

"تم کام کیوں نہیں کرتیں ؟"

"کیسا کام ؟"

"ارے اپنی ڈاکٹری اور کیا ۔"

"یار ۔" اس نے خانساماں کو لنچ کا آرڈر دیتے ہوئے کہا ۔ "اب کیا ساری عمر فرض ہے کہ کولہو میں جُتے رہیں ۔ نا بھائی ، اب ہم بہت دنوں کام وام نہیں کریں گے ۔ ہم تو بس ماہ جونگ کھیلیں گے اور کلب کے چیرٹی بازار آرگنائیز کریں گے ۔ ویسے اب میں ایک صحافی خاتون بن گئی ہوں ۔" اس نے ذرا شرما کر انکسار کے ساتھ اضافہ کیا ۔

"واقعی ۔ یہ تو بہت عمدہ بات ہے ۔" میں نے خوش ہو کر دریافت کیا ۔ "مورننگ نیوز یا پاکستان ٹائمز ؟"

"نہیں ۔ میں کراچی کے سوسائٹی ماہنامے "مرر" کے لئے سلہٹ ٹی گارڈنز کا خبرنامہ لکھتی ہوں کہ فلاں بیگم فلاں ڈنر میں نارنجی ساری پہنے بے حد چارمنگ لگ رہی تھیں ۔ یو نو ، دَیٹ سورٹ آف تھنگ ۔"

"آہا ۔"

وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی ۔ "آل فاؤنڈ ۔ زندگی آل فاؤنڈ ہونی چاہئے ۔ جیسی میری زندگی ہے ۔" پھر اس نے یک لخت بڑے ڈرامائی انداز میں کہا ۔ "میں ایک PARASITE خاتون ہوں ۔"

"آپ ایک بوگس خاتون ہیں ۔" میں نے جواب دیا ۔

یہ اتوار کا شگفتہ سہانا دن تھا ۔ ہم بریکفاسٹ کے بعد سامنے کے برآمدے میں بیٹھے تھے ۔ میں نے ارسلان بھائی سے کہا تھا کہ میں ڈوکومنٹری کی تیاری کے سلسلے میں مزدوروں کے حالات جاننا چاہتی ہوں ۔ اور اب ایک نمائندہ گروہ کا انتظار کر رہی تھی ۔

"لو تمھارے مزدور آ گئے ۔" دفعتاً زرینہ نے کہا ۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا ۔ مخملیں گھاس

پر سے گزرتا پوربی مزدوروں کا ایک گروہ بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اب تم شروع کرو اپنا انٹرویو۔" زرینہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ مزدوروں کے مکھیا نے سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈنڈوت اور پالاگن کیا۔ اس کے ساتھی زمین بوس ہوگئے۔ زرینہ نے متانت سے سر ذرا سا خم کر کے ان کی بندگی کا جواب دیا۔ میں ہکّا بکّا اسے دیکھا کی۔ میری کزن زرینہ جو لکھنؤ میڈیکل کالج کے لفٹ ونگ گروپ کی جوشیلی لیڈر رہ چکی تھی۔

مزدور مرد اور عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ذرا خائف سے نظر آرہے تھے۔ ارسلان بھائی ڈریسنگ گاؤن پہنے اندر سے نمودار ہوئے اور بید کی کرسی کھینچ کر ان کے مقابل میں فروکش ہوگئے۔

"آہا۔" میں نے ان کو چڑایا۔ "بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے ۱۹۳۲ء میں ضلع غازی پور کا انگریز کلکٹر اپنے دربار میں بیٹھا ہو —— تم لوگ —— بارہ بنکی سے آئے ہو یا غازی پور سے؟ کون ضلع سے آئے ہو ——؟" میں نے مزدوروں سے پوچھا۔

"سیتا پور سے بیگم صاحب ——" مکھیا اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے تعجب اور پریشانی ہویدا تھی۔

"گھبراؤ نہیں رام نندن۔ تمھاری لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔ یہ بٹیا بڑی دور کراچی سے آئی ہیں۔ تم لوگوں کا سینما بنانے۔" ارسلان بھائی نے کہا۔

"سلیما۔" ایک نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔

"پھوٹو کھینچیے۔" عورتوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

"تو کب آئے تم لوگ یہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"بہوت جمانا ہوا۔"

"اتنی دور سلہٹ کیسے آئے؟"

"اسی کی کھاتر بٹیا۔" بوڑھے مکھیا رام نندن نے اپنا پچکا ہوا پیٹ بجایا۔ "صاحب لوگ

کاشی اور کلکتے جاتا تھا۔ مجور بھرتی کرنے۔ اس نے جنگل با بند و بست کیا۔ ذکھل کیا۔ پھر سردار لوگ؟"

"سردار لوگ مزدوروں کے ہیڈ مین تھے۔ گرگے ـــــ" ارسلان بھائی نے مکھیا کی بات کاٹ کر مجھ سے وضاحت کی "سو سال قبل انگریزوں نے مشرقی یو۔ پی۔ کے بھوکے ننگے کسانوں کو اپنے گرگوں کے ذریعہ یہاں بلوایا تھا۔ یہ گرگے یا سردار انگریزوں کا دیا ہوا روپیہ خود رکھ لیتے تھے اور مزدوروں کو صرف دو وقت کی روٹی دیتے تھے۔"

ارسلان بھائی کی بات سن کر مکھیا نے سر ہلایا اور کہنا شروع کیا "سردار لوگ ہمرے باپ دادا کو اور ہم کو روٹی کپڑے کا لالچ دے کر ادھر لے آیا۔ او جمانے میں ریل کا رستہ نہ رہی۔ ہمرے باپ دادا ماٹی کاٹے رہن۔"

"ماٹی کاٹے رہن؟" میں نے دہرایا۔

"ارے دادا پہلے باگ میں کام کرین۔ پھر جا کر ماٹی کاٹین۔ ریل بچھائے کھاتر ـــــ" ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"رام نندن! بٹیا کو سب کے نام بتاؤ پہلے ـــــ" ارسلان بھائی نے کہا۔

"ہم رام نندن۔ ای ہمری بہن گلجریا۔ ای ترلوچن۔ ای سکھ نندن۔ ای رام کرن۔ ای بس پیتا۔ ای پاربتی ـــــ" سب نے سر ہلائے۔ پاربتی ایک اٹھارہ سالہ سانولی سلونی لڑکی تھی اور بری طرح لجا رہی تھی۔

"اسے تم اپنی فلم میں ضرور لو۔ بہت اچھا ناچتی ہے۔" زرینہ نے مجھ سے کہا "بلکہ اپنا مرکزی کردار اسی کو بناؤ۔ بہت فوٹو جینک ہے۔"

"اور تم یہاں کون کون تہوار مناتے ہو؟" میں نے مکھیا سے دریافت کیا۔

"ارے اب رام لیلا نہیں ہوتا بٹیا۔ رام نومی۔ کھچڑی۔ ہولی۔ دیوالی کچھ نہیں ہوتا۔"

"کیوں ـــــ؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے ارسلان بھائی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے انگریزی میں کہا۔

"پھر بتاؤں گا۔"

پھر فلم میں مزدوروں کے بشاش تہوار کیسے دکھائے جائیں ؟ خیر کچھ نہ کچھ اسٹیج کرلیا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

" اور تم ترلوچن ـــــ ؟" میں نے ایک مزدور سے پوچھا۔

" ہم بٹیا دس سال کی عمر میں اعظم گڈھ سے آئے رہن۔ ضلع اعظم گڈھ، تھانہ چریاکوٹ، بڑا باپ مہاجن سے پچاس ساٹھ روپیہ کرجہ لیا۔ مہاجن روپئے میں چھ آنے سود لیت رہا۔ بڑا باپ اُو ادا نہیں کرسکا تو مجوروں میں بھرتی ہوکر ہیاں آگیا۔ دس برس میں پچاس روپیہ جوڑکر پھر دیس واپس گیا۔"

"کب کی بات ہے ؟"

" جب فورڈ گاڑی نہیں چلی تھی۔"

" اور تم گلزریا ؟"

" ہم برٹش کے راج میں مرجاپور سے کلکتے آئے رہے۔ وہاں سے گوالندو گھاٹ آئین۔ پھر ہمرا آدمی مارکھا گیا۔"

" پاکستان کب بنا تھا ؟ـــــ یاد ہے ؟"

" پاکستان بنے تو ڈھیر دن ہوگیا بٹیا۔"

دفعتاً میں نے سوچا کہ اسکرپٹ کے لئے یہ انٹرویو بالکل بےکار ہیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد مشرقی یو۔پی کے ہزاروں فاقہ کش کھیت مزدوروں کو جہازوں میں بھر بھر کے ویسٹ انڈیز، فی جی، ماریشس اور دوسرے ملکوں کو بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ برطانوی پلانٹیشنز پر غلاموں کی طرح کام کرتے تھے اور آج تک وہاں اور یہاں ان کی اولاد تقریباً اسی حالت میں موجود ہے۔

کچھ دیر بعد مزدور واپس چلے گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ فورڈ کونسل آن کررکی جسے

ایک کتھئی بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوش شکل لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک سفید بالوں والی انگریز ضعیفہ بیٹھی تھیں۔ اور تین بچے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پچھلی سیٹ پر آیا کے ساتھ براجمان تھے۔ زرینہ ڈرائیور پر جا کر اس لڑکی سے باتیں کرنے لگی۔ اور حسبِ معمول میری آمد کے واقعے پر روشنی ڈالی "یہ صنوبر ہے" زرینہ نے مجھ سے کہا "اور مسز ظفر علی صنوبر کی ممی" ضعیفہ شفقت سے مسکرائیں۔

"ابا کا خط آیا ہے۔ وہ لوگ سبھا کے لئے کانگریس ٹکٹ پر کھڑے ہو رہے ہیں" صنوبر نے زرینہ سے کہا۔ انگریز نژاد ہونے کے باوجود اس کا اردو لب و لہجہ حیرت انگیز حد تک لکھنوی تھا۔

اتنے میں ایک اور کار اندر داخل ہوئی۔ چونکہ اتوار کی صبح تھی، لوگ باگ ایک دوسرے پر کال کرنے یا سیر کرنے کے لئے نکلے تھے۔ نو وارد ایک اسکاٹش جوڑا تھا۔ انھوں نے زرینہ سے کہا کہ کرنل مورگن نے مسٹر اور مسز فریزر کے اعزاز میں رات کے ڈنر پر ہم سب کو مدعو کیا ہے۔ فریزرز کل صبح چند روز کے لئے چنڈی چیرہ ٹی اسٹیٹ، چاند پور بگان چلے جائیں گے۔

"جاؤ گی؟" زرینہ نے صنوبر سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے مختصراً جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

"اور تم اور ارسلان ——؟" مسٹر میلکم میک فرسن نے زرینہ سے دریافت کیا۔

"میری کزن ——" زرینہ نے حسبِ معمول وضاحت کی "ہم لوگ مدتوں بعد ملے ہیں۔ تین چار دن تک متواتر باتیں کریں گے۔ اس لئے فرصت نہ ہوگی"

مسٹر و مسز میلکم میک فرسن کے جانے کے بعد میں نے اپنے صدر دفتر کراچی تار بھجوایا۔

"ٹی گارڈن ورکرز مائی نورٹی کمیونٹی پکچر میں اسلامی ماحول کس طرح دکھایا جائے۔ فوراً مطلع کیجئے"

اس کے بعد میں تار کے جواب اور ڈھاکہ سے کیمرہ مین کی آمد کے انتظار میں اطمینان سے گپیں ہانکنے کے لئے بیٹھ گئی۔

رات کو کھانے کے بعد ارسلان بھائی سونے کے لئے چلے گئے۔ میں اور زرینہ ڈرائنگ روم میں آگ کے سامنے بیٹھے سُوں سُوں کر رہے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بنگال میں اتنا جاڑا بھی پڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ بیرے نے لکڑی کے کندے آگ میں ڈالے اور کافی کی میز بیگم صاحب کے سامنے حاضر کی۔ "بتیاں بجھا دو۔" زرینہ نے اس سے کہا۔ وہ روشنیاں بجھا کر اور پردے برابر کر کے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ وسیع گہرے کمرے میں اب صرف آتشدان کے شعلوں کی روشنی پھیل رہی تھی۔ قہوہ بناتے ہوئے جب زرینہ کا سایہ دیوار پر پڑا تو میں نے جانا کہ وہ شہرزاد کا سایہ ہے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا۔ "عزیزہ! کیا تم راحت کاشانی کے معاملے پر کچھ روشنی نہیں ڈالو گی؟"

اسکرپٹ کے کاغذات قریب ایک تپائی پر پڑے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈال کر اس نے کہا۔ "ہاں۔" میں پرچھائیں کو دیکھتی رہی جس کے ہونٹ ہلے اور داستان شروع ہو گئی۔

"فلیش بیک ـــــ اے خوش خصال، نیک خو، پریدہ مو عزیزہ ـ عشق ہے تازہ کار تازہ خیال۔ ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال۔ کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے۔ کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے۔"

"سبحان اللہ۔" میں نے کہا۔

"بی بی۔ بلبل نوا سنج ہزار داستاں طوطی زمزمہ ریز خوش بیاں گلشنِ تقریر میں یوں چہکا ہے کہ عرصہ پچیس سال کا ! عروس! بلاد کلکتہ میں تین دوست رہتے تھے کہ تینوں ایک جان تین قالب تھے۔ نام ان کے شمشاد، قاسم اور واجد تھے۔ تینوں مشرقی یو۔ پی۔ کے ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جو عرصۂ دراز سے کلکتے میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ تینوں نے پریذیڈنسی کالج میں اکٹھے پڑھا اور جنگ شروع ہوئی تو شمشاد اور واجد اکٹھے ج میں بھرتی ہو گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ شمشاد کا تقرر شیلانگ میں ہوا۔ واجد کی محاذ سے لوٹنے کے بعد کلکتے میں پوسٹنگ ہوئی۔ قاسم جو انجینیر تھا بورڈر سروے میں ملازم ہو گیا۔ اب اس معبودِ حقیقی کی مصلحتوں کے

قربان جایئے کہ شیلانگ میں ڈاکٹر ظفر علی بھی رہتے تھے کہ جو درحقیقت باشندے لکھنؤ کے تھے مگر مدت مدید سے آسام میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ان کی بیوی انگریز تھیں اور اکلوتی لڑکی صادقہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میجر شمشاد نے جب صادقہ کو دیکھا تو ہزار جان سے اس پر عاشق ہوا اور فوراً پیغامِ مناکحت اس کے والدین کو بھجوایا۔ صادقہ نے ابھی سینیر کیمبرج بھی نہ کیا تھا کہ اس کی شادی میجر شمشاد سے ہوگئی۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے صادقہ کا نام صنوبر رکھا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے واجد اور قاسم بھی کلکتے سے شیلانگ آجاتے۔ صنوبر سگھڑ بہاوج کی حیثیت سے ان کی خاطریں کرتی اور دونوں کے بیاہ کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی۔ لیکن جب صنوبر کو معلوم ہوا کہ قاسم کی شادی ہوچکی ہے اور اس کی بیوی پٹنے اپنے میکے میں رہتی ہے تو اسے بڑا غصہ آیا کہ اس نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ تس پر قاسم نے قہقہہ لگا کر خوب اسے بنایا۔

" رہ گیا واجد۔ تو اب کچھ عرصے سے وہ شادی کے نام پر چُپ ہو جاتا۔ قاسم صنوبر سے کہتا کہ وہ بڑا گھاگ ہے۔ اس نے کلکتہ میں کوئی سلسلہ شروع کر دیا ہے اور شمشاد جو ایک بیحد محبت بھرے دل کا مالک تھا، اپنے دونوں دوستوں کو سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔

" اب میں تم کو ایک بات بتا دوں" زرینہ نے شال لپیٹتے ہوئے کہا " یہ چاروں شمشاد، صنوبر، قاسم اور واجد سب ہی اوسط درجے کے لوگ تھے۔ ان کو کتابوں سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی شعور یا آرٹ وارٹ سے کوئی ربط نہ تھا۔ ہلکے پھلکے لوگ تھے جو اس طبقے میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اچھی ملازمتیں، مستقبل کی ترقی اور آسایش ان کی زندگیوں کے محور تھے۔ صنوبر بھی سیدھی سادی لڑکی تھی اور خود کو ٹھسے کی لکھنوی بیگم سمجھنے کی شوقین۔ قصہ کوتاہ چاروں اپنی اپنی جگہ بہت شریف اور ڈھنگ کے لوگ تھے۔ ان میں آوارہ یا گھٹیا کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

کئی سال گذر گئے۔ جنگ کے اخیر دنوں میں شمشاد قاہرہ بھیج دیا گیا۔ قاسم ایک جہازراں

کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ شمشاد قاسم سے کہتا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً آکر صنوبر کی خبر گیری کرتا رہے۔ جو شیلانگ میں تھی۔

جب شمشاد مغربی محاذ سے لوٹ کر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اور اس کے لاڈلے دوست کے درمیان ایک بہت گہرا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

شمشاد بڑا اصول پرست، کم گو اور ٹھوس بلکہ ٹھس قسم کا انسان تھا۔ جب یہ قصہ چھاؤنی میں اسکنڈل بن کر گشت کرنے لگا تو اس نے سروس پستول نکال کر ارادہ کیا کہ پہلے صنوبر کو مار ڈالے اور پھر خود کو ہلاک کر دے۔ صنوبر نے اس سے طلاق مانگی مگر وہ تو مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔

" دونوں کے والدین نے آکر صلح صفائی کرائی اور صنوبر نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اب وہ قاسم سے نہیں ملے گی۔ شمشاد چونکہ ایک اصول پرست اور راست باز انسان تھا اس نے بیوی کی قسم پر اعتبار کیا مگر اب صنوبر اور قاسم دریائی راستوں پر خالی اسٹیمروں اور تنہا ڈاک بنگلوں میں چھپ کر ملنے لگے کہ آسام اور بنگال کے گھنے رومینٹک جنگل اور دریا اس طرح کی ملاقاتوں کے لئے بیحد آئیڈیل ہیں۔

" صنوبر کا بچہ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ شمشاد بچے پر بھی عاشق تھا اور صنوبر کو، اس کی حرکتوں کے باوجود اب بھی بیحد چاہتا تھا۔

" ایک دن اگرتلہ گھاٹ پر اس نے صنوبر اور قاسم کو اکٹھے دیکھ لیا اور جب صنوبر شیلانگ واپس پہنچی تو اس کی بری طرح ٹھکائی کر ڈالی۔ صنوبر نے دوبارہ طلاق کا مطالبہ کیا اور پہلے سے زیادہ مار کھائی۔

" اس مار پیٹ کا سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ آخر ایک رات جب شمشاد باہر گیا ہوا تھا صنوبر نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔

" اس رات چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آسام کی برسات کی رات تم نے دیکھی ہے — ؟ جو محبت کرنے والوں کے لئے قیامت آفریں اور نامرادوں کے لئے پیغامِ ہلاکت بن کر آتی ہے۔

چنانچہ صنوبر نے بچے کو بہت سی ٹافی دے کر اور جی بھر کے رونے اور پیار کرنے کے بعد آیا کے ساتھ شاگرد پیشے میں بھیج دیا اور پھر اس نے ایک پرچہ لکھا: "تم مجھے علیٰحدہ کرنے پر تیار نہیں اور قاسم کے بنا زندہ رہنے کا اب میرے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جانکنی کی تکلیف سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ مجھے سجھائی دیا ہے۔

بھیا کا خیال رکھنا، خدا حافظ" یہ دلدوز خط لکھنے کے بعد اس نے بچے کے کھلونوں، جوتوں اور کپڑوں کو بلک بلک کر پیار کیا۔ پھر آنسو پونچھ کر پرچہ شمشاد کے سرہانے کی میز پر رکھا۔ خواب آور گولیوں کی شیشی الماری سے نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔ عین اسی وقت بیڈ روم کا دروازہ بھڑ سے کھلا ــــ"

"زرینہ تمھارا جواب نہیں" میں نے داد دی۔ "اس قدر جان لیوا کلائمکس کی آپ منظر کشی فرما رہی ہیں اور کیا بھڑ سے دروازہ کھولا ہے سبحان اللہ!"

"سنو تو چپکی بیٹھی ــــ تو جناب دروازہ کھلا بچہ کودتا پھاندتا تیر کی طرح اندر داخل ہوا اور صنوبر دھک سے رہ گئی۔ بچے نے ماں کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہا "ممی، ممی! ذرا یہ فیتہ باندھ دو مجھ سے بندھ نہیں رہا" اور اپنی ننھی سی کلائی پیش کر دی۔ گلابی پلاسٹک کی مصنوعی گھڑی اس کے دوسرے ہاتھ میں تھی جو اسے غالباً آیا نے تحفتاً دی تھی۔

"اس لمحے، اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ موت کو یکسر بھول گئی اور زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ خط پھاڑ کر پھینک دیا اور شمشاد کے لئے کھانے کی دیکھ بھال کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

"لیکن صبح کو اس نے شمشاد کے دفتر جانے کے بعد اسباب باندھا اور بچے کو ساتھ لے کر میکے روانہ ہو گئی وہاں اس نے اپنے والد ڈاکٹر ظفر علی کے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ وہ خلع حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ وہ ایک نہایت وضعدار آدمی ہیں۔ انھوں نے اس سے التجا کی کہ وہ شمشاد کے پاس واپس چلی جائے۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ قصور سراسر صنوبر کا تھا۔ شمشاد اس کے لئے آئیڈیل شوہر ثابت ہوا تھا۔ گر ہے یہ وہ آتش غالب ــــ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ صنوبر کلکتے گئی اور چند

دوستوں کی مدد سے عدالت میں خلع کی درخواست دے دی۔ مقدمے نے نہایت طول کھینچا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کا زمانہ آن پہنچا۔ تقسیم کے چند ماہ بعد صنوبر نے خلع حاصل کر لیا۔ لیکن اسے اپنے بچے سے دست بردار ہونا پڑا۔ بچہ اب اپنی دادی اور پھوپھیوں کے ساتھ ڈھاکے میں تھا۔ جہاں شمشاد کے گھر والے کلکتے سے ترک وطن کر کے آ چکے تھے۔ شمشاد کچھ عرصے بعد فوج سے ریلیز حاصل کر کے کسی قسم کی اعلیٰ ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا۔ کلکتے میں صنوبر اور قاسم کی شادی ہو گئی۔

"بی بی! اب یہ نکتہ یاد رکھو کہ قاسم نے اپنی پہلی بیوی کو جو مستقل پٹنے میں رہتی تھی، طلاق نہیں دی تھی۔ کیوں کہ وہ اس کے سگے چچا کی اکلوتی اور صاحب جائداد لڑکی تھی۔ اب قاسم کی دوسری شادی نے جائداد کے سلسلے میں بھی قانونی پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور اس کے چچا یعنی سسر نے اس پر دعویٰ دائر کر دیا۔ جانے کیا قضیہ تھا۔ اس کی مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ ان سب مصیبتوں سے بچنے کا بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو خیرباد کہے۔ چنانچہ اس نے آسام کی جہاز راں کمپنی سے اپنا تبادلہ مشرقی پاکستان کی ایک جہاز راں کمپنی میں کروا لیا۔

"واجد بھی کلکتے سے اوپٹ آؤٹ کر کے ڈھاکے آ چکا تھا اور فوج چھوڑنے کے بعد ایک سول ملازمت میں شامل ہو گیا تھا۔

"ڈھاکے میں صنوبر نے اپنا نیا گھر بھی اسی خوش سلیقگی اور نفاست سے سجایا جس طرح وہ آسام میں اپنے بنگلے دلہن کی طرح سجائے رکھتی تھی۔ وہ ایک بڑی مرنجاں مرنج اور خاموش طبیعت لڑکی ہے۔ اور اسے دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ اس نے سر پر کفن باندھ کر ایسا طوفانی اور بلاخیز عشق کس طرح کر ڈالا تھا۔ بہرحال اب وہ بیگم شمشاد کے بجائے بیگم قاسم تھی اور بے حد مسرور۔

"واجد ملازمت کے سلسلے میں نارائن گنج میں مقیم تھا مگر ویک اینڈ گزارنے کے لئے صنوبر

اور قاسم کے یہاں آجاتا تھا۔ صنوبر اس کے پیچھے پڑگئی کہ پاکستان بننے کے بعد ڈھاکے میں سارے برصغیر سے آئے ہوئے اچھے اچھے خاندانوں کی ریل پیل ہے اور ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ اب اسے ضرور بیاہ کرلینا چاہئے۔ مگر واجد حسب سابق اس کی بات ہنس کر ٹال جاتا اور قاسم صنوبر کو یاد دلاتا کہ واجد بڑا گھاگ ہے۔ اس کا کلکتہ والا سلسلہ ابھی تک غالباً چل رہا ہے۔ یہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے گا۔

" اس بات پر واجد معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر کہتا۔ ابے چپ ہو جا یار۔ اگر اپنی خیریت چاہتا ہے۔ اس پر دونوں دوست خوب قہقہہ لگاتے اور صنوبر اس پر اسرار مذاق کو نہ سمجھ پاتی مگر خود بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی۔

" اکثر وہ بچے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کار لے جا کر اس کے اسکول کے باہر کھڑی کر دیتی اور بچے باہر نکلتے تو صبر سے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہتی۔ مگر جب وہ قریب سے گزرتا تو جلدی سے اپنا آنچل منہ پر ڈال کر کار اسٹارٹ کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ شمشاد نے بچے سے کہہ رکھا ہے کہ اس کی ممی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسکول سے لوٹ کر وہ پہروں روتی۔ تب قاسم اس پر برس پڑتا۔

" علامہ راشد الخیری کی اس ٹریجک ہیروئن نے خدا کی قسم اب مجھے بور کر دیا ہے" وہ کہتا۔ وہ اور زیادہ بلک بلک کر روتی۔ تب واجد اسے بڑے پیار سے سمجھاتا" تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ وہ مزید روتی اور واجد اسے مزید دلاسے دیتا۔

" صنوبر کے یہاں توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور وہ بیٹے کی مفارقت کا دکھ بھول کر ان بچوں میں محو ہو گئی۔ صنوبر کی والدہ شیلانگ سے آکر ڈھاکے میں بیٹی داماد کے پاس قیام کرتیں اور نواسیوں سے لاڈ پیار میں لگی رہتیں۔ یوں، خاصی مطمئن اور خوش باش زندگی صنوبر اور قاسم کی گزر رہی تھی۔

"پھر ایک بیحد معمولی سا واقعہ ہوا۔ بی بی ! تم وقت کی بات جو کرتی ہو تو میری سنو۔
"ایک چھوٹا سا سفر۔ ایک بظاہر غیر اہم ملاقات، ایک منظر کی سرسری جھلک، ایک مختصر ساخط، ایک تحریر، بے دھیانی میں کہے ہوئے چند الفاظ ــــ زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ ایک لمحہ جہنم کو جنت اور جنت کو جہنم میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔ ایک لمحہ صرف ایک لمحہ۔ بی بی۔
"ایک روز قاسم نے دفتر سے گھر آکر صنوبر سے کہا کہ اسے ایک سرکاری وفد کے ساتھ بمبئی بھیجا جا رہا ہے کسی کانفرنس کے لئے۔ اور اس نے صنوبر کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً تیار ہو جائے۔ صنوبر بمبئی کی سیر اور شاپنگ کے خیال سے کھل اٹھی۔ بچیوں کو اپنی والدہ کے حوالے کیا اور خوش خوش طیارے میں بیٹھ کر قاسم کے ساتھ بمبئی پہنچی۔
"وفد کے اراکین تاج محل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک رکن نے اپنے ایک مقامی دوست سے کہا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا اور نرگس سے ملنا چاہتے ہیں۔ مقامی دوست نے جواب دیا کہ وہ ابھی اپنی دوست مسز سروپ کمار کو فون کئے دیتے ہیں۔ وہ آپ سب کو نگارخانوں کی سیر بھی کرا لائیں گی اور نرگس، راج کپور، دلیپ کمار سب سے ملوا بھی دیں گی۔ اور بیگم قاسم۔ انھوں نے صنوبر کو مخاطب کیا۔ مسز سروپ کمار اور ان کی ہمشیرہ مس کاشانی ساریاں خریدنے کے سلسلے میں آپ کی بہترین گائیڈ ثابت ہوں گی۔
"لہٰذا ان دونوں خواتین کو فون کیا گیا اور صنوبر ان کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"تب ایک عجیب بات ہوئی۔ قاسم نے اچانک اس سے کہا کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کانفرنس سے لوٹ کر شام کو اسے خود باہر گھما لائے گا۔ صنوبر نے اپنے اکسائیٹ منٹ میں اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تو نرگس اور مینا کماری کے فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مری جا رہی تھی۔ چنانچہ قاسم اور دوسرے پاکستانی انجینیر کانفرنس کے لئے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک امریکن کار تاج کے سامنے آن کر رکی اور دو بیحد فیشن ایبل لڑکیاں ہنستی کھکھلاتی

اتریں اور صنوبر سے جو ان کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی سمندر اور جہازوں کو دیکھ رہی تھی، اپنا تعارف کرایا فرحت سروپ کمار اور راحت کاشانی۔

"بی بی۔ اس نکتے پر پہنچ کر یہ خاکسار ایک دوسرا فلیش بیک شروع کرتی ہے۔ یعنی فلیش بیک۔ فلیش بیک۔ صنوبر کی کہانی اس نکتے تک ذہن میں محفوظ رکھو کس نکتے تک؟"

"کہ دو بیحد فیشن پلیٹ لڑکیاں تاج کے سامنے آکر اتریں" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"ہاں" زرینہ نے گلا صاف کیا۔ اور نئی کافی تیار کرنے کے بعد کہانی جاری رکھی۔

"تم کو یاد ہوگا بی بی۔ جب ابا میاں کا تبادلہ لکھنؤ سے کلکتے کا ہوا تھا تو میں انٹر سائنس کے لئے لیڈی برابورن کالج میں داخل ہوگئی تھی۔ یاد ہے نا؟ اچھا۔ تو ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ہم کالج میں ایک ہندوستانی ڈرامہ اسٹیج کرنے والے تھے۔ تو ہماری ایک ہم جماعت انجم آرا نے کہا کہ اس کے ماموں کے ایک دوست ہیں واجد صاحب واجد صاحب کرکے۔ ان واجد صاحب کی ایک بیحد گلیمرس گرل فرینڈ ہے جو بہت اچھی ایکٹریس ہے اور شہر کے تھیٹریکل حلقوں میں اس کی ڈائریکشن کی صلاحیتوں کو بھی بہت سراہا جارہا ہے۔ میں اسے بلواتی ہوں کہ ہماری مدد کرے۔

"اب یہ اتنا لمبا چوڑا تعارف دراصل ایک ایسی حسینہ نازنین کا تھا جو کلکتہ میں تو بےحد مشہور تھی مگر بسم اللہ کے گنبد میں پلی ہم بیوقوف اور نوعمر لڑکیوں کے لئے اس وقت تک اس کا نام اجنبی تھا۔ یہ زہرہ جبین، فخر بستانِ لندن وچین ماہ رو عنبرین مو سرگروہ خوبانِ جہاں جانِ جاں، آرامِ دل، دلِ مشتاقاں کہ نام اس کا راحت کاشانی تھا۔ سال بھر قبل کوئٹے سے آئی تھی اور وار پبلسٹی کے محکمے میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر بقول شخصے لگی ہوئی تھی۔

"اس کے بارے میں طرح طرح کی رومانٹک روایتیں مشہور ہوگئی تھیں جن کی وجہ سے اس نے سارے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔

"مس کاشانی کی دوسری تہلکہ خیزی کی وجہ ایک اور تھی۔"

" مجھ کو خوشی ایک اور ہے لانا تو اور ایک جام سے
ہاں ہاں مسلماں زادیاں ہوتی ہیں عفت والیاں
چشم فلک نے آج تک دیکھی نہ ان کی اک جھلک "

میں نے زرینہ کی بات کاٹ کر آنکھیں بند کر کے پڑھنا شروع کر دیا اور "جھلک" اتنے زور سے ادا کیا کہ زرینہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ پھر اس نے اسی روانی سے کہانی جاری کر دی۔

" وجہ ایک اور تھی۔ اس وقت تک وطن عزیز اس قدر ماڈرن نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حسینہ نازنین کلکتے کے لوئیر سرکلر روڈ کو پیرس کا ایٹن کوار ٹر گردانتی تھی اور واجد صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

" چنانچہ آیندہ اتوار کو ہمارا ڈراما گروپ زولوجیکل گارڈن میں ایک جھیل کے کنارے جمع ہوا اور وقت مقررہ پر مس کاشانی وہاں تشریف لائیں۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کروائی اور بڑے وقار اور متانت سے ہم لونڈیوں سے باتیں کرتی رہیں۔

" دوسرے اتوار کو ہم کالج ہال میں ریہرسل کے لئے اکٹھے ہوئے مگر مس کاشانی نہ آئیں۔ کچھ دیر بعد انجم آرا نے منہ لٹکائے ہوئے آکر خبر دی کہ ایک بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ راحت آپا واجد چچا کے والدین کے گھر گئی تھیں وہاں واجد چچا کی بہنوں نے ان پر چوری کا الزام لگا کر ان کو مکان سے نکال دیا۔

"گڈ گاڈ۔ آل مائٹی جیزس۔ گڈنس گریشس۔ حیرت زدہ آوازوں کا کورس بلند ہوا۔

" حالانکہ تم کو پتہ بھی ہے۔ راحت آپا قلات کے فقیروں کی بیٹی ہیں۔ انجم آرا نے کہا۔

" فقیروں کی یعنی صوفیوں کی ؟ میں نے پوچھا۔

" ارے نہیں بھائی۔ فقیر جو رنگ برنگی مالائیں پہنے درگاہوں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہیں اور چمن، بوستاں اور زاہدان میں راحت آپا کے والد کے ذاتی تاکستان ہیں۔ لیکن راحت آپا کی اتی خانہ بدوش ہیں ــــ انجم آرا نے بڑے ڈراماتی انداز میں دوسری طلاع دی ــــ یعنی جپسی ــــ اور فورٹ سنڈیمن اور لورالائی سے لے کر تربت تک ان کے

قبیلے کے کاروانوں کی گھنٹیاں صحرا کی چاندنی میں گونجتی رہتی ہیں۔ راحت آپا کے نانا بلوچی خانہ بدوشوں کے سب سے بڑے قبیلے کے سب سے بڑے سردار ہیں اور بےحد دولت مند۔ اونٹوں کے گلّے۔ اور جناب ایرانی قالینوں سے سجے خیمے اور تلواریں، بندوقیں۔ مگر واجد چچا کی بہنوں نے یہ سب نظرانداز کر کے طعنہ دیا کہ تم آخر ہو کون ـــ اٹھائی گیری۔ اچکّی۔ ادھر ادھر ڈاکے ڈالتی پھرتی ہو ـــ تباہ و برباد کر ڈالتی ہو لوگوں کو ـــ اب بتاؤ بھلا بے چاری راحت آپا کو لے کے چور ڈاکو بنا دیا۔

"ہم سب راحت کاشانی کے اس الف لیلوی پس منظر سے مسحور ہوئے اور بہ بانگِ دُہل اعلان کیا کہ واجد چچا کی بہنوں کو ایسی غلط اور افسوس ناک بات ہرگز نہ کہنا چاہئے تھی۔

"راحت کاشانی ایکدم غائب ہو گئیں۔ ڈیڑھ دو مہینے بعد ایک صبح انجم آرا نے لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اطلاع دی کہ راحت نے مٹیا برج کے ایک لوفر نواب زادے سے شادی کر لی اور اس کے چار دن بعد ہی اس سے طلاق لے لی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وضاحت انجم آرا نے یوں کی کہ راحت نے واجد چچا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کر لیں۔ مگر واجد چچا نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں مگر اس کی عزّت نہیں کرتے۔

"مجھے بتاؤ زرینہ۔ انجم آرا نے مجھ سے پوچھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ محبت کرتے ہیں عزت نہیں کرتے ـــ؟

"بھئی اس کا یہی مطلب ہوا کہ آدمی اس لڑکی سے شادی کرتا ہے جس کے لئے اس کے دل میں عزّت ہو۔

"مگر پھر محبت کیوں کرتے ہیں؟

"یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ ہم لوگ اس وقت کتنے بھولے اور احمق تھے۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو۔ گھاگ ایک سے ایک۔"

"اچھا زرینہ بی بی تم اپنے فٹ نوٹ نہ دو۔ قصّہ سناؤ۔" میں نے گھڑی دیکھی۔" مجھے

صبح سویرے لوکیشن ڈھونڈنے جانا ہے"۔

"میں کیا بتا رہی تھی ؟"

"لوفر نواب زادے سے طلاق لے لی"۔

"ہاں ۔ اور ٹالی گنج میں فلیٹ لیا کیوں کہ اب اس کی چھوٹی بہن فرحت بھی کالج کی تعلیم ختم کر کے کونٹے سے کلکتے آگئی تھی ۔ دونوں بہنوں نے مل کر شہر کو سرخ رنگ دیا۔

" انہی دنوں قاسم جو دریائی ملازمت کے سلسلے میں آسام میں تھا کلکتے آیا ۔ اس وقت صنوبر سے اس کا عشق شروع نہیں ہوا تھا ۔ کسی محفل میں فرحت کاشانی سے اس کی ملاقات ہوئی اور فرحت اس کی محبوبۂ دل نواز بن گئی ۔ پھر وہ شیلانگ گیا اور شمشاد کی غیر حاضری میں صنوبر سے عشق کرنے لگا ۔ مگر ہر مرتبہ جب وہ کلکتے آتا تو فرحت بھی اس کی رفاقت کرتی ۔ جب تک صنوبر سے شادی کر کے وہ ڈھاکے نہیں گیا اس وقت تک فرحت کلکتے ہی میں رہی ۔ لیکن صنوبر کو اس کے وجود کا مطلق علم نہ تھا ۔ (حوالے کے لئے پچھلا فلیش بیک یاد کرو)

" پھر بی بی میں انٹر سائنس کر کے لکھنؤ میڈیکل کالج چلی گئی ۔

" ایک روز ریڈنگ روم میں ایک فلمی رسالے پر نظر پڑی تو اس میں راحت کاشانی کی متبسم تصویر موجود تھی ۔

" تقسیم ہند کے فوراً بعد انجم آرا شادی کر کے لکھنؤ آگئی اور اس نے بتایا کہ واجد چچا ڈھاکے چلے گئے ہیں اور راحت اور فرحت نے بمبئی جا کر فری لانسنگ شروع کر دی ہے ۔

" کا ہے کی فری لانسنگ ؟ میں نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا ۔

" اداکاری اور دیگر فنون لطیفہ ۔ انجم آرا نے جواب دیا ۔ وہ دونوں فلمی دنیا میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں جس طرح بطخ پانی میں تیرنے لگتی ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی شکلیں کیمرے کے لئے موزوں نہیں ہیں اس لئے بڑی فلم اسٹار کبھی نہ بن سکیں گی ۔

" آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولت مند طبقہ ابھرا ۔ حصولِ زر جس کا واحد

آدرش تھا جو ہر قسم کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے تعلق تھا۔ اب راحت اور فرحت کا ٹائیپ انوکھا نہیں رہا تھا۔

"اسی زمانہ میں سروپ کمار جو بمبئی میں بڑا سخت فلمی ہیرو لگا ہوا تھا، فرحت کے عشق میں گرفتار ہوا اور اس سے سول میرج کر لی۔ راحت نے ایک غیر فلمی ہیرو سے گویا گندھرو واہ کر لیا اور مسز غیاث الدین کہلانے لگیں۔ پھر یکایک مسٹر غیاث الدین انگلستان چلے گئے۔ راحت بمبئی کے ترقی پسند حلقے سے بھی ربط رکھتی تھی۔ اور جب غیر ملکی فلمی یا تہذیبی وفد شہر میں وارد ہوتے تو راحت ہی ان کے استقبال میں پیش پیش رہتی۔ مگر فلم انڈسٹری کے اندر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے بہت بڑا المیہ تھا۔ احمق الذین، خالی الذہن لڑکیاں چوٹی کی فلم اسٹار بن کر لاکھوں کما رہی تھیں اور ایک عالم میں مشہور ہو گئی تھیں۔ مگر راحت اپنے غیر معمولی حسن، ذہانت، فنی صلاحیت اور اخلاقی آزادروی کے باوجود کچھ نہ بن سکی۔ اس احساس محرومی اور ناکامی کی تلافی کے لئے وہ تلوار کی دھار پر سے گزر گئی۔

"سروپ کمار ایک فلمی ڈیلی گیشن کے ساتھ جاپان چلا گیا اور اپنی بہن کی دوسرا تھ کے لئے راحت سروپ کمار کے نیپین سی روڈ کے عالی شان فلیٹ میں آن کر رہنے لگی۔ (سروپ کمار نے متعدد ریس کے گھوڑے اور دو لاکھ روپیہ بھی فرحت کے نام منتقل کر دیا تھا۔ اس میں بیوی کی چاہت اور انکم ٹیکس سے بچنے کی ترکیب دونوں مضمر تھے۔)

ایک روز فرحت صوفے پر لیٹی آیا سے پاؤں دبوا رہی تھی اور راحت نیچے قالین پر اوندھی لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ سفید رنگ کے فون کی گھنٹی بجی اور تاج محل ہوٹل سے ایک دوست نے کہا کہ ڈھاکے سے کچھ مہمان آئے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ فوراً آؤ۔ چنانچہ دونوں بہنیں پریوں کی طرح سج کے تاج روانہ ہو گئیں اور وہاں پہنچ کر صنوبر قاسم کو اپنا منتظر پایا۔

"آٹھ دن تک بڑے جشن رہے۔ صنوبر اور فرحت میں بے حد دوستی ہو گئی۔ فرحت

نے ڈھیروں ساریاں اسے تحفے میں دیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ روپیہ اس کے لئے اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ دن رات اس کی موٹریں صنوبر اور اس کی خدمت میں حاضر رہتیں۔

" ڈھاکہ لوٹنے سے ایک دن قبل صنوبر چند دوستوں کے ساتھ ایلفنٹا کی سیر کے لئے گئی۔ قاسم سرکاری کام کی وجہ سے نہ جاسکا۔ جزیرے پر پہنچتے ہی گروہ کی ایک خاتون کی طبیعت خراب ہوگئی اور دن بھر وہاں رہنے کے بجائے وہ سب دوسری لانچ سے واپس آگئے۔ صنوبر ایک ٹیکسی لے کر اپالو بندر سے سیدھی فرحت کے یہاں روانہ ہوگئی تاکہ بقیہ وقت وہاں گزارے۔
جب وہ فلیٹ کے اندر پہنچی تو سارے میں دوپہر کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راحت کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے جاچکی تھی۔ حسب معمول صنوبر سیدھی فرحت کی شاندار خواب گاہ کی طرف چلی گئی اور ...."

" پھر سے دروازہ کھولا " میں نے بات کاٹی۔

" ہاں۔ اور فوراً الٹے پاؤں لوٹی۔ اور لفٹ تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا کر گرنے لگی تو ایک گھاٹن نے اسے سنبھالا۔ صنوبر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا کہ جو صاحب اندر ہے وہ پہلے بھی آچکا ہے؟

" گھاٹن نے ہونٹ پچکائے۔ مگر چونکہ فرحت نے کسی قصور پر اس کی دو ماہ کی پگار ضبط کر کے اسے صبح ہی نوکری سے برطرف کیا تھا لہذا اس نے جواب دینے میں نمک حرامی نہ سمجھی اس نے کہا 'ہاں بائی۔ صاحب تو ایک چھ سات دن سے روز آتا ہے۔ کبھی دن میں کبھی رات کو۔ آنے کا ٹائم کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ باہر گاؤں سے آیا ہے۔ کل چلا جائے گا'۔

" صنوبر واپس تاج پہنچی اور جب شام کو قاسم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا کہ وہ دن بھر کانفرنس میں مغز کھپاتے کھپاتے چور ہوگیا ہے تو صنوبر نے بڑے سکون کے ساتھ اس کے لئے کافی منگوائی اور اسے سیریڈون کھانے کو دی۔

"کیوں کہ اسے واجد کی بات یاد آگئی تھی کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی ہے۔
"ڈھاکہ واپس پہنچ کر کبھی اس نے قاسم پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کیا جانتی ہے اور پرانے معمول کے مطابق زندگی گزارنے لگی۔

"اب بی بی اس داستان کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے۔"

زرینہ نے شال کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر صوفے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔" میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔بی۔ایس۔ کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں گائناکولوجی میں ایم۔ڈی۔ کرنے ایڈنبرا چلی گئی۔ وہاں سے واپس آکر بلرام پور ہسپتال میں کام کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے میڈیکل کالج میں لکچررشپ ملنے والی تھی کہ اسی زمانے میں ڈھاکے سے بڑی آپا کے بڑے پراسرار سے خط اماں کے پاس آنے شروع ہوئے۔ تمھیں معلوم ہے بھائی جان ۱۹۴۷ء سے ڈھاکے میں ہیں۔ وہاں ان دونوں کی ملاقات ارسلان احمد اور ان کے گھر والوں سے ہوئی اور بڑی آپا نے ترنت میرے رشتے کی بات چیت شروع کر دی۔ ادھر میں اپنے آئیڈیلز لئے بیٹھی تھی کہ جنتا کی خدمت کروں گی۔ گاؤں میں جا کر کسانوں کا علاج معالجہ کروں گی۔ کچھ عرصہ تک میں نے کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروجیکٹ کے ساتھ بھی کام کیا اور اب میڈیکل کالج میں گائناکولوجی پڑھانے کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ مگر بڑی آپا کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔ چنانچہ ابا میاں اور اماں نے مجھے زبردستی ڈھاکے چلتا کیا۔ ۱۹۵۵ء میں ڈھاکے آئی۔ ارسلان مجھے بے حد پسند آئے مگر شادی کا فیصلہ فوراً نہ کر سکی۔ تم جانو وہی ٹو بی اور نوٹ ٹو بی (TO BE OR NOT TO BE) کا جان لیوا مسئلہ۔ بھائی جان میرے ویزا کی میعاد بڑھواتے رہے تاکہ میں اطمینان سے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

ان ہی دنوں ایک شام بھائی جان اور بڑی آپا کے ساتھ ان کے دوستوں مسٹر اور مسز سیڈرک وارنگٹن کے یہاں "کال" کرنے کے لئے گئی۔ یہ ایک معمر انگریز جوڑا تھا۔ مسٹر وارنگٹن مشرقی پاکستان کی ایک برطانوی جہاز راں کمپنی کے افسر اعلیٰ تھے اور بہت جغادری قسم

کے انگریز تھے۔ ہم لوگ لان پر جا کر بیٹھے اور ملازم ہماری اطلاع کے لئے اندر گیا۔ اور چند منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں۔ ایک پری جمال لڑکی پتلون میں ملبوس برآمدے سے اتر کر گھاس پر خراماں خراماں چلتی، مسکراتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے۔

" جب وہ قریب پہنچی تو مجھے اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ راحت کاشانی تھی جسے میں نے دس سال قبل کلکتے کے زولوجیکل گارڈن میں دیکھا تھا۔ اب وہ کوئی بتیس تینتیس برس کی رہی ہوگی مگر پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور اسمارٹ نظر آرہی تھی۔

" اس نے خالص برطانوی انداز میں بڑے اسٹائل سے بات شروع کی اور کہا کہ سیڈرک اور ہلڈا ابھی ابھی باہر گئے ہیں اور وہ ان کی دوست اور ہاؤس گیسٹ ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور یہ کہ آپ لوگ کیا پئیں گے۔

" میں نے اسے کلکتے کی ملاقات یاد دلائی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی اور بے حد تپاک اور خلوص سے باتیں کرنے لگی اور کہا کہ وہ کل ہمارے یہاں آئے گی۔ میں نے اس سے بمبئی کے پروگریسیو گروپ میں شامل دوستوں کی خیر خبر دریافت کی اور راحت کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ بڑے واضح سیاسی شعور کی مالک ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بین الاقوامی سیاست اور ادب وغیرہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔

" پھر کچھ دیر تک دونوں ملکوں کے درمیان زرِ مبادلہ کی پابندیوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان سے صرف پچاس روپے لے کر پاکستان آنے کی اجازت ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ میں صرف پچاس روپے لے کر یہاں پہنچی ہوں، کس قدر کوفت کی بات ہے۔ تھوڑی دیر میں میزبان بھی آگئے اور راحت جس طرح گھل مل کر ان کے ساتھ باتیں کرتی رہی اس سے ظاہر ہوا کہ گویا وہ ان کے گھر کی ایک فرد ہے۔

" دوسرے دن وہ ہمارے یہاں آئی اور بے حد دلچسپ گفتگو کرتی رہی۔ یہ لڑکی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہے۔ بڑی آپا نے اظہارِ خیال کیا۔

"کوئی پندرہ بیس دن بعد ایک روز مس فلیمنگ بڑی آپا سے ملنے آئیں۔ مس کلارا فلیمنگ، ہلڈا وارنگٹن کی بوڑھی کنواری بہن تھیں اور انگلستان سے چند ماہ کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

"جیسا میں نے تم کو ابھی بتایا وارنگٹنز بڑے جغادری قسم کے انگریز تھے۔ اور انگریز اپنے ماں باپ، بھائی بہن کو بھی اپنے گھر پر رکھنے کا قائل نہیں۔
"دوسری چیز یہ کہ انگریز ہمیشہ انڈر اسٹیٹمنٹ میں بات کرتا ہے۔ چنانچہ کلارا فلیمنگ نے بر سبیل تذکرہ کہا کہ ڈیر راحت ہمارے یہاں بہت ویلکم ہے اور وہ ایک نہایت ہردلعزیز لڑکی ہے اسی وجہ سے اس نے یہاں آتے ہی آتے ان گنت دوست بنا لئے ہیں۔ مگر ذرا دقت یہ ہے کہ ان دوستوں کے وقت بے وقت ٹیلی فون آتے رہتے ہیں۔ اور ہلڈا اعصاب کی مریض ہے۔

"آپ لوگوں کی راحت سے بہت پرانی اور بے تکلف دوستی ہے۔ اسے سمجھا دیجئے کہ دوستوں کو منع کر دے، بڑی آپا نے کہا۔
"ہاں، میرا یقیناً یہ خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ سیڈرک اور ہلڈا دو مہینے قبل دہلی گئے تھے۔ وہیں پہلی بار ان کی ملاقات راحت سے ہوئی تھی اور اس پیاری بچی نے ان دونوں کی بہت خاطر مدارات کی۔ سیڈرک نے اس سے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ ڈھاکہ آئے تو آ کر ان کے یہاں ہی ٹھہرے تو وہ سچ مچ آ گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مہربان آمد ہم لوگوں کے لئے باعث مسرت ہے۔ میری بہن ہلڈا کے اعصاب اس مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے ہیں" کلارا فلیمنگ نے آنکھیں چندھیا کر اپنی خلیق مسکراہٹ کا رخ میری طرف کیا۔ "کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے ہائی ڈیر کہ بنگال اس موسم میں بہت صبر آزما ہو جاتا ہے ؟"
"اس بات کو ایک ہفتہ گذرا ہوگا کہ ایک صبح ہمارے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا۔ راحت بول رہی تھی ــــ میں شاہ باغ میں شفٹ ہو گئی ہوں۔ کسی وقت ادھر آؤ۔ میں

شام تک اپنے کمرے ہی پہ رہوں گی، اور کمرے کا نمبر بتایا۔

"مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ یہ لڑکی پچاس روپے لے کر ہندوستان سے آئی تھی، شاہ باغ میں کیسے منتقل ہو گئی۔

"شام کو میں ریس کورس روڈ پر سے گزر رہی تھی تو راحت کے فون کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اس کے پاس ہوتی چلوں۔ شاہ باغ ہوٹل کی دوسری منزل پر راحت کا شانی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا لہٰذا میں دستک دینے کے بعد اندر داخل ہو گئی۔ غسل خانے میں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھل جھل کرتا لباس پلنگ پر رکھا تھا۔ کونے میں میز پر راحت کے سابق شوہر غیاث الدین کی تصویر اور ماڈرن آرٹ کے متعلق مغربی نقادوں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ سنگھار میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ ابھی گلدستے کا سرخ ریشمی فیتہ بھی اس میں موجود تھا۔

"' ارے بھئی راحت '۔ میں نے آواز دی۔

"غسل خانے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر سے جواب دیا۔' ہاں ہاں آجاؤ، یہیں آجاؤ '۔

"میں یہ سمجھ کر کہ شاید وہ منہ ہاتھ دھو رہی ہے اطمینان سے اندر چلی گئی اور ہکا بکا اور بیحد نادم ہوئی۔

"راحت کسی ہالی ووڈ ایکٹریس کی طرح ٹب میں نیم دراز تھی۔ ٹیلی فون پاس اسٹول پر رکھا تھا جس کا ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں فوراً الٹے پاؤں واپس جانے کے لئے پلٹی تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا آؤ۔ آؤ بیٹھو۔ دوسرے اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور ٹیلی فون پر بات کرنے لگی۔

"اب دیکھو بی بی"۔ میری کزن زرینہ نے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر کہا۔" میں ڈاکٹر ہوں۔ برسہا برس میں نے سینکڑوں ڈلیوری کیس کئے ہیں۔ طرح طرح کے آپریشن کرنے کی عادی ہوں۔

انسانی اناٹومی میرے لئے کسی نفسیاتی کمپلکس (COMPLEX) کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم خود غیر ملکی آرٹ اسکولوں کی لائف کلاس میں کام کر چکی ہو اور جانتی ہو کہ انسانی جسم کے متعلق سارا مسئلہ رویئے کا ہے۔ ڈاکٹروں کا CLINICAL رویہ، شاعروں، سنگتراشوں اور مصوروں کا جمالیاتی رویہ اور سیدھی سیدھی جنسی اپروچ جس میں صحت منداور مریضانہ دونوں رویئے شامل ہیں۔ یہ واقعہ کہ راحت نے مجھے غسل خانے میں بلایا۔ اس کی جسمانی نمائش پسندی یعنی EXIBITIONISM کا غماز تھا۔ راحت کو اپنے خوبصورت جسم کا شدید احساس تھا۔

"میرے اسٹول پر بیٹھ کر راحت [illegible] باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بڑی ادا سے پھر ریسیور اٹھایا۔

"تب مجھ پر اچانک ایک اور انکشاف ہوا۔ یہ مستقل دن کے خواب دیکھنے والی لڑکی شاید اس وقت یہ تصور کر رہی ہے کہ وہ میری لین منرو ہے اور ہالیووڈ میں اپنے سونے کے ٹب میں (وہاں شاید سونے چاندی ہی کے ٹب ہوتے ہیں نا) لیٹی اپنے عالمگیر شہرت رکھنے والے عشاق یا اپنے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر سے گفتگو کر رہی ہے۔ مجھے بے حد رنج ہوا، بڑی خجالت محسوس ہوئی۔

"فون ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

" 'تم کپڑے پہنو، میں باہر بیٹھتی ہوں' میں نے کہا۔ اور باہر آگئی۔ راحت ایک بڑی سی تولیہ لپیٹ کر کمرے میں آئی۔ کپڑے پہنے اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔

" 'جب میں اور غیاث ہنی مون کے لئے ساؤتھ آف فرانس گئے تھے وہاں ایک اسپینش فوٹوگرافر نے یہ تصویر کھینچی تھی۔ اس نے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

" ساؤتھ آف فرانس' — عطر کی پھوار اپنی گردن پر ڈالتے ہوئے اس نے آہ بھری۔ 'کس قدر حسین جگہ ہے'!

" حالانکہ اس وقت میں راحت کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے

یہ احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ طرح طرح کے دل خوش کن جھوٹ بولنے کی بیحد شوقین اور عادی ہے۔ آخر کیوں؟ ذرا کمینے پن سے میں نے دریافت کیا "یورپ میں کہاں کہاں گئیں؟"

"سارے میں گھومے" اس نے مبہم، محتاط اور محفوظ جواب دیا "اُفوہ، میڈی ٹیرین کی لہریں کس قدر نیلی ہیں۔ میں تو ریویرا کے ساحل پر سنہری دھوپ میں لیٹی بس سمندر کا نظارہ کیا کرتی تھی!"

"اتنے میں ایک موٹا سا غیر ملکی بغیر دستک دیئے کمرے میں آ گیا۔ ہر سگفرڈ فان باخ۔ راحت نے ملوایا جرمن صوفے پر بیٹھ گیا اور پسینہ خشک کرنے کے بعد راحت سے پوچھنے لگا کہ اسے یہ کمرہ پسند آیا؟ اور روم سروس کیسی ہے؟ اب وہ تیار ہو کر جرمن کے ساتھ نیچے بال روم میں جانے والی تھی۔ میں دونوں کو خدا حافظ کر کے باہر آ گئی۔

سالِ نو کی شام وہ اسی جرمن کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں نظر آئی اور لپک کر میرے پاس پہنچی۔ بڑی آپا نے ذرا سرد مہری کا اظہار کیا۔ آپا کے اس رویّے کو اس نے بڑی خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا اور ان سے مزید خلوص کے ساتھ ملی۔

"ڈھاکہ میں اس نے سب ملنے والوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میری بہت پرانی اور گہری دوست ہے۔ بڑی آپا اس بات سے بہت سٹ پٹا گئی تھیں۔ راحت نے لوگوں سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بڑی آپا اور بھائی جان سے اس کے خاندانی مراسم ہیں۔

"یہ کیا واہیات بات ہے" آپا نے کہا "ارسلان احمد صاحب کے گھر والے قدامت پسند لوگ ہیں۔ وہ تمہارے متعلق کیا سوچیں گے کہ تم راحت کاشانی کی دوست ہو۔"

"مگر آپا۔ ذرا سوچئے تو۔ اس غریب نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اچھی خاصی معقول لڑکی ہے۔"

"معقول لڑکی ہے — معقول —" آپا نے بڑے الم سے کہا۔

"لیکن میں جانتی تھی کہ راحت اپنے آپ کو بیحد غیر محفوظ محسوس کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود کو ایسے لوگوں سے مماثل کرے جن کے قدم زندگی میں مضبوطی سے جمے ہیں۔

"صنوبر ہماری پڑوسی تھی مگر راحت اس سے کبھی نہیں ملی۔ ابھی راحت شاہ باغ ہوٹل ہی میں قیام پذیر تھی کہ ایک شام صنوبر گھبرائی ہوئی آپا کے پاس آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اے ہے۔ خیر تو ہے۔ کچھ منہ سے تو بول بچی،" آپا نے گھبرا کر کہا۔

"تم جانتی ہو آپا ان پتی ورتا عورتوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر شوہر شرابی بدمعاش یا جرائم پیشہ بھی ہو تب بھی بیوی کو مرتے دم تک اس کے ساتھ نباہ کرنا چاہئے۔ آپا، ڈولا آئے اور جنازہ نکلے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں (اور صد افسوس کہ یہ مدرسہ فکر اب تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے) چنانچہ وہ اصولی طور پر صنوبر کی اس حرکت کو ناپسند کرتی تھیں کہ وہ اپنا شوہر اور بچہ چھوڑ کر دوسرے آدمی کے گھر آ گئی۔ مگر بہرحال، صنوبر ایک بڑی خاموش، شریف طبیعت گھریلو سی لڑکی تھی اس لئے آپا کو اس سے انس بھی بہت تھا۔

"صنوبر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا 'وہ چڑیل —— وہ —— وہ ڈائن —— وہ بلطخ بھی آن پہنچی ہے'۔

"کون بھئی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"فرحت —— اور کون —— قاسم ایک ہفتے سے گھر سے غائب ہے۔ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ دورے پر شمالی بنگال جا رہا ہے اور ابھی ابھی واجد نے آکر بتایا کہ جے دیب پور کے راستے میں لانچ پر جشن ہو رہے ہیں'۔

"مجھے دفعتاً یاد آیا۔ ان ہی آبی راستوں اور ان ہی جہازوں پر صنوبر قاسم سے چوری

چھپے ملا کرتی تھی اور شمشاد غم و غصے اور بے بسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔

"آپا نے آہستہ سے کہا 'بٹیا جس مرد کے ہاتھ میں تمھارے باپ نے تمھارا ہاتھ دیا اسے تو تم بلا قصور ٹھکرا کر چلی آئیں۔ کیا قاسم سے بیاہ کرتے وقت تم کو اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ یہ دراصل کس قسم کا انسان ہے؟ خود کردہ را علاج نیست بی بی۔ اب صبر کرو۔'

"صنوبر اور زیادہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"مجھے تو تمھاری یہ صنوبر کچھ بیوقوف سی دکھتی ہے، آپا نے رنجیدہ آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

"اسی وقت برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا کہ واجد سامنے کھڑا ہے۔

"'یہ کیا باؤلا پن ہے۔ چلو گھر چل کر منھ ہاتھ دھوؤ۔ بچیاں تم کو یاد کر رہی ہیں'، اس نے کہا۔

"صنوبر نے ذبح ہوتی ہوئی بھیڑ کی طرح نظریں اٹھا کر واجد کو دیکھا۔ واجد نے بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ سہارا دے کر اسے کرسی سے اٹھایا اور بچوں کی طرح سنبھالتا اور دلاسے دیتا اسے ہمارے احاطے سے باہر لے گیا۔

"آپا نے مغرب کی نماز کے لئے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے گہرا سانس بھر کر کہا 'اللہ تیری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔'

"ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک شام میں باہر گھاس پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ صنوبر نے مہندی کی باڑ پر سے اچک کر مجھے دیکھا اور پھر چاروں طرف نظر ڈال کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قریب کی کرسی پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے بہت بوڑھے، خستہ جان، تھکے ہارے لوگ بیٹھتے ہیں۔

"'زرینہ ــــ اس نے آہستہ سے کہا: 'بتاؤ میں اب کیا کروں؟'

"'قاسم صاحب واپس آگئے؟'

"ہاں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ محبت ـــــ مر چکی ہے۔ محبت مر چکی ہے۔ سنا تم نے زرینہ؟"
اس نے جھک کر چند پتیاں اکھیڑیں پھر انھیں بکھیر دیا۔ "محبت جسے ابدی اور زندہ جاوید کہا جاتا ہے۔ شیلانگ میں ـــــ" اس نے مشرق کے گلرنگ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے کیا کیا کچھ مجھ سے کہا تھا۔ کیسے کیسے وعدے کئے تھے۔ اور اب ـــــ ان سارے لطیف احساسات کا، سارے خوابوں کا، اس ازلی اور ابدی محبت کا جنازہ نکل گیا ـــــ زرینہ ـــــ"

"میں خاموش رہی۔ میں اس سے کیا کہہ سکتی تھی۔ درختوں میں ایک پپیہا زور زور سے بول رہا تھا۔ آم کے جھنڈ میں کوئل کوک رہی تھی۔ ارے پپیہا بادرے آدھی رات جن کوک ـــــ دھیرے دھیرے سلگتی سوہ تو نے دینی پھونک ـــــ مجھے جھرجھری سی آئی اور میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"دفعتاً، سفید غرارے قمیص میں ملبوس، سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے آپا کی جھلک نیم تاریک برآمدے میں نظر آئی۔ انھوں نے آواز دی۔ صنوبر! دونوں وقت مل رہے ہیں سر ڈھکو اور اللہ سے دعا مانگو۔ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ گھمن گھیری شام کا سناٹا ڈراؤنا ہو گیا۔

"زرینہ ـــــ" صنوبر مدھم لیکن مضبوط آواز میں کہہ رہی تھی۔ "تمھارا خیال ہے مجھے مرجانا چاہئے۔ کیوں کہ میں محبت تھی۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے غیر یقینی لہجے میں جواب دیا۔

"زرینہ۔ وہ کہتا ہے کہ فرحت اس کے لئے مکمل عورت ہے۔ برسوں پہلے کلکتے میں وہ مکمل عورت کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اور اب جب وہ اسے دوبارہ مل گئی ہے تو وہ اسے پہلے کی مانند ترک نہیں کرسکتا۔

"پھر اس نے تمھارا گھر برباد کر کے تم سے شادی کیوں کی تھی؟ تم نے یہ نہیں پوچھا۔"
"وہ کہتا ہے کہ وہ وقت کی بات تھی۔" وہ تلخی سے ہنسی۔
"وقت کی بات! زرینہ اس وقت میں دوسرے کے کھیت کی گائے ـــــ نہیں ـــــ

گھاس ـــ تھی ـ جو ہمیشہ دور سے زیادہ ہری نظر آتی ہے" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔
"مگر فرحت یہاں آئی کس طرح ؟"
"اس کا میاں سروپ کمار اپنی نئی لیڈنگ لیڈی سے عشق کرنے میں مصروف ہے اور دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کی زیادہ پرواہ نہیں رہی۔ مگر یہ عورت بیحد سمجھ دار ہے۔ اس نے وہ سارا روپیہ جو اسے سروپ کمار نے دیا تھا بیک ڈور سے یہاں منتقل کروا لیا ہے۔ اللہ۔ دنیا اتنی گھٹیا کیوں ہے زرینہ ؟"
"اس سوال کا جواب تو بڑے بڑے فلسفی اور پیغمبر بھی نہیں دے سکے۔ میں نے ذرا اکتا کر جواب دیا۔" قاسم کو رتی بھر احساس نہیں کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ زرینہ۔ انسانی جسم کی موت ایک کیمیکل ایکشن ہے ؟"
"ہاں۔ انسان میں کیمیکل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جذبات بھی بدل جاتے ہیں۔"
"اب فرحت اور قاسم بالکل ایک جان اور دو قالب ہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں ؟"
"اگر واقعی ایسا ہے تو تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ صنوبر تم ایک مرد اور ایک عورت کے مابین ان کے خالص ذاتی، جذباتی معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتیں۔"
"ایک مرد ـــ ایک مرد ـــ ؟" اس نے انتہائی کرب سے دہرایا۔" وہ میرا شوہر ہے زرینہ۔"
"آسمان پر بادل امنڈ کر گھر آئے۔" بارش آنے والی ہے۔ صنوبر اب گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔
"میرا گھر ـــ کہاں ہے ؟"
"آخر قاسم صاحب تم سے کہتے کیا ہیں ؟"
"کچھ نہیں۔ وہ بات ہی نہیں کرتے۔ آج انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اب ہم دونوں

کا اکٹھا رہنا ہم دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ میں ــــ میں کل ارمنی ٹولہ میں ایک بزرگ کے یہاں بھی گئی تھی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔" انھوں نے ایک نقش دیا ہے۔"
" میں آنکھیں پھاڑ کر صنوبر کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے براؤن بال جھٹک کر اور نیلی آنکھیں جھپکا کر مجھے ملتجیانہ، پر امید نظروں سے دیکھا۔" بتاؤ ــــ اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟ مگر آج دوپہر وہ پُڑیا واجد کے ہاتھ لگ گئی۔ انھوں نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور مجھے خوب ڈانٹا مگر میں شاہ صاحب سے دوسرا نقش لا سکتی ہوں۔"
" بادل گرجنے لگے۔ پپیہے کی پی کہاں، تیز ہوگئی۔ صنوبر، میں نے مضبوطی سے کہا۔" گھر جاؤ۔"
"" یہ عورت ــــ یہ عورت۔ کیا اسے بمبئی میں عشاق کی کمی تھی۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کیوں آگئی؟ اللہ کے یہاں کوئی انصاف نہیں۔ انصاف کے کیا معنی جب کوئی وجود ہی نہیں ہے تمھارے ان خداوند تعالیٰ کا ــــ" وہ بلک بلک کر رونے لگی اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنی کوٹھی کی طرف چلی گئی۔
"صبح کو آپا کی ملازمہ نے بتایا کہ برابر والی بیگم صاحب کہیں باہر جا رہی ہیں۔ واجد صاحب کی کار پر سامان لد رہا ہے۔
"کوئی گیارہ بجے کے قریب واجد نے مجھے فون کیا۔ وہ ایرپورٹ سے بول رہا تھا۔ اس نے کہا صنوبر کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے۔ میں اسے تبدیل آب و ہوا کے لئے اپنے ساتھ کاکس بازار لے جا رہا ہوں۔ قاسم کل رات ایک ماہ کے لئے پھر دورے پر چلا گیا ہے۔ اگر وہ واپس آکر تم سے صنوبر کے متعلق دریافت کرے تو اسے بتا دینا کہ صنوبر اب میری ذمہ داری ہے۔ خدا حافظ!
" لیکن قاسم سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ اسی رات لکھنؤ سے تار آیا کہ ابا میاں سخت بیمار ہیں۔ میں اور آپا بدحواس ہو کر تیسرے دن لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں ابا

میاں اچھے ہوئے تو ڈھاکے سے ارسلان کی والدہ نے تقریباً روزانہ ٹرنک کال شروع کردیئے کہ کم از کم منگنی کی رسم باقاعدہ ادا ہو جانی اشد ضروری ہے۔ ان کو ڈر تھا کہ میں شاید رسی تڑا کر بھاگ نکلی ہوں اور اب لکھنؤ سے ڈھاکے واپس جانے پر تیار نہ ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ابا میاں کی بیماری اور صنوبر وغیرہ کی انتہائی کنفیوزڈ اور بے تکی زندگیوں کا مرقع دیکھنے کے بعد بھیا میں نے ہڑبڑا کر ہاں کر دی۔

"چنانچہ میں آپا کے ساتھ ڈھاکے لوٹ آئی۔

" ارسلان احمد کی سب سے بڑی بہن جہاں آرا آپا کے میاں بھی اسٹیمر کمپنی میں ملازم ہیں۔ انھوں نے مجھے، آپا اور بھائی جان کو اپنے یہاں فینچوگنج مدعو کیا۔ میرے سسرال والے بڑے سیدھے سادے اور نیک طینت لوگ ہیں اور بیحد خوش باش۔ پروگرام یہ تھا کہ جہاں آرا آپا کے یہاں تین چار روز تک ہاؤس پارٹی منائی جائے گی۔ وہاں ارسلان کی ساری بہنیں، بہنوئی بھائی اور بھاوجیں جمع ہونے والے تھے اور بھیا میرا تو نروس نس کے مارے برا حال۔ مگر خیر۔

" تو ہم سب تمھاری پسندیدہ جگہ فینچوگنج پہنچے۔ واقعی بڑا افسانوی ماحول تھا۔ دور دور تک بکھرے ہوئے لکڑی کے بنگلے۔ دریا کے کنارے کنارے بنے ہوئے پگوڈا ایسے مکان اور بقول تمھارے سخت چینی اور برمی قسم کی فضائیں۔

" صبح کو سارا قبیلہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا اور بڑا غل مچ رہا تھا کہ جہاں آرا آپا کی لاڈلی ٹین ایج لڑکی شمس آرا بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بولی۔ ' امی پندرہ نمبر میں انڈیا سے "مرزا غالب" کے ریکارڈ آئے ہیں۔ چلیے جلدی سے چل کر ان کو ٹیپ کر لیں۔ اٹھیے۔

" میں نے دولھا بھائی یعنی جہاں آرا آپا کے شوہر سے دریافت کیا، پندرہ نمبر میں کون رہتا ہے؟

"' قاسم علوی'۔ انھوں نے مختصر جواب دیا اور قاسم کو ٹیلی فون کیا کہ رات کے کھانے کے بعد ہم سب ان کے یہاں دھاوا بولیں گے۔

"بی بی۔ وہ رات بڑی عجیب سی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں صنوبر کے ساتھ غداری کر رہی ہوں۔ ارسلان مجھ سے بار بار پوچھتے کہ تم خاموش کیوں ہو۔ مگر میں کوئی جواب نہ دیتی۔ کھانے کے بعد جیپ اور اسٹیشن ویگن میں لدکر "پندرہ نمبر" پہنچے۔

"طویل وعریض جگمگاتے لکڑی کے بنگلے پر خاموشی طاری تھی۔ ہم لوگ برآمدے اور گیلری عبور کر کے اندر گئے جہاں ایک وسیع ڈرائنگ روم کے آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔

"چند منٹ بعد قاسم اور فرحت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ میں چونک اٹھی۔ بالکل اسی انداز سے قاسم صنوبر کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ فرحت مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے میرے پاس آئی۔ میں ڈھاکے میں اس سے کئی بار راحت کے ساتھ مل چکی تھی۔

"'راحت کہاں ہیں آج کل'؛ میں کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔

"'وہ بمبئی گئی ہے۔ لیکن اس کی شادی ہونے والی ہے'۔

"'اچھا۔ ہر سگفرڈفان باخ سے؟'

"'ارے نہیں۔ ایک بے حد سوئیٹ کینڈین ہے۔ چارلس فریزر۔ وہ راحت کو بہت دن سے کورٹ کر رہا تھا مگر وہ نہیں مانتی تھی کیوں کہ وطن چھوڑ کر سات سمندر پار جا بستا کیا تُک ہے'۔ پھر اس نے مہمانوں کی خاطر مدارات شروع کی۔ وسیع اونچی چھت والا کمرہ باتوں کے شور سے گونج رہا تھا۔

"چلتے وقت دولھا بھائی نے فرحت سے کہا 'شب بخیر بیگم قاسم'۔

"اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ 'میں مسز سروپ کمار ہوں! تشریف آوری کا دلی شکریہ'۔ اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہماری بڑی آپا اور بھائی جان کی طرح دولھا بھائی بھی پرانی اقدار کے آدمی

ہیں۔ بے چارے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھینپ کر نظریں نیچی کئے کئے آگے بڑھ گئے۔

"بی بی، جس وقت ہم سب اس وسیع گھرے کمرے میں بیٹھے تھے اور ثریا کی آواز ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے، کی تکرار کر رہی تھی تب دفعتاً ایسا ہوا آوازوں کے باوجود سناٹا چھا گیا اور ایسا لگا جیسے وجود کی ساری امٹ پشیمانی اور لغویت اور خستگی اور بے معنی پن اور بے رحمی دریا پر بکھرے کہرے کے ریلے کے ساتھ کمرے میں گھس آئی۔ اور ایسا لگا جیسے ۔۔۔ جیسے وقت سُن رہا ہے ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں وضاحت نہیں کر سکتی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں مگر تم سمجھ گئیں نا؟"

دور جنگلوں میں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر زرینہ کو دیکھا: "سرحد یہاں سے بہت قریب ہے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ اور پھر کہانی شروع کر دی۔

"شادی کے بعد میں اور ارسلان ایک شام ڈھاکہ کلب میں بیٹھے تھے۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ کپلنگ کی قوم سے ترکے میں حاصل کیا ہوا یہ انیسویں صدی کا برطانوی اپر کلاس انسٹی ٹیوشن برصغیر کے بڑے شہروں میں پرانی اسنوب ویلیو رکھنے کے علاوہ نئے دولت مند طبقے کی ایسی چوپال بن چکا ہے جہاں سیاست، ہائی فنانس اور دل کے سودے کس دھڑلے سے ہوتے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ راحت ایرفورس کے افسروں کے جمگھٹے میں کھڑی چہک رہی ہے ۔۔۔ مگر وہ بارہ تیرہ برس قبل والی راحت تھی جسے میں نے کلکتے میں دیکھا تھا۔

"مس عصمت کاشانی" کوئی کہہ رہا تھا۔

"عصمت بی بی بے چادری" کسی اور نے زیر لب کہا۔

"میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ایک ونگ کمانڈر نے تعارف کروایا: "عصمت کاشانی۔ ابھی کوئٹے سے بی۔ اے۔ کر کے آئی ہیں۔ راحت اور فرحت کی چھوٹی بہن عصمت نے بڑی تمکنت و غرور سے سلام کیا۔ اس میں راحت اور فرحت جیسی ملنساری اور اخلاق نہیں تھا۔ اسے ان صفات کی شاید ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ بے پناہ حسن کی مالک

تھی جو زندگی میں اس کی کامیابی کا ضامن تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے پھران عجیب و غریب بہنوں کے پر اسرار پس منظر کا تصور کیا۔ خانہ بدوشوں کے کارواں ــــ سرد چشمے، سیب اور بادام کے جھنڈ۔

" اسی وقت فرحت بھی آکر اس گروہ میں شامل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اور ارسلان وہاں سے کھسک آئے۔

" ارسلان کا تبادلہ سلہٹ کا ہوگیا۔ اور یہاں جانتی ہو ہماری ملاقات جب ہم اس بنگلے میں آئے تو سب سے پہلے کس سے ہوئی ؟

" مسٹر اور مسنر واجد !

" ان کے یہاں ایک لڑکا بھی ہے۔ صنوبر کی ممی حسب معمول تیسلا نگ سے چند مہینے کے لئے بیٹی داماد کے پاس آجاتی ہیں۔ صنوبر اور واجد کبھی بھولے سے بھی اپنے اپنے ماضی کا ذکر نہیں کرتے۔ تم کو شاید یاد ہو کہ واجد وہ شخص ہے جو کلکتے میں راحت کاشانی کا اور بجلی اور غالباً پہلا عاشق تھا۔ جب وہ وار پبلسٹی کے محکمے میں کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ رہتی تھی مگر واجد نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا" میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کی عزت نہیں کرتا، یاد ہے نا ؟"

" ہاں "

" اور میں سمجھتی ہوں " زرینہ نے گلا صاف کر کے کہا " کہ یہ دونوں یعنی صنوبر اور واجد اپنی زندگی سے، میرا مطلب ہے کہ کافی مطمئن ہیں۔

" کوئی چار مہینے کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گئی ہوئی تھی۔ وہاں اب ریسٹوراں اور نائٹ کلب کھل گئے ہیں۔ اور ڈھاکہ وہ پہلا سا خوابیدہ اور پرفسوں شہر نہیں رہا، تو وہاں ایک دکان سے نکل رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ قصبہ ریسٹوراں کے سامنے ایک چمکدار تھنڈر برڈ کھڑی ہے۔ جس کا ہڈ اترا ہوا ہے اور پچھلی سیٹ پر فرحت اور عصمت کاشانی نواب زادیوں کے سے

انداز میں بڑے ٹھسے سے بیٹھی ہیں۔ قصبہ کا ویٹر چار کی کشتی پیش کر رہا ہے اور چند حضرات کار سے لگے دونوں حسیناؤں سے باتوں میں مصروف ہیں۔

"جگہ کی تنگی کی وجہ سے مجھے ان کی کار سے بالکل سٹ کر نکلنا پڑا تو فرحت نے خاصی بے اعتنائی سے کہا ــــ "ہلو زرینہ ــ"

"ہلو ــــ ہلو ــــ" میں نے ٹھٹھک کر اس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ قاسم صاحب کیسے ہیں ؟ (کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ قاسم نے صنوبر کو طلاق دینے کے بعد فرحت سے، جو سروپ کمار سے طلاق لے چکی ہے، باقاعدہ شادی کر لی ہے) تس پر فرحت نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا ــــ "مجھے معلوم نہیں ــــ"

"یقین جانو میں بے حد قائل ہوئی اور اپنی بیوقوفی کا کامل یقین ہو گیا۔ جب میں تیزی سے سڑک عبور کر کے اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی تو قصبہ میں سے نکلنے والے دو نوجوانوں کے دو فقرے میرے کان میں پڑے۔

"سونا کھودنے والیاں"۔ اور "پبلک سکٹر"۔

"اور تب دفعتاً مجھ پر انکشاف ہوا تمہارا اور میرا محبوب خوابیدہ، مرنجاں مرنج، سیدھا سادا، غریب، شریف، بھولا بھالا، پروِنشل ڈھاکہ اب ایک ماڈرن، صنعتی، سوفیسٹی کیٹیڈ (SOPHISTICATED) بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز قلب ماہیت کی ایک علامت مجکیلی تھنڈر برڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹوراں کے سامنے کھڑی ہے ــــ لیکن ــــ" اس نے توقف کے بعد کہا "ملک کی اس خوش آیند ترقی کے ساتھ یہ شاخسانے ناگزیر ہیں۔ ہمیں اس چمکدار تھنڈر برڈ اور اس میں بیٹھی گولڈ ڈگرز کو بھی غالباً قبول کرنا ہوگا۔"

شہرزاد کی بڑ بڑاہٹیں ساکت ہو گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آتشدان کے شعلے مدھم پڑ گئے۔ کمرے میں اب صرف دیوار پر لگا ہوا الکٹرک کلاک روشن تھا۔ میں نے نظریں اٹھا

کر اسے دیکھا — کلاک کا روشن چہرہ جو صرف وقت بتاتا رہتا ہے۔ بے رحمی، بے تعلقی، بے نیازی کے ساتھ۔ اس کو ذرہ بھر پرواہ نہیں کہ سارے وقت تم پر کیا بیت رہی ہے۔

"چنانچہ بی بی"۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ تمھارے یہاں کی زندگی ہے"۔

"ہاں۔ مگر ایک قسم کی زندگی اور بھی ہے —" شہرزاد کی پرچھائیں نے کہا۔

"جس کو میں اس سرزمین پر سارے میں کھوجتی پھرتی ہوں۔ وہ چاروں طرف بکھری نظر آجاتی ہے جس کو میں لکھے ہوئے الفاظ اور سلولائیڈ کی ریل کی گرفت میں لانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ زندگی اتنی زخمی، اتنی گمبھیر، اتنی وسیع و عظیم ہے ..."

"... کہ اس کی عکاسی و ترجمانی کے لئے دل و جگر کا خون کرنا ہوگا"۔ شہرزاد کی پرچھائیں نے میری بات کاٹی۔

"... پھر بھی کامیابی مشکل ہے۔ یہ میرا قلم ہے —" میں نے اسکرپٹ پر رکھے ہوئے فاؤنٹین پن کو تاسف سے دیکھا۔ "کتنا کمزور اور ناکافی اور بے معنی اور مجبور —"

اچانک سامنے کے برآمدے میں بندھے ہوئے السیشین نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو۔ میں دیکھتی ہوں"۔ میں نے قریب کے فلور لیمپ کا سوئچ دبایا۔ شہرزاد کی پرچھائیں غائب ہوگئی۔ زرینہ کمرے کی لمبائی عبور کر کے دریچے میں گئی۔ میں نے اس کے پیچھے پیچھے جا کر دریچے کا پردہ سرکایا اور باہر جھانکا۔ جھلملاتے عنابی فرش والے چوڑے برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کتا بے تحاشا چلا رہا تھا۔

سامنے پھیکی چاندنی میں دو سائے گھاس پر گزرتے آہستہ آہستہ بنگلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک لحظے کے لئے میں اور زرینہ سہم کر رہ گئے۔ ارسلان بھائی آنکھیں ملتے اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے اور جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ پرچھائیاں سیڑھیوں پر آکر سرنگوں بیٹھ گئیں۔

ارسلان بھائی نے ڈپٹ کر کتے کو چپ کرایا۔ سیڑھی پر خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زرینہ نے مجھے آواز دی ــــ "میرا بیگ ــــ جلدی ــــ میرے کمرے کی کھڑکی میں ــــ" میں نے برآمدے کی روشنی جلائی۔ سائے ایک مرد اور ایک عورت میں تبدیل ہو گئے۔ بھورے رنگ کی شکستہ لوئی میں لپٹا ہوا نوجوان تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ لڑکی جس نے گھونگھٹ میں چہرہ چھپا رکھا تھا ارسلان بھائی کو دیکھ کر پام کے پیچھے دبک گئی۔ ارسلان بھائی نے جھک کر اجنبی نوجوان کو غور سے دیکھا اور دفعتاً سوال کیا "کہار سے آئے ہو؟"

وہ خاموش رہا اور دہشت زدہ نظروں سے ارسلان بھائی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سہم کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے زرینہ کا میڈیکل بیگ لا کر دیا۔ بنگلے کا چوکیدار کھٹ کھٹ ڈنڈا بجاتا باغ کے اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔ زرینہ نے نوجوان کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ "شکر ہے۔ گولی نہیں لگی۔ چوٹ کسی اور وجہ سے آئی ہے۔" زرینہ نے کہا۔ پھر اس نے لڑکی کو مخاطب کیا "لو اپنے آدمی کو ادھر لٹا دو ــــ" شاگرد پیشے کی طرف سے دو تین ملازم دوڑتے ہوئے آن پہنچے۔ لڑکی نے گھبرا کر چہرہ اچھی طرح چھپا لیا "اگر تم اس طرح منہ چھپائے رکھو گی تو کیسے کام چلے گا۔ لو ادھر سے اس کی ٹانگ پکڑو ــــ شاباش ــــ"

زرینہ مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار بات کی "ای بچ جھیتیں بیگم صاحب ــــ؟"

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا "پاربتی!"

پاربتی نے آگے کھسک کر زرینہ کے پاؤں پکڑنا چاہے۔

"گڈ گوڈ ــــ وی آر ان ٹربل۔" زرینہ نے پیچھے ہٹ کر انجکشن کی سرنج بھرتے ہوئے کہا۔

ارسلان بھائی نے سگریٹ سلگایا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے پہنے سیڑھیاں پھلانگ کر جیپ میں جا بیٹھے "زرینہ یہ بارڈر انسی ڈنٹ ہے۔ احتیاط سے کام لو۔ میں تحقیقات کے

لئے جاتا ہوں۔" دوسرے لمحے جیپ ٹیلے کی ڈھلوان اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد احاطے کا دوسرا پھاٹک ہیڈ لیمپوں کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ پولس جیپ زنّاٹے سے آ کر رکی۔ سب انسپکٹر نے اتر کر سیلوٹ جھاڑا اور غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے والے بھارتی مسلمان مسمی غفور الرحمٰن میاں کو حوالہ پولس کرنے کا مطالبہ کیا۔

"صاحب ابھی بارڈر پر گئے ہیں۔ ان کے آنے کا انتظار کیجئے۔" زرینہ نے جواب دیا۔ اجنبی نیم بیہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ سپاہی اور کانسٹبل جیپ سے اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دوسرا سوال کیا۔" بیگم صاحبہ۔ رام پرشاد ہیڈ چوکیدار کی لڑکی یہاں آئی ہے؟ یہ اغوا کا کیس بھی ہے بیگم صاحبہ۔"

پاربتی نے زرینہ کی ساری کا پلّو پکڑ لیا اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔

"تھانیدار صاحب۔" زرینہ نے بھویں اٹھا کر پوچھا۔" اگر یہ شخص اس ملک کا باشندہ نہیں ہے تو آپ اس پر اغوا کا مقدمہ کس طرح چلائیں گے؟"

"خدا کے لئے زرینہ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔" تم اپنا قانون مت چھانٹو۔ تم کو کیا معلوم قانونی پوزیشن کیا ہے۔"

"بکواس ——" زرینہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔" بہرحال۔" اس نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔" صاحب کا انتظار کیجئے۔"

اب پو پھٹنے والی تھی۔ سپاہی برآمدے کے نیچے بجلی کی روشنی میں زرینہ کے ملازموں سے باتیں کرنے لگے۔ سب انسپکٹر نے ٹہلتے ہوئے دور جا کر سگریٹ جلایا اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس آ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک ملازم نے گرم چاء لا کر زخمی کو پلائی۔ جو نیم بیہوشی کی حالت میں بڑبڑایا کیا۔ پاربتی اس کے قدموں کے نیچے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زرینہ نے اس سے سارا واقعہ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بالکل خاموش تھی۔

سورج نکلتے نکلتے ارسلان بھائی واپس آئے۔

سب انسپکٹر نے ان سے آہستہ آہستہ مفصل بات کی۔ ارسلان بھائی سر نیہوڑا ئے، تیوری پر بل ڈالے غور سے سنتے رہے۔ پھر زخمی کو جیپ پر بٹھایا گیا۔ چلتے وقت اس نے زرینہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہتا ہو۔ انسان دوست خاتون! آخر تم نے بھی میرے ساتھ دغا کی۔ دوسری جیپ پر پاربتی کو زبردستی چڑھایا گیا تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس نے مڑکر زرینہ کو دیکھا بھی نہیں۔ دونوں گاڑیاں پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

اب بنگلے کے عقب میں زرینہ کی ہری بھری وسیع سبزی باڑی میں مرغ نے اذان دی۔

ہم لوگ ڈرائنگ روم میں واپس آئے۔ بیرے نے جھلملاتی ہوئی چاندی کی کشتی میں سجے کوئین این ٹی سیٹ اور اسپوڈ چائنا میں چار لاکر سامنے رکھی۔ سویرا ہو گیا۔ سامنے دریا کے پانی میں دُھلے اجالے نے چار کے باغ آہستہ آہستہ روشن کر دیئے۔

صبح دس بجے سری منگل سے اکرم خاں کیمرہ مین کا فون آیا کہ وہ کراچی سے آگیا ہے۔ اور ٹی گارڈن کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

اس کے آنے کے بعد میں اور زرینہ اسے ساتھ لے کر نزدیک کی مختصر سی ایر فیلڈ پر گئے۔ جہاں مختصر سا طیارہ منتظر کھڑا تھا۔ خوش اخلاق پنجابی پائلٹ نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ طیارہ اوپر اٹھا۔

بڑا شگفتہ، سہانا دن تھا۔ تیز نیلے آسمان پر رنگ برنگے پرندے ہوا کی لہروں میں تیر رہے تھے۔ حدِ نظر تک سبزہ پھیلا تھا۔ نیلے پانیوں میں گھرے ناریل، سپاری اور رتاڑ کے درختوں کے جزیروں پر سفید بنگلے اور چھے منڈلا رہے تھے۔ جگہ جگہ ہرے بھرے گاؤوں کے جھونپڑوں پر زرد، سرخ اور کاسنی پھولوں کی بیلیں لہلہا رہی تھیں۔ جھیلوں میں سرخ کنول کھلے تھے۔ نالوں میں نیلوفر اور سوسن جگمگاتے تھے۔ ندیوں میں نوکے چل رہے تھے۔ آخر ہم کاہے کی لوکیشن

تلاش کر رہے ہیں۔

اکرم خاں وقتاً فوقتاً جھک کر کیمرہ چلا دیتا۔ پیچدار پہاڑی راستے کے کنارے ایک وائرلیس والی جیپ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر چند فوجی ٹہل رہے تھے۔ "کل رات یہاں ایک معمولی انسی ڈنٹ ہوا تھا۔" پائلٹ نے بشاشت سے مطلع کیا۔

اب ہم دریا کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ نیچے پانی کی جگمگاتی سطح پر بھیرب بازار پاکستان سے اگرتلہ ہندوستان کی سمت مسافروں سے لدے اسٹیمر رواں تھے۔ اگرتلہ سے بھیرب بازار کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر آرہے تھے۔

"آسام اور ایسٹ پاکستان کے درمیان معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔" پائیلٹ نے اظہار خیال کیا۔ "اتنا قانونی ٹریفک بھی خطرناک اور غیر قانونی تو ——" اس نے بات پوری ختم کئے بغیر جنوبی سلہٹ کا رخ کیا۔

"فینچوگنج ——!" میں نے کہا۔ زرینہ اور میں نیچے جھانکنے لگے جہاں سرخ چھتوں والے پگوڈا ایسے گھروں کی قطار دریا کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ لاہور کے اکرم خاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔ "آخر کیا رکھا ہے ان بیک ورڈ جگہوں میں؟"

سلہٹ شہر کے اونچے پل پر ٹریفک کا جم غفیر چیونٹیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ شاہ جلالؒ کی سفید درگاہ پر عقیدت مندوں کی سست رو آمد و رفت جاری تھی۔ صحن میں کبوتروں کے جھنڈ بیٹھے تھے۔ ٹین کے مکانوں کے سامنے چٹائیاں اور بید کا فرنیچر بنایا جا رہا تھا۔ بازار میں سڑک کے کنارے سنترے کے ڈھیر لگے تھے۔

تیسرے پہر کو ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ کل ہم گھنے جنگلوں کے اوپر ہیلی کوپٹر میں جائیں گے۔

دوسری صبح ہم نے ہیلی کوپٹر کے ذریعے ایک بے انتہا خوش منظر کھاسی گاؤں تلاش کر لیا۔ افق پر کامروپ کی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے دوسری جانب چار بگان کے ٹیلے

حدِ نظر تک پھیلے تھے۔ تیسری طرف گھنا جنگل تھا جس کے درمیان سے سرحد کی غیر مرئی لکیر گزرتی تھی۔ چار بگان کے سب سے اونچے ٹیلے کی چوٹی پر کسی اسکاٹش پلانٹر کا اکیلا بنگلہ دور سے نظر آرہا تھا۔

"یہاں مسٹر اور مسز اینگس ڈنکن چالیس سال سے رہ رہے ہیں۔" زرینہ نے مجھے بتایا۔ "ذرا سوچو تو چالیس سال۔ انسان کہاں پیدا ہوتا ہے اور کہاں کہاں جاکر اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ گلاسگو سے آکر اینگس اور نورا ڈنکن نے اپنا ماہِ عسل اسی بنگلے میں بنایا تھا۔ یہیں ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے جو جوان ہو کر پچھلی لڑائی میں مارے گئے۔ اب دونوں میاں بیوی پھر تنہا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب روزانہ شام کو اپنے برآمدے کے سامنے ندی میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کی بھی بڑی پرسکون اور خوبصورت شام ہے۔"

دوسرے روز اندھیرا پڑے میں اکرم خاں کے ساتھ شوٹنگ کے متعلق انتظامات کرنے کے لئے رام نندن مکھیا کے گاؤں گئی تو دیکھا کہ تقریباً ساری بستی چوپال میں جمع ہے۔ فیکٹری اور باغوں سے لوٹتے ہوئے مزدور آآکر برگد کے نیچے اکٹھے ہو رہے تھے۔

"شاید بنیادی جمہوریت کی پنچایت ہو رہی ہے ـــــ ویلیج لیول پر ـــــ" اکرم خاں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ چند ماہ قبل میں نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق ڈاکومنٹری فلم کا مسالہ جمع کرنے کے لئے صوبے کے وسطی اضلاع کے دیہات کا دورہ کیا تھا۔ مگر پوربی مزدوروں کا یہ مجمع بنگالی گاؤں کی پنچایت سے مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے چوپال کے قریب جاکر رام نندن کو آواز دی۔ وہ سر پہ انگوچھا لپیٹتا دوڑا آیا۔

"کوئی تہوار ہے رام نندن؟" میں نے دریافت کیا۔

"آج برادری پاربتی کا پھیسلہ کریہے۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔ اکرم خاں "چہرے" تلاش کرنے بستی کے اندر چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پاربتی سر جھکائے آم کے نیچے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کرید رہی تھی۔ اس کا باپ رام پرشاد دوسرے درخت کے نیچے سر جھکائے

بیٹھا تھا۔ اس کی ماں ایک جھونپڑے کی دیوار سے لگی بین کر کرکے بیٹی کو کوسنے میں مصروف تھی۔ پاربتی کے بازوؤں پر نیل پڑے تھے۔ پاربتی جو ایسٹ مین کلر کی اس عنائی ڈوکومنٹری کا ایک اہم کردار بننے والی تھی۔

دوسری صبح میں کھاسی گاؤں کی طرف جا رہی تھی کہ جنگل کے راستے پر غفور الرحمٰن میاں نظر آگیا۔ وہ سڑک کے کنارے لوئی اوڑھے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور زخمی ٹانگ پھیلا کر زرینہ کی باندھی ہوئی پٹی جو میلی اور ڈھیلی پڑ چکی تھی بڑے دھیان سے دوبارہ کسنے لگا۔ جیپ اپنے نزدیک رکتی دیکھ کر وہ اس رات کی طرح سہما نہیں۔ بلکہ بڑے استہزا سے مجھے گھورنے لگا۔ اتنے میں کچھ فاصلے پر ایک باشاہٹ میں سے بارڈر پولس کا ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ دس بارہ آدمیوں کا گروہ تھا جو ایک کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں بوڑھے، بوڑھیاں، بچے اور نوجوان سبھی شامل تھے۔ وہ سب سرحد کے پھاٹک کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ غفور الرحمٰن میاں ان سب سے پیچھے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کے عقب میں ایک اور سپاہی تھا۔

جیپ آگے بڑھی۔ راستے کے دونوں طرف سفید تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ جنگل کے اندر سرنگ جیسے گہرے تنہا راستے پر سے اکا دکا کھاسی عورت گزر جاتی تھی۔ آسمان پر ایک ڈکوٹا گوہاٹی کی سمت سے آیا اور گڑگڑاتا ہوا کلکتہ کی طرف نکل گیا۔ کیا یہ طیارہ بھی فضا میں دخل اندازی کر رہا ہے؟ انسان ایسی سرزمینوں میں دخل اندازی کر رہے ہیں جن کے لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہیں۔ انسان ایک دوسرے کے جذبات میں، دلوں میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔ سرحدوں کے متعلق، کون کس کا فیصلہ کرے گا۔

"اس رات والے معاملے کا عقدہ اب تک حل نہیں ہوا ـــــ" رات کو مسٹر اور مسز میلکم مک فرسن کے یہاں کھانے کی میز پر زرینہ نے کہا۔

"غفور الرحمٰن میاں ــــ" ارسلان بھائی نے چاول کی قاب سنتھیا مک فرسن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے جواب دیا۔ "ان لاکھوں لوگوں میں سے ہے جو روزی کی تلاش میں پردیس چلے جاتے ہیں۔ کلکتے میں ریور نیوی گیشن کا بیشتر عملہ سلہٹ کے ملاحوں پر مشتمل ہے جن کی قومیت اب بھی پاکستانی ہے۔ غفور الرحمٰن میاں بھی سلہٹی ملّاح ہے اور اپنے اسٹیمر پر آسام سے یہاں آتا رہتا تھا۔ ہمارے اسٹیمر گھاٹ پر اسے پاربتی مل گئی جو ہماری فیکٹری سے برآمد ہونے والی چار کی پیٹیاں ڈھو کر اسٹیمروں پر چڑھاتی ہے۔"

"پاربتی کا باپ میری اسٹیٹ پر بھی چوکیداری کر چکا ہے ــــ" میلکم مک فرسن نے سر اٹھا کر مجھے بتایا۔

"پاربتی اور غفور الرحمٰن میاں ــــ" ارسلان بھائی نے رائی کی شیشی اپنی جگہ پر واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ رواج کے مطابق پاربتی کی بچپن سے کسی شخص سے سگائی ہو چکی ہے جو چاند پور بگان پر کام کرتا ہے اور اس کے باپ سے دس سال بڑا ہے۔ بہت جلد اس کا گونا بھی ہونے والا تھا۔

"پاربتی نے غفور سے کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ آسام یا کلکتے بھگا لے جائے مگر غفور الرحمٰن میاں نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کے ماں باپ اپنے آبائی گاؤں آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس کے ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کو آسام میں پاکستانی کی حیثیت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے پاربتی کو اپنے آنے کی اطلاع کرا دی اور یہ لڑکی راتوں رات اسے لینے کے لئے بارڈر پر پہنچی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنگلوں جنگلوں ہوتے دریا پر پہنچ کر جنوبی سلہٹ چلے جائیں گے جہاں غفور الرحمٰن میاں کا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن بارڈر پٹرول آسام سے آنے والوں اور اسمگلروں کی روک تھام کے لئے بے حد چوکس ہو چکا ہے۔ غفور الرحمٰن میاں کے ساتھ ہی ایک اور قافلہ سرحد کے جنگل میں داخل ہوا تھا تبھی پولس کے سپاہیوں نے چند اسمگلروں کے تعاقب میں گولی چلا دی۔ پاربتی اور غفور سرپٹ بھاگے مگر ناکہ بندی کو

توڑ کر نکلنا ناممکن تھا۔ بھاگتے ہیں غفور گھپ اندھیرے میں کافی بلندی سے کھڈ میں جا گرا۔

"مگر ذرا اس لڑکی کی بہادری اور عقل دیکھئے۔" ارسلان بھائی نے میلکم مک فرسن کو مخاطب کیا۔ "اسے معلوم تھا کہ رات کے گیارہ بجے ہماری فیکٹری کا ٹرک فلاں راستے سے گذرتا ہے۔ وہ غفور کو گھسیٹتی ہوئی سڑک کے موڑ تک لے گئی اور جب ٹرک قریب آیا تو ڈرائیور سے التجا کی وہ ان دونوں کو میرے یہاں پہنچا دے۔ اس وقت تک غفور الرحمٰن بیہوش ہو چکا تھا۔ یہ بھی جانتی تھی کہ غفور کو لے کر یہاں آنا بڑا خطرناک ہے ـــــ لیکن اسے ہماری زرینہ بیگم پر بڑا ناز تھا۔"

زرینہ نے فوراً ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے ارسلان بھائی سے کہا "ایک بات بتائیے۔ ان گنت انسان سرحد کے دونوں طرف ڈھکیلے جا رہے ہیں اور باہر کی دنیا میں اس قیامت خیز المیے پر دھیان دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔ کسی کو احساس نہیں کہ ان ہزار ہا بے خانماں بھوکے اسٹیٹ لس انسانوں پر کیا گذر رہی ہے جن کو پاکستانی کی حیثیت سے آسام سے اس طرف رواد کر دیا جاتا ہے اور جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کو بھارتی کہہ کر پھر واپس دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس المناک صورتِ حال کے ذمے دار وہ خود تو نہیں ـــــ ان کا کیا قصور ہے؟"

"حکومتوں کے لئے بین الاقوامی قوانین کی پابندی بھی تو کوئی شے ہے۔ تم غالباً نراج کی خواہاں ہو۔ حکومتیں ـــ" میلکم مک فرسن نے کہنا شروع کیا۔

"حکومتیں ــــ حکومتیں ــــ" میں نے چڑ کر ان کی بات کاٹی۔

"اب ہم ساری دنیا کی بگڑی تو نہیں بنا سکتے۔" میلکم مک فرسن نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مصیبت یہ ہے۔" انھوں نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے اضافہ کیا "کہ تم ضرورت سے

زیادہ حساس ہو۔"

"یہ شخص غفور الرحمٰن میاں، یہ بھوکا، ننگا، فاقہ کش ملاح اور اس کے فاقہ کش ماں باپ اور بہن بھائی غالباً صرف اتنا جانتے ہیں کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں مگر دکھ کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ وہ غالباً نہیں جانتے کہ ان گھنے جنگلوں میں آسام کہاں ختم ہوتا ہے اور سلہٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اقوام متحدہ میں مسئلہ برلن کے سلسلے میں ان کی نمائندگی پاکستان کو کرنی چاہئے یا ہندوستانی ڈیلی گیشن ان کی ترجمانی کرے گا۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور انناس اور دھان کا کھیت سرما ندی کے کنارے تھا جہاں پرکھوں کے زمانے سے وہ رہتے آئے تھے۔ اور اب وہ ان کا نہیں — پھر غفور الرحمٰن میاں اسمگلنگ کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے مجھے ذرا دھیان سے دیکھا "تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو۔" انھوں نے پائپ کا کش لگا کر کہا۔ "مگر اس صورتِ حال کا کیا علاج ہے؟"

"آئیے۔ ماہ جونگ کھیلا جائے۔" سینتھیا مک فرسن نے شگفتگی سے تجویز کیا۔

کراچی سے میرے تار کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ دو تین دن بعد میں نے طے کیا کہ شوٹنگ شروع کر دینی مناسب ہے۔ صبح سویرے میں نے ساریوں کے بنڈل نکالے۔ دس دس روپے کی رنگ برنگی ساریاں، پگڑیاں اور دھوتیاں اور چاندی کے گہنے جو میں "اداکاروں" کو تحفے کے طور پر دینے کے لئے ڈھاکے سے خرید کر لائی تھی۔ زرینہ نے خود کو گویا کوسٹیوم ڈپارٹمنٹ کا انچارج مقرر کیا۔ اکرم خاں مع چپراسی اپنا ساز و سامان لے کر سری منگل سے سیدھا لوکیشن پر پہنچنے والا تھا۔ میں اور زرینہ اپنے لوازمات کے ساتھ جیپ میں سوار ہونے والے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ "مسٹر ہربرٹ کننگھم کے فوری آپریشن میں میری مدد کے لئے جلد از جلد ہسپتال پہنچئے —" ٹی اسٹیٹ کا میڈیکل افیسر گھبرائی ہوئی آواز میں

کہہ رہا تھا۔

"اومائی گاڈ" زرینہ نے مایوسی سے ریسیور رکھا۔

"کیا ہوا — خیریت؟"

"ہربرٹ کننگھم ایک نوجوان پلانٹر ہے۔ شاید اپنڈی سائیٹس کا آپریشن ہے۔ تمھاری شوٹنگ مِس کرنی پڑے گی۔ خدا حافظ۔" وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھی اور ہسپتال کی طرف اڑنچھو ہو گئی۔

"سیٹ" پر بڑی گہما گہمی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بے شمار دبلے پتلے فاقہ زدہ بچے چاروں طرف کھڑے حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ارسلان بھائی کے چار بنگان کے مزدور مرد اور عورتیں جن کو خاص طور پر آج کے دن کے لئے چھٹی دی گئی تھی۔ ڈھول مجیرے سنبھالے کیمرے کے گرد گھیرے کھڑے تھے اور اپنی نئی دھوتیوں اور ساریوں کے بنڈل دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

پھر لڑکیاں ساریاں اور گہنے پہن کر شرماتی ہوئی ایک طرف کو آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"پاربتی کہاں ہے؟" میں نے رام نندن سے دریافت کیا۔ وہ چپ رہا۔

"پاربتی کہاں ہے رام نندن؟"

"بٹیا — وہ پیچھے چھپی بیٹھی ہے — برادری کی اچھت کا معاملہ ہے —" اس نے رکتے ہوئے کہا۔

میں نے پاربتی کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ ایک جھونپڑے کے پچھواڑے تالاب کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کپڑوں کا بنڈل اسے دیا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔

پاربتی۔ دیکھو۔ کتنی سندر ساری ہے۔ لال لال ایکدم۔ ہرا بلاؤز۔ اور یہ دیکھو گہنے۔ کرن پھول اور طوق — یہ آلتا کی شیشی۔"

اس نے نظریں اٹھاکر مجھے دیکھا بھی نہیں۔

"پاربتی۔ سب باہر ولایت مالوگ تمہرا سینما دیکھیہیں ـــــ لیو ــــ"

میں نے دہرایا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے فکر ہوگئی۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ اچانک رام نندن ڈنڈا لئے اس کے سر پر آن کھڑا ہوا "جو بٹیا کہت ہیں کرت کاہے ناہیں ہے۔ پھر مار کھیئیے؟" اس نے گرج کر کہا۔

جواب میں میں نے رام نندن کو ڈانٹنا چاہا۔ مگر اتنے میں پاربتی سرعت سے اٹھی اور بنڈل اٹھاکر ایک جھونپڑے میں گھس گئی جو "گرین روم" کا کام دے رہا تھا۔

جب وہ تیار ہوکر "سیٹ" پر آئی تو اکرم خاں حیرت سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"کیا غضب کا کیمرہ فیس ہے" اس نے کیمرے میں جھانک کر کہا اور چہرے کا فاصلہ ماپنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے ایک بیل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اسکرپٹ نکالا جو چار بگان کے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر لکھتے لکھتے ادھورا چھوڑ دیا تھا

۱۰۔ مزدور کام کر رہے ہیں۔	دھرتی کے جیالے بیٹے اور بیٹیاں دھرتی کے
۱۱۔ مزدوروں کا لوک ناچ	امرت، حیات بخش گیت گاتے ہوئے۔

شگفتہ چہرے

ہاہاہا۔ میں نے کاغذ زمین پر رکھ دیا اور دوربین اٹھاکر سامنے دیکھنے لگی۔ اکرم خاں کو چاہئے کہ بین شوٹ ساؤ کے جھنڈے سے شروع کرے۔ میں نے دوربین کا رخ جنگل کی سمت کیا۔ دور بل کھاتے راستے پر سے ایک سبز رنگ کی جیپ گزر رہی تھی اور مسز ریٹا فریزر اسے چلا رہی تھیں۔ وہ تنہا تھیں۔

سیکوئینس ۱۲ گھنا جنگل	چاروں طرف اندھیرے گھنے جنگلوں میں

(ماحول تعمیر کرو)
ایک جیپ گذر رہی ہے۔

خوبصورت باگھ بگھیلے اور ہرن اور دور دور سے
آئے ہوئے سیلانی اور شکاری۔

میں نے فوراً دوربین گھاس پر رکھ کر رام نندن کو آواز دی جو نئے کپڑے پہنے ڈھول گلے میں لٹکائے خوش خوش پھر رہا تھا۔

"رام نندا، ——" میں دوبارہ پکارا۔

"بٹیا ——" وہ دوڑا ہوا آیا۔

"دیکھو ہماری جیپ لے کر سیدھے جاؤ اور میم صاحب کی ہری جیپ کا پیچھا کرو۔ اور ان کو روک کر ہمارا سلام بولو۔ جلدی ایکدم۔"

"جی بٹیا ——" رام نندن ترنت ڈرائیور سے بات کر کے مسز فریزر کے تعاقب میں ہوا ہو گیا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ لیکن رام نندن یا مسز فریزر کا پتہ نہ تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا میں اکرم خاں کی جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔

لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔ خود رو اودے پھولوں پر سفید تتریاں اڑ رہی تھیں۔ جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسز فریزر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر دوربین کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمل خاموشی شروع ہوتی تھی۔ اس بلوریں خامشی میں زرد پتوں پر چلتی ہوئی میں وادی کے سناٹے میں داخل ہو گئی۔ نیچے سڑک پر دو کھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے اور سفید گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک میری نظر نشیب کی سمت گئی جہاں بانس کے جھنڈ میں سبز جیپ کھڑی تھی اور مسز فریزر کیمرہ سنبھالے سفید پھولوں سے لدی ہوئی ایک "رُوبی ٹری" کے تنے سے لگی کھڑی تھیں۔

انھوں نے سرخ رنگ کی چست پتلون پہن رکھی تھی
اتنے میں ایک سیاہ فورڈ کونسل دوسری طرف سے آئی اور واجد جاد کی جھاڑیوں کے نزدیک اترا۔ شاید وہ معائنہ کرنے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے اور تیوری پر بل۔ وہ ایک سنجیدہ شکل والا، ذرا جھکا ہوا طویل القامت آدمی تھا۔ وہ باغ کے سپروائزر سے بات کرنے میں مصروف رہا۔ پھر چند چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے سروں پہ ہاتھ پھیرا جو بانس کے ڈبوں میں چار کے بیج کے کیڑے جمع کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ دوسرے باغ کی طرف بڑھا۔ یہاں اس نے ڈھلوان کے پاس کار روک لی اور کاغذات نکالے۔

اچانک اس کی نظر مسز فریزر پر پڑی جو درخت کے نیچے بت بنی کھڑی اسے آتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لحظے کے لئے وہ ٹھٹھک گیا۔ راحت نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور درخت کے تنے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ واجد چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا اور چند سکنڈ تک چپ چاپ کھڑا راحت کو دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا، کندھے جھکائے کار میں جا بیٹھا اور زناٹے سے پہاڑی کے نیچے اتر گیا۔

راحت نے آنکھوں پر ہتھیلیاں پھیریں۔ رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ بال پیچھے کو جھٹکاتے۔ گہرا سانس لے کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ شانے سیدھے کئے اور آہستہ آہستہ چلتی جیپ میں جا بیٹھی۔ اسی وقت رام نندن کی جیپ اس کے قریب جا پہنچی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور لوکیشن پر واپس آ گئی۔

میرے واپس پہنچنے کے چند منٹ بعد مسز فریزر بھی آ گئیں۔ انھوں نے مسکرا کر دور سے ہاتھ ہلایا اور جیپ میں سے کود کر "سیٹ" پر آ گئیں۔

"ہائی ـــــ" انھوں نے کہا۔

"گڈ مارننگ مسز فریزر۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مسز فریزر کیا آپ اس منظر میں حصہ لینا پسند کریں گی؟" میں نے ان کو منظر سمجھایا۔

"شیور ـــ آئی وڈ لو ٹو۔"

"تو آئیے تھوڑی سی ریہرسل کرلیں۔"

"شیور ـــ"

میں نے کیمرے پیچھے جاکر ان کو دیکھا۔ واقعی ان میں غضب کا "اسٹیج سنس" تھا۔ وہ بڑی ادا سے جیپ سے اتریں۔ مسکرائیں۔ مزدوروں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے ان کو پھول پیش کئے۔ لوک ناچ کے دوران میں اکسائیٹ منٹ کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے تالیاں بجائیں۔ مکمل امریکن ٹورسٹ۔

وہ مجھ سے اور اکرم خاں سے مستقل انگریزی میں گفتگو کرتی رہیں اور مزدوروں سے ٹوٹی پھوٹی امریکن اردو میں ایک آدھ بات کی۔ اکرم خاں نے شوٹنگ شروع کردی۔

مسز فریزر کی پیشانی پر داہنی طرف پٹی کا کراس بنا ہوا تھا جسے انھوں نے بڑے سلیقے سے بالوں کی سنہری لٹ میں چھپا لیا تھا۔ اکرم خاں نے ان کے اور "اسٹار ڈانسر" پاربتی کے باری باری کئی کلوز اپ لئے۔

اچانک سورج پر بادل آگئے۔ اکرم خاں نے کندھے اچکا کر ہاتھ پھیلائے اور آسمان کو دیکھا۔ مسز فریزر ہنسنے لگیں۔ پھر وہ ادا سے سر تھوڑا اکر اسی طرح چلتی ہوئی جیسے پانی پر رواں ہوں، میرے پاس آئیں اور بولیں ـــ "جی ـــ از نٹ اِٹ اکسائیٹنگ۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مُووی کیمرے کا سامنا کیا ہے۔ از نٹ اِٹ فن!"

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو یہ اچھا لگا مسز فریزر۔" میں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

"ابھی میرا کام باقی ہے؟"

"جی ہاں۔ تھوڑا سا۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ آپ اسی طرح جیپ میں بیٹھ کر جنگل کے راستے سے گذر یے۔ میں نے چپراسی کو ابھی اپنے گھر بھیجا ہے کہ میرے بہنوئی کی بندوق لے آئے۔"

"بندوق ؟" انھوں نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعی طور پر خوفزدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔
"جی ہاں۔ آپ کا ایک شاٹ بندوق کے ساتھ بھی بہت عمدہ رہے گا۔ باقی "شکاریوں" کو ہم کل پرسوں جمع کرلیں گے۔"
"تو اب میں شکار پر جاؤں گی؟ لیکن ابھی تو میں لوک ناچ دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگا؟" مسز فریزر نے غضب کے بھولپن سے پوچھا۔
"میڈیم وہ سب ایڈیٹنگ کے وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی آپ مہربانی سے ذرا جیپ اسٹارٹ کر دیجئے۔" اکرم خاں نے جو ایک اکل کھرا پٹھان تھا۔ ذرا جھنجھلا کر جواب دیا۔ بادل ہٹ گئے تھے۔

"شیور۔"

اکرم خاں نے کیمرہ چلا دیا۔ مگر چند منٹ بعد گھرے بادلوں نے سورج کو ڈھانپ لیا۔
"لنچ بریک۔" اکرم خاں نے آواز دی۔
زرینہ کا ملازم جیپ میں سے کھانے کی ٹوکریاں نکال کر لایا۔ "آئیے مسز فریزر۔" میں نے کہا۔
"جی نہیں شکریہ۔ میں صبح بہت کافی ناشتہ کرکے چلی تھی اور میں دوپہر کا کھانا کبھی نہیں کھاتی۔ میں اتنی دیر میں چند ضروری خط لکھ لوں۔ جب میری ضرورت ہو مجھے فوراً بلا لیجئے گا۔" مسز فریزر نے کہا اور تھوڑی دیر جا کر ایک خالی جھونپڑے کے برآمدے میں بیٹھ گئیں اور بیگ سے کاغذ نکالنے میں منہمک ہوگئیں۔

تیسرا پہر آ گیا۔ سائے طویل ہوئے۔ دن ڈھلنے لگا مگر آسمان صاف نہیں ہوا۔ مسز فریزر جھونپڑے کے برآمدے میں لگاتار سگریٹ پی کر لکھنے اور ایک کتاب پڑھنے میں مصروف رہیں۔
"آخر کب تک انتظار کیا جائے؟" اکرم خاں نے عاجز آ کر کہا۔

"جب تک بادل نہ چھٹیں اکرم خاں۔" میں نے جواب دیا "کبھی تو سورج نکلے گا۔"
"اور اگر بالکل نہ نکلا تو؟ آج کا دن بالکل بےکار گیا۔"
"جب تک وقت ہمارے ہاتھ میں ہے ہم بادل چھٹنے کا انتظار کریں گے۔" میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔ وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی طرف چلا گیا۔

جاڑے کی شام بہت سرعت سے وادی پر چھانے لگی۔ چپراسی بندوق لے کر ابھی نہیں آیا تھا کہ پیک اپ کا وقت آگیا۔ اتنے میں میلکم مک فرسن کی کار زنّاٹے سے آکر سیٹ کے سامنے رکی اور مسٹر مک فرسن بھاگتے ہوئے بےحد سراسیمہ میری طرف آئے۔

"مسز فریزر یہاں ہیں؟ ان کو اجازت دو کہ میرے ساتھ فوراً چلی چلیں۔" بھاری بھرکم اور متین مسٹر مک فرسن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

مسز فریزر جنھوں نے سارا دن جھونپڑے میں بیٹھے بیٹھے گذار دیا تھا مسٹر مک فرسن کی آواز سن کر ہماری طرف آئیں۔

"ریٹا — فوراً میرے ساتھ چلو۔"

"کیا ہوا — خیریت؟"

میلکم مک فرسن نے جواب دیے بغیر مسز فریزر کو گھسیٹ کر کار میں ڈھکیل دیا۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سر نکال کر مجھے آواز دی — "میں رات کو تمھارے یہاں آؤں گا —" دوسرے لمحے کار درختوں میں غائب ہو گئی۔

"اداکاروں" کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف روانہ ہوئیں۔ شرماتی لجاتی لڑکیاں منہ میں پلّو ٹھونس کر یا کھلکھلا کے ہنستی ہوئی ٹولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ انھوں نے اپنی پھٹی پرانی ساریاں دوبارہ لپیٹ کر اپنی نئی ساریاں کل کی شوٹنگ کے لئے سینت لی تھیں۔ پاربتی ایک درخت کے نیچے بیٹھی اسی طرح چپ چاپ اپنے گہنے اتار رہی تھی۔ اور بار بار بےچین، دہشت زدہ نگاہیں اٹھا کر دور جنگل کے راستے کو دیکھ لیتی تھی جس پر اب کہرہ منڈلا

رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی نئی ساری اور گہنوں کی پوٹلی بنا کر بغل میں دابی اور پیر کے انگوٹھے سے کنکروں کو ٹھوکریں مارتی اپنے گاؤں کی طرف چل دی۔

جس وقت ہماری جیپ گاؤں کی ڈھلوان سے اتر رہی تھی رام نندن دوڑا دوڑا آیا۔
"بٹیا ــــ بٹیا ــــ اپنے کاگج بھول گئیں ــــ یہ لیجئے ــــ"
میں نے رام نندن کے ہاتھ سے ڈڈو کو منٹری کا فائل لیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کاغذات تھے۔ میں ان کو ترتیب دینے لگی تو ایک اجنبی تحریر دکھلائی پڑی۔ میں نے ذرا تعجب سے اس پر سرسری نظر ڈالی۔

"سلہٹ

۲۲ر دسمبر ۱۹۶۰ء

میرے پیارے ابا جی تسلیم!

راشدہ پھوپھی کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں نے اندور کے ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کا انتظام کروا دیا ہے۔ آپ کے آپریشن کے لئے۔ فوراً وہاں داخل ہو جائیے۔ میرا دل آپ کو دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے اور میں بیحد پریشان ہوں اور جلد آپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔ میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ تاکہ شام کی گاڑی سے نکل جائے۔ امی جان کو میرا دست بستہ آداب کہئے گا۔ سکینہ اور رابعہ ڈھاکے میں خیریت سے ہیں۔

آپ کی تابعدار بیٹی محمودہ"

تحریر پر چند آنسو بھی ٹپکے تھے کیوں کہ سیاہی ایک آدھ جگہ سے بہہ گئی تھی۔ ساتھ ہی لفافہ تھا:

جناب مولوی عبدالصمد صاحب
مکان ۱۹ متصل مدرسہ عالیہ اسلامیہ
عثمان گنج، ضلع سیہور
سابق بھوپال اسٹیٹ
مدھیہ پردیش۔ انڈیا۔

"یہ کہاں سے ملا۔ رام نندن ؟" میں نے پوچھا۔
"بٹیا۔ ادسارے سے یہ ڈھیر سارے پتے بٹور کر لایا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔
جیپ آگے بڑھی۔ وادی میں پہنچتے پہنچتے کہرے کے ایک ریلے نے آلیا اور بلوچستان کی برف پوش کوہستانی خانقاہ، خانہ بدوشوں کے سردار کے زرّیں خیمے اورالغوزے کی موسیقی اس کہرے میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

مجھے بیحد ندامت ہوئی کہ میں نے انجانے میں کسی کا خط کیوں پڑھ لیا۔ لیکن ـــــ محمودہ بنت مولوی عبدالصمد ـــــ تم کو اس پیہم خود فریبی، اس فرار مسلسل سے کیا حاصل ہوا ؟ کچھ تو بتاؤ۔

میں نے خط لفافے میں رکھ کر ڈرائیور سے کہا کہ کرنل مورگن کے بنگلے کی طرف سے ہوتا چلے۔ اور اندر جا کر خط فریزر ریسم صاحب کو دے دے۔ جو وہ جلدی میں گاؤں کے جھونپڑے میں چھوڑ آئی تھیں۔
لیکن کرنل مورگن کا بنگلہ خاموش پڑا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریلوے اسٹیشن گئے ہیں۔
میں نے گھر کے راستے میں شوٹنگ کے متعلق فائل سمیٹا لیکن ایک ڈوپ شیٹ کے

نیچے سے چند اور کاغذ نکلے۔ ایک کاغذ پر بہت سے درخت بنے تھے۔ ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت۔ ایک بڑا درخت —— ایک اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بنی تھیں۔ پانچ چھ مرتبہ دہرایا گیا تھا میں کہاں کہاں سے گذر گئی —— میں کہاں کہاں سے ——

اور اس کے بعد ایک کونے میں لکھا تھا ——

شاید کہ چمن مہکا، شاید کہ بہار آئی
دنیا کی وہی رونق ، دل کی وہی تنہائی

"مسٹر ہربرٹ کنگھم کیسے ہیں؟" گھر پہنچتے ہی میں نے زرینہ سے دریافت کیا جو تھکی ماندی اپنی مسہری پر لیٹی تھی۔

"ہربرٹ کا آپریشن ——" زرینہ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔ "اپنڈی سائیٹس کا نہیں تھا۔"

رات کو ہم لوگ ابھی کھانے کی میز پر ہی تھے کہ ہرکارے نے میرے نام تار لا کر دیا۔
"ریفرنس آپ کا تار۔ اگر یہ صورت ہے تو ڈڈ کو منٹری کینسل کر دیجئے اور واپس آجائیے۔"
"ونڈرفل۔" زرینہ نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے چند روز یہاں رہو۔ چھٹی لے کر کیا خیال ہے؟"

اسی وقت ملازم نے اناؤنس کیا۔ "مک فرسن صاحب میم صاحب۔"
میلکم اور سنتھیا مک فرسن کمرے میں داخل ہوئے۔ میلکم کا چہرہ ستا ہوا تھا۔
"ہربرٹ کا انتقال ہوگیا۔ ڈھاکہ ہاسپٹل سے تار آیا ہے۔" انھوں نے تار ارسلان بھائی کی پلیٹ کے نزدیک سرکا دیا۔

اس رات نیم تاریک ڈرائنگ روم کے آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں میلکم نے اس طرح بات کی جیسے ساری زندگی کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوں۔

"کاش چارلس فریزر صاحب صرف ایک گھنٹہ دیر سے آتا" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

"یا اینگس اور نورا اپنا بنگلہ ریٹا فریزر کے حوالے کرکے ڈھاکے نہ چلے جاتے" مسٹر مک فرسن بولے۔

"مگر ریٹا فریزر تو کرنل مورگن کے یہاں ٹھہری تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر ایڈیتھ مورگن کی ریٹا سے پہلے روز سے نہیں بنی۔ دراصل کرنل کی دوستی چارلس فریزر سے جنگ کے زمانے سے تھی اور وہ محض کرنل سے ملنے کے لئے ہی ڈھاکے سے یہاں آیا تھا" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

"چارلس کینیڈین ہے اور ہر کینیڈین اور امریکن کی مانند اسے بھی 'لوکل کلر' دیکھنے کا خبط ہے۔ وہ اپنے ایک اور پرانے دوست بل مک گریگر سے ملنے چاند پور بگان گیا اور وہاں سے شام کو ہی واپس آگیا کیوں کہ بل کو کسی ضروری کام سے چٹاگانگ جانا تھا۔ جب چارلس واپس آیا تو کرنل مورگن نے اس سے کہا کہ وہ اسے نواب صاحب یتیم پاشا سے ملانے لے جائیں گے۔ جو آسام کے مغل عہد کے نوابین کی آخری یادگار ہیں۔ یتیم پاشا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چارلس اور کرنل کے وہاں پہنچنے پر نواب صاحب نے فوراً پروگرام بنایا کہ وہ مہمانوں کو شکار کھلانے سندربن لے جائیں گے۔ چنانچہ چارلس نے ریٹا کو یہاں فون پر اطلاع دی کہ وہ کئی روز کے لئے سندربن جا رہا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے پائپ منہ سے نکال کر راکھ دانی پر کھٹ کھٹایا اور اپنے چارخانہ ٹوئیڈ کے کوٹ میں سے ماچس ڈھونڈ کر نکالی۔ نیا تمباکو بھر کے پائپ جلایا اور چند لمحوں تک شعلوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ تھے۔

"بیچارہ ہربرٹ کننگھم ـــــ" میلکم مک فرسن نے مجھے مخاطب کر کے دوبارہ بات شروع کی۔
"ایک نوجوان انگریز پلانٹر تھا اور حال ہی میں یہاں آیا تھا۔ وہ ایک بڑا جذباتی اور بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ ٹی اسٹیٹ پر اس کی ہم دونوں سے بیحد دوستی ہوگئی اور میں اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگا۔" میلکم نے بہت آہستہ سے اپنی بھووں پر ہاتھ پھیرا۔ "ہربرٹ بہت خوش شکل اور بہت دل پھینک لاابالی قسم کا بیچلر تھا۔
"تم کو یاد ہے زرینہ، چند روز ہوئے ہم دونوں تمھیں کرنل کے یہاں ڈنر پر مدعو کرنے آئے تھے؟ اسی رات ہربرٹ کی ملاقات ریٹا سے ہوئی۔
"شام کو شراب کا دور چلا۔ ایڈتھ مورگن اپنی الکحل آسانی سے نہیں سہار سکتیں۔ اس رات ان پر دورہ سا پڑ گیا اور انھوں نے اچانک ریٹا فریزر کو طعنے دینے شروع کئے۔ جواباً ریٹا نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ ریٹا ڈرائنگ روم سے غائب تھی۔ اور جب دوبارہ نظر دوڑائی تو ہربرٹ کو بھی موجود نہ پایا۔
"اب سارے مہمانوں پر نشہ چڑھ چکا تھا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اسکاٹ لوگ بوتل پر عاشق ہیں اور بڑے بڑے پیگڑوں کو میز کے نیچے پہنچا دیں۔ مگر اس رات تو ریٹا کی وجہ سے عجب ہلڑ مچ رہا تھا۔"
"رات بھیگ چلی تو میں نے میلکم سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ کیوں کہ میں اسکاٹ تو ہوں مگر ایک کٹر مذہبی پریسبی ٹیرین پادری کی بیٹی بھی ہوں اور مجھے اس طرح کی بے تحاشا مے نوشی سے دہشت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اور میلکم کرنل اور ایڈتھ کو شب بخیر کہہ کر باہر آگئے تو کیا دیکھا کہ برآمدے کے نیچے باقاعدہ فوجداری ہو رہی ہے ـــــ" سنتھیا مک فرسن نے اپنے شوہر کی بات مکمل کی۔
"ارے ـــ" ارسلان بھائی نے استعجاب سے کہا۔
"وہاں ریٹا تو نشے میں مسرور نزدیک کھڑی قہقہہ لگا رہی تھی اور چارلس فریزر

اور بے چارہ ہربرٹ ایک دوسرے کی ٹھکائی میں مصروف تھے۔ اسی وقت سارے مسرور مہمان باہر نکل آئے مگر کسی نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش نہ کی اور اس منظر سے محظوظ ہوتے رہے۔

"اتنے میں ریٹا نے بے چارے ہربرٹ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تو چارلس نے آگ بگولہ ہو کر اسے دھکا دیا اور وہ دور جا پڑی اور اس کی پیشانی میں چوٹ آگئی۔

"دوسری صبح سویرے چارلس کرنل کے چھوٹے طیارے کے ذریعے چاند پور بگان روانہ ہو گیا۔ لیکن شام کو ہی واپس آن پہنچا۔ دوسرے دن کرنل اور چارلس نواب صاحب یتیم پاشا کے ساتھ سندربن چلے گئے۔

"تم جانتی ہو زرینہ بوڑھے اینگس اور نورا ڈنکن کتنے شفیق اور پیارے لوگ ہیں۔ وہ دونوں اس رات دعوت نہیں آئے تھے کیوں کہ اینگس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ صبح کو چارلس اور کرنل کے چاند پور بگان چلے جانے کے بعد ایڈتھ ڈنکنز کے گھر گئیں۔ ان کو مختصراً رات کا واقعہ سنایا اور نورا سے کہا کہ انھیں اعصاب کی شکایت ہے اور وہ تنہا ریٹا کی حسب دلخواہ میزبانی نہ کر سکیں گی اور ڈنکنز سے مشورہ طلب کیا۔

"اب یہ بڑی آکورڈ صورت حال تھی۔ کیونکہ پچھلی رات نشے کی حالت میں ایڈتھ بھی ریٹا کو جلی کٹی سنا چکی تھیں اور مار پیٹ اور جھگڑے کے بعد صبح صبح چارلس اسی طیش کے عالم میں ریٹا کو ہمراہ لئے بغیر اپنی سیاحت اور شکار کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ اب یہ ایڈتھ کہہ رہی تھیں کہ ان کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔"

جس وقت میلکم مک فرسن بات کر رہے تھے مجھے دفعتاً خیال آیا کہ راحت عرف ریٹا ان عورتوں میں سے ہے جسے دوسری عورتیں بے طرح ناپسند کرتی ہیں اور مرد جن پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے ہیں —— زرینہ کے قصّے کے مطابق ڈھاکے کی مسز وارنگٹن کے اعصاب بھی خراب ہو گئے تھے۔

میلکم نے بات جاری رکھی۔ "چنانچہ فرشتہ خصال نورا ڈنکن نے کہا کہ وہ دوسرے دن

اینگس کے میڈیکل چیک اپ کے لئے ڈھاکے جارہی ہیں ۔ اس دوران میں چارلس فریزر کی سُندر بن سے واپسی کے وقت تک ریٹا یقیناً ان کے بنگلے پر قیام کرسکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اینگس اور نورا خود ایڈتھ کے یہاں گئے اور ریٹا کو اپنے یہاں قیام کرنے کے لئے مدعو کیا اور کہا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے ملازمین ریٹا کا پورا خیال رکھیں گے ۔ ریٹا بہت خوش ہوئی اور بولی کہ اسے فوٹوگرافی کا خبط ہے اور ان کا خوش منظر بنگلہ اور سامنے کی سینری اس کے اس شوق کے لئے آئیڈیل ثابت ہوگی۔ چنانچہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں منتقل ہوگئی اور اس کے نئے میزبان ڈھاکہ روانہ ہو گئے ۔

" اور اب یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ خواتین کی صبح گیارہ بجے کی ماہ جونگ اور کافی پارٹیوں کی گریپ وائن کے ذریعے یہ سارا قصہ کم از کم ایک سو میل کے ریڈیس میں بخیر وخوبی پھیل گیا" سنتھیا مک فرسن نے کہا ۔" تم لوگ اس فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت مصروف تھیں۔ اس لئے تم تک یہ بات نہ پہنچ سکی ۔ تین چار روز ہوئے میں نے مسز مک ڈانلڈ کی کافی پارٹی میں مسز مک گریگر کو یہ بھی کہتے سنا کہ ریٹا فریزر امریکن نہیں بلکہ دراصل کیل کٹا اینگلو انڈین ہے —— اور ایڈتھ نے جو تحقیر آمیز رویہ ریٹا کے ساتھ اختیار کیا اس کی ایک وجہ دراصل یہ بھی تھی کہ ایڈتھ کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی گلیمرس مہمان ہاف کاسٹ ہے ۔"

" اس پچھلے آٹھ دن میں ہربرٹ مجھ سے فیکٹری میں روزانہ ملتا تھا" میلکم نے کہا ۔" اور ریٹا کے لئے دیوانہ ہوچکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ وقتی ہیجان ہے اور چارلس کی واپسی پر یہ سارا قصہ آپ سے آپ ختم ہوجائے گا۔ چارلس فریزر کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک بیحد حساس اور زخمی شیر کی مانند بپھر جانے والا انسان ہے اور ریٹا کو بے طرح چاہتا ہے ۔"

" چارلس کام کیا کرتا ہے ؟" ارسلان بھائی نے میلکم کی بات کاٹ کر دریافت کیا ۔

" کولمبو میں حکومت سیلون کے لئے کسی نوع کا ایڈوائزر ہے۔ بمبئی میں ریٹا سے ملاقات ہوئی ۔ اب کینیڈا واپس جانے سے قبل سارے برصغیر کی سیر کرنے نکلا ہے ۔ سلہٹ وہ اپنے پرانے فوجی ساتھی کرنل مورگن سے ملنے آیا تھا ۔"

"تم نے ہربرٹ کو سمجھایا نہیں؟" ارسلان بھائی نے پوچھا۔

"سمجھایا۔ مگر اس پر عشق کا جنون سوار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے زندگی بھر ایسی مکمل عورت نہیں دیکھی —— ایسی عورت جس کے لئے TOTAL WOMAN کی اصطلاح رائج ہے۔"

"مکمل عورت" قاسم نے بھی صنوبر کو چھوڑتے وقت فرحت کے لئے یہی کہا تھا۔

"اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بچارے ہربرٹ نے یہ سارا ہفتہ پہاڑی والے بنگلے پر گذارا۔" میلکم مک فرسن نے کہا۔

ارسلان بھائی نے آتش دان کی آگ تیز کی۔

"آج صبح —" میلکم مک فرسن نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ریٹا بہت سویرے ہی اٹھ گئی تھی۔ رات اس نے نورا ڈنکن کی آیا سے کہا تھا کہ وہ علی الصبح تصویر کھینچنے کے لئے باہر جائے گی۔ چنانچہ اس نے صبح اٹھ کر جلدی سے بریک فاسٹ کیا اور اینگس ڈنکن کی جیپ لے کر کھاسی گاؤں کی طرف نکل گئی۔

"اور آج ہی صبح منہ اندھیرے چارلس اور کرنل سندربن سے واپس آن پہنچے۔ گھر پر ایڈتھ نے بتایا کہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں اٹھ گئی ہے لہذا چارلس سیدھا پہاڑی والے بنگلے پر پہنچا۔

"اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ ملازم ابھی شاگرد پیشے ہی میں تھے صرف نورا کی آیا بنگلے پر موجود تھی۔ وہ چارلس کو پہچانتی نہیں تھی۔ چارلس نے اس سے پوچھا کہ ریٹا میم صاحب کا بیڈ روم کدھر ہے؟ آیا نے گھبرا کر مہمان کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ چارلس سیدھا ریٹا کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہاں بے چارہ ہربرٹ سو رہا تھا۔

"وہی بندوق جسے چارلس فریزر شکار کے لئے سندربن لے گیا تھا اس کے کندھے سے آویزاں تھی ——"

"لیکن عدالت میں وہ بیان دے سکتا ہے کہ سندربن سے یہاں تک کی پرواز کے دوران وہ تکان دور کرنے کے لئے متواتر شراب پیتا رہا تھا اور اس کے ہوش و حواس قائم نہ تھے۔

اس کے بہت سے دوست اور شناسا یہی گواہی دیں گے کہ وہ بے انتہا پیتا ہے۔ بلکہ عادی شرابی ہے" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

"جس وقت آج صبح صبح مجھے ڈاکٹر سعید نے فون کیا کہ ہربرٹ کا فوری آپریشن کرنا ہے"۔

"مگر کسی نے ریٹا فریزر کو کیوں نہیں تلاش کیا؟" میں نے زرینہ کی بات کاٹی۔

"اوّل تو یہاں جنگلوں میں کسی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسرے میرے خیال میں مناسب یہی تھا کہ مسز فریزر موقع واردات پر نمودار نہ ہوں"۔ میلکم نے جواب دیا۔

"اُفوہ۔ کیا قیامت کا دن گذرا ہے"۔ زرینہ نے کہا۔

"اور کمال ملاحظہ ہو۔ میں ارسلان کو اطلاع دینے کے لئے یہاں آیا تو عین اس وقت آپ کا چپراسی یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ آپ نے مسز فریزر کے لئے بندوق منگوائی ہے۔ میرے تو یقین جانو ایک لمحے کے لئے چھکے چھوٹ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں 'ایلس ان ونڈرلینڈ' والی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بہرحال معلوم ہوا کہ تم ریٹا فریزر کو فلمی ہیروئن بنائے ڈال رہی ہو۔ اور اس طرح یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں ہیں۔

"چارلس اور ریٹا دو پولیس افسروں کی معیّت میں رات کی ٹرین سے ڈھاکے روانہ کئے جا چکے ہیں۔ میں ڈھاکے میں مقیم ڈپٹی ہائی کمشنر کو فون کر چکا ہوں۔ خدا سب پر رحم کرے"۔ میلکم نے بات ختم کی۔

"اب راحت ـــــ آئی مین ـــــ ریٹا کا کیا ہوگا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"ابھی چارلس اور ریٹا کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غالباً قانونی لحاظ سے ریٹا کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں"۔

زرینہ نے سر صوفے کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ارسلان۔ وہ تار مجھے دینا"۔ میلکم نے کہا۔ ارسلان بھائی نے تار اٹھا کر دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہربرٹ کے والدین کو کیا لکھوں۔ وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔"
میلکم مک فرسن کہہ رہے تھے۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخیں۔ ہلکی سبز دیوار پر روشن ڈائل نے
رات کا ڈیڑھ بجایا۔
میلکم نے رومال سے اپنی نم پلکیں خشک کیں اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ میاں بیوی
کو رخصت کرنے کے لیے برآمدے میں نکلے۔ چاروں طرف چائے کے باغات اور بانس کے جھرمٹوں
پر کہرہ چھایا ہوا تھا۔ چند منٹ تک ہم پانچوں ڈوبتے چاند کی بہت مدھم چاندنی میں چپ چاپ
کھڑے رات کی آوازوں کو سنتے رہے۔ میلکم اور سنتھیا مک فرسن شب بخیر کہہ کر کار میں بیٹھے اور
اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

جس روز میں چا بگان سے واپس جا رہی تھی زرینہ نے راستے میں ارسلان بھائی
سے دفعتاً پوچھا "ارسلان ایک بات بتائیے۔ مکمل عورت کیسی ہوتی ہے TOTAL WOMAN
"معلوم نہیں ——" انھوں نے جواب دیا۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان
سے اتر کر کچی سیدھی سڑک پر آگئی۔
شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مزدور عورتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی سمت
لوٹ رہی تھیں۔ گاؤں میں دیے جلنے لگے۔
اچانک ایک موڑ پر پاروتی کی زرد ساری کی جھلک دکھائی دی۔ کار دیکھ کر وہ ٹھٹھکی
اور بندگی کے لئے ہاتھ جوڑے۔ پھر وہ چائے کی خالی ٹوکری کمرے باندھے تیز تیز قدم رکھتی "روپی
ٹری" کے جھرمٹ میں غائب ہوگئی۔
—— سانجھ بھئی اور دیا جرے
سرخ پھولوں سے دہکتے ہوئے گھنے درختوں کی پتیاں سرسرائیں۔

"___ پیا نہ آئے پاس ___" پپیہے نے کہا۔

"آج رام نندن کہہ رہا تھا کہ پاربتی کا گونا ہونے والا ہے۔ برادری نے فیصلہ کر دیا" زرینہ نے کہا۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں "دو پتیوں اور ایک کلی" کی جھاڑیوں سے سرک کر ___

"___ نینن سے دو گنگ بہیں ___" کوئل نے کہا۔

اندھیرے میں جا گریں۔

"___ ڈوبن لاگی آس ___" پپیہے نے کہا۔

نشیب میں ندی کے کنارے دھندلکا پھیل چکا تھا۔ لالہ رنگ افق پر دھواں اٹھ رہا تھا۔

"___ ندی کنارے دھواں اٹھت ہے۔ میں جانوں کچھ ہوئے
جا کارن جوگن بھئی، وہی نہ جلتا ہوئے"

زرینہ نے کہا۔

اونچی نیچی سڑک پر دھول اڑاتے ہوئے ہم تینوں خاموشی سے سری منگل کی طرف بڑھتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف ٹیلوں پر سندھیا مالتی کھلی تھی جو شام پڑے مہکتی ہے مگر ویرانے میں اس کا قدرداں کوئی نہیں۔ دفعتاً میں نے زرینہ سے پوچھا "زرینہ بی بی ___ راحت اور واجد، صنوبر اور قاسم اور فرحت کے متعلق تو معلوم ہو گیا لیکن شمشاد کا کیا ہوا۔ وہ اب کہاں ہے۔ وہ جس کی وجہ سے کہانی شروع ہوئی۔"

"کہانی شروع ہونے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی۔ بی بی۔ اور نہ اس کے خاتمے کی کوئی ایک وجہ ہے۔" زرینہ نے کہا۔

"یہ درست ہے زرینہ بی بی۔ تمھارا فرمانا میرے سر آنکھوں پہ۔ پھر بھی اس شمشاد کا

بقول شخصے 'کیا بنا ؟'"

" مرزا شمشاد علی بیگ —" زرینہ نے ایک کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔" اب ٹی اسٹیشن پر ریسرچ ڈائرکٹر ہے۔ داڑھی رکھ لی ہے۔ جماعت اسلامی کا معتقد ہے۔ اپنی موجودہ بیوی کو، جو اس کی خالہ کی لڑکی ہے، پردہ کرواتا ہے۔ اسٹیشن پر جب امکاونٹ کاسیلوں کی ٹولیاں یا دورے پر آنے والے سرکاری افسر آن کر اترتے ہیں تو وہ اکثر ان کو اپنی جیپ میں لفٹ دیتا ہے۔ چار بگان کی دنیا سے ان کو دور سے متعارف کرا دیتا ہے اور داڑھی کے اندر ہنستا رہتا ہے۔ اکثر دورانِ گفتگو میں تبلیغ اسلام بھی کرتا ہے۔"

ارسلان بھائی خاموشی سے کار چلانے میں مصروف رہے۔ اب دور سے سری منگل کے ڈاک بنگلے کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ہم تاریک رات میں اسٹیشن کی جانب رواں رہے۔ آم کے درختوں میں سے ٹی ریسرچ اسٹیشن اور اس کے بنگلوں کی روشنیوں کی جھلک دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے جس کے سنسان پلیٹ فارم کے مختصر سے برآمدے میں ایک اکیلا مسافر اکڑوں بیٹھا اخبار کے کاغذ جلا جلا کر آگ تاپ رہا تھا۔

ٹرین حسبِ معمول ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ پٹریوں کے قریب کار ٹھہرا کر ہم انتظار میں مصروف ہو گئے۔

" زرینہ بی بی۔" میں نے دور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھ کر اور سردی سے کانپ کر کہا —" اگر تم کو ٹروتھ سیرم (TRUTH SERUM) کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کا سلہٹ لیٹر لکھ کر آئینے کو بھیجو گی ؟"

" بی بی۔" زرینہ نے سوں سوں کر کے جواب دیا۔" اگر تم کو ٹروتھ سیرم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کی ڈوکومنٹری بناؤ گی ؟"

کہرہ گہرا ہو گیا۔ ارسلان بھائی نے سگریٹ جلایا تو لائٹر کی روشنی زور سے چمکی۔ کچھ دیر بعد زرینہ نے سر ہلا کر ذرا شرماتے ہوئے کہا۔" بی بی۔ ایک سوال مجھے عرصے سے پریشان کر رہا ہے۔"

"فرماؤ ــــ"

"خدا نے یہ دنیا کیوں بنائی ــــ؟"

"ایں ــــ؟"

"ہاں ــــ کیوں ــــ آخر کیوں ــــ؟ مجھے اس کی کوئی ایک وجہ بتاؤ۔"

ارسلان بھائی نے ادھ جلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور دوسرا سگریٹ جلایا۔

"یہاں تین سال تنہائی میں زندگی گذارنے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کا موقعہ مل گیا جو میں ڈاکٹری کے چکر کی وجہ سے پہلے کبھی پڑھ نہ سکی تھی۔ اور بی بی۔ میں نے بہت پڑھ ڈالا مختلف فلسفے اور مختلف مذاہب، ہندو مت اور بدھ مت اور اسلام اور تصوف اور کیتھولی سی زم۔ مگر اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذات مطلق نے دنیا بنائی ہی کیوں۔ یہ لیلا کس لئے رچائی آخر؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ بھی دراصل ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے۔ یہ نروان وغیرہ سب اسی کا نتیجہ تھا۔ اور اگر ــــ" اس کھنکھارتے ہوئے بات جاری رکھی "اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کرلو ــــ"

"ہاں۔ اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کرلو" میں نے دہرایا۔

"کہ آپ سے آپ ارتقا ہوگیا ــــ تو ارتقا بھی کیوں ہوا بھائی؟ کوئی تک تھی؟ وجہ تھی؟"

دور سے گڑگڑاتی، کہرے کو چیرتی ٹرین اسٹیشن پر آ پہنچی۔ میں نے اٹیچی کیس سنبھالا۔ قلی نے ڈکی سے اسباب نکالا۔ میں ٹرین میں سوار ہوئی۔ ارسلان بھائی نے گارڈ سے بات کی۔ ڈبہ خالی پڑا تھا۔ "چٹخنیاں اندر سے اچھی طرح چڑھا لینا" ارسلان بھائی نے فکر کے ساتھ کہا۔ میں نے ایک بار پھر خوابیدہ سلہٹ کو خدا حافظ کہا۔ میری پیاری کزن زرینہ اور ارسلان بھائی خاموش پلیٹ فارم پر دھندلکے میں دو پرچھائیوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

ٹرین نے سپاری اور کیلے کے جھرمٹوں میں دوڑنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات جو مہا کالی، مادر فطرت، وقت کی راجدھانی ہے، ایک ریلوے کراسنگ کے نزدیک چھوٹے سے کالی مندر میں چراغ جل رہا تھا۔ تالاب کے کنارے ایک درگاہ میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ تالاب پر کائی پھیلی تھی اور کنول کھلے تھے۔

'ست، چت اور آنند' جو مایا میں اس طرح پوشیدہ ہیں جیسے تالاب پر کائی جم جاتی ہے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر آنکھیں بند کر لیں اور مجھے بہت سے، ہمیشہ یاد رہ جانے والے منظر یاد آئے۔

شاہ جلالؒ کی درگاہ کا حوض۔

ایک بوڑھی ہندو عورت جو حوض کی منڈیر پر جھکی سیاہ پانی میں سرخ متبرک مچھلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

بانس کے ڈبوں میں چار کے بیچ کے کیڑے جمع کرتے ہوئے بچے۔ بانس کے پلوں پر سے گذرتے چھتریاں لگائے، دوری سے لٹکی تیل کی بوتلیں سنبھالے کسان بید کے پودے۔ پلاش اور بیل کے جنگل۔ بھٹیا گانے والوں کی آواز۔ ایک چھوٹا سا کالا بچہ، جسے اس کا باپ بڑی احتیاط، بڑے لاڈ سے ایک تالاب میں نہلا رہا تھا۔

راج شاہی کے دور افتادہ گاؤں کے چارخانوں میں بیٹھے سنجیدگی سے اخبار پڑھتے ہوئے داڑھی والے کسان، الاؤ کے گرد جاگ گان کی محفل۔ نورالعباد کی کوٹھری میں جلتا ہوا دیا۔

روشن لالٹینیں ہاتھ میں لٹکائے ہاٹ کی سمت آتے ہوئے کسانوں کی ٹولیاں۔ نیلی عنابی، اودی تہمدیں، نیلی، عنابی، اودی ساریاں۔ سفید دھوتیاں، کُم کُم کے بڑے بڑے روشن ٹیکے، کاجل سے بھری آنکھیں، بھوک سے پچکے پیٹ۔ ذوتارا بجاتے ہوئے باؤل اور اس کے بعد۔۔۔ واجد اور ریٹا فریزر، غفورالرحمٰن میاں اور پاربتی۔

آدھی رات کے سناٹے میں انہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سری رام کرشن کے ایک عزیز چیلے، غالباً ویویکانند نے بیلور مٹھ میں مہا کالی کے چرنوں میں پھول چڑھا کر دنیا تیاگتے ہوئے کہا تھا:

راج راجیشوری، بھونیشوری، سدھیشوری اپنی تقدیس اور اپنی ناپاکی، اپنا دھرم اور اپنا ادھرم، اپنی ودّیا اور اپنی اودّیا، اپنے پاپ اور اپنے پن، اپنا خیر اور اپنا شر اپنی نیکی اور اپنی بدی، سب لے لو اور مجھے خالص بھگتی دے دو۔

اور میری کزن زرینہ نے تھوڑی دیر ہوئی سوال کیا تھا: "خالص بھگتی میں بھی کیا مل جائے گا؟"

ہلتی جلتی، چرخ چوں کرتی ٹرین اتھاہ رات کے سمندر میں سے گذرتی ڈھاکے کی طرف رواں رہی۔

دنیا میری سمجھ میں نہیں آئی۔

۱۹۶۴ء

اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو
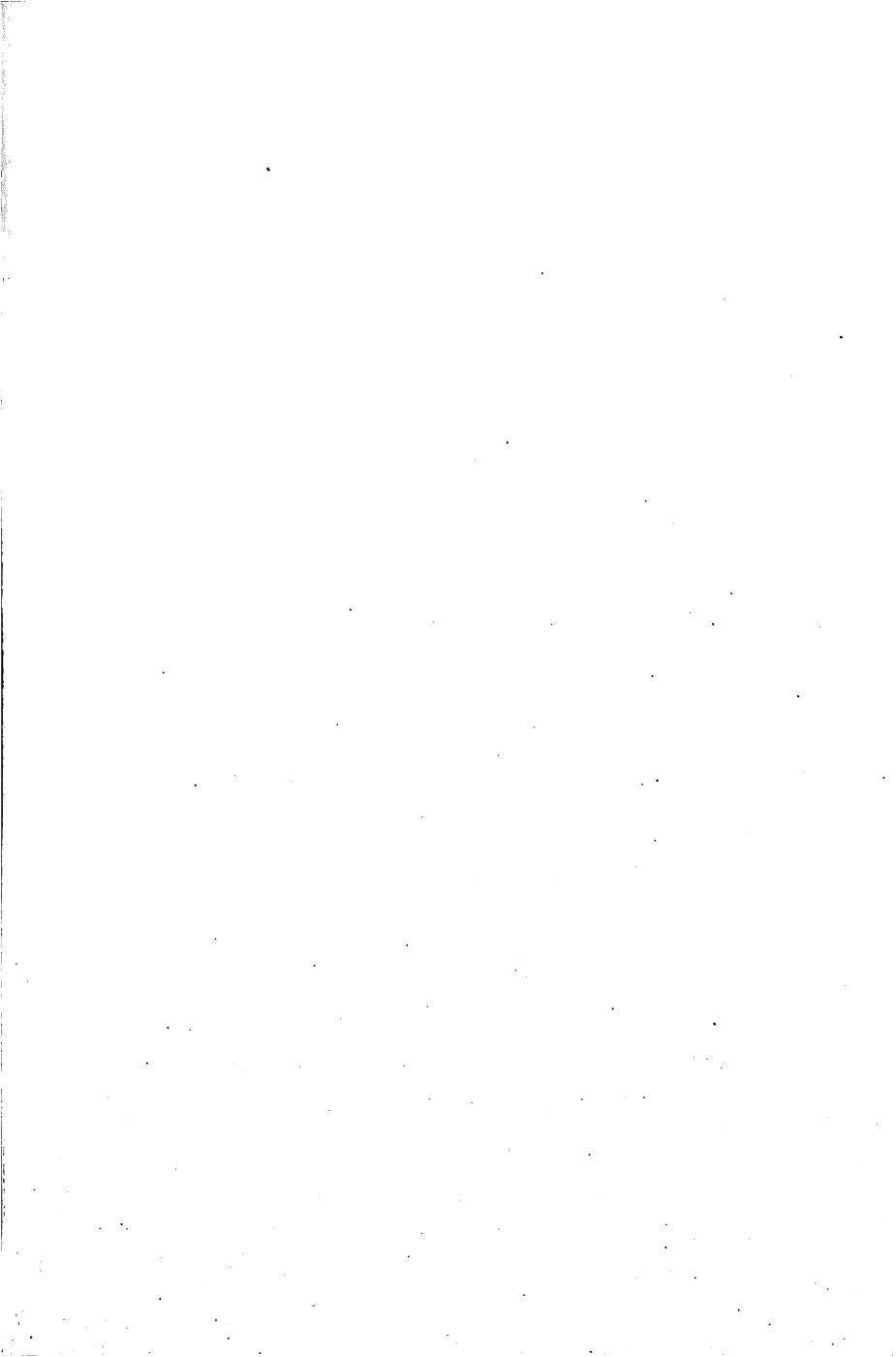
لگا کے کاجل چلے گوسائیں — بھورے قوال کی فلک شگاف تان سے چراغ کی لو بھی تھرا گئی۔ ارے لگا کے کاجل چلے گوسئیاں — بھورے خاں کے دس سالہ صاحبزادے شدّو اپنی باریک آواز میں نغمہ سرا ہوئے۔ لہے لگا کے کاجل چلے گوسئیاں — چاروں فاقہ زدہ ساتھی تالیاں بجا بجا کر دہرانے لگے۔ بھورے خاں ہارمونیم پر سر نہوڑائے تیز تیز انگلیاں چلایا کئے۔ پھر سر اٹھا کر اوپر روشن آسمان کو دیکھا جس پر بارہویں شب کا چاند جگمگا رہا تھا۔ آسمان صحرائے شام کا وہ سیاہ پوش راہب ہے جو اپنی خانقاہ کی محراب میں قندیل جلائے رکھتا ہے لیکن مسافروں کو راستہ نہیں ملتا۔

چلے گوسائیں — چلے — شب معراج کا بیان۔ اور بھورے خاں کا لاثانی فن۔ ہنڈے شاہ کا بارونق عرس۔ سامعین سکتے کے عالم میں مبہوت بیٹھے تھے۔ ایک آدمی قوال پارٹی کے سامنے دھری تیل کی ڈبیا کی لَو اکسانے میں منہمک ہو گیا کیونکہ درگاہ میں آویزاں گیس کا ہنڈہ مدھم پڑ چکا تھا۔ اسی زنگ آلود پیٹرومیکس کی وجہ سے وہ بزرگ ہنڈے شاہ کہلاتے تھے۔ وہ اپنے معتقدین کے مانند ایک مسکین، غیر معروف بزرگ تھے۔ جانے تھے بھی کہ نہیں۔ یہ سب جو ہو رہا ہے یا نہیں۔ یا اُس کی اصل اور بنیاد کیا ہے۔ ہنڈے شاہ غیر موجود ہیں تو موجود کیا ہے اور جو کچھ ہے بس یہی ہے تو غیر موجود کیا ہے۔ اور جو ہے اس کا جواز بھی کوئی بتلائے۔ مزید برآں فن کاروں، ادیبوں شاعروں کی طرح اولیاء بھی اس لحاظ سے بعضے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا جانتی ہے بعضوں

کو چند اللہ کے بندے ہی چراغ جلانے کے لئے میسر آتے ہیں۔ بعضوں کو وہ بھی نہیں۔

پیر ہنڈے شاہ کے غریبا موُ عرس میں آنے والے تیلی، جولاہے، کنجڑے، قصائی، بھڑبھونجے، کاشتکار، کھیت مزدور، جھونپڑوں میں زندگیاں گذار کر کچی قبروں میں دفن ہونگے۔ خدا کے مقبول بندے وہی ہیں۔ جیسے وہ بوڑھی شریفن ــــ بیوہ، لاوارث، مفلس، ان پڑھ۔ جو درگاہ کے پیچھے چبوترے پر نماز عشاء پڑھ رہی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ اکبر ــــ پڑھتی ہوں کلمہ اللہ محمد کا۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ اکبر۔ بسم اللہ رحمٰن رحیم۔ لاالہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر ــــ قیام۔ رکوع۔ قومہ۔ سجدہ۔ قعدہ۔ رکوع۔ قومہ۔ سجدہ۔ قعدہ۔ اس عورت نے جسے نماز پڑھنا نہیں آتی، ساری عمر جب بھی کمر توڑ محنت مزدوری سے مہلت پائی اپنے رب کو اسی طرح یاد کیا۔ اس کی اکلوتی، جوان معصوم مظلوم لڑکی کو اس کے سسرال والوں نے گنڈاسے سے مار کر ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کو کھلا پلا کر مزے سے دندناتے ہیں۔ شریفن گھر گھر جاکر چکی پیستی ہے اور چار آنے روز کماتی ہے۔ سب سے پہلے جنت میں وہی جائے گی۔

اور یہ گمنام بے بضاعت دیہاتی قوال اور یہ ان کے سامعین۔ غیر اہم۔ حقیر۔ عسرت زدہ۔ صابر و شاکر۔ اور عرس کے میلے کے یہ دوکاندار ــــ بچی داڑھیوں والے تہمد پوش، میلے دوپٹوں، چاندی کی بالیوں اور پیوند لگے گھگھروں والی جوان اور بوڑھی عورتیں جو اپنے سامنے ٹاٹ بچھائے بیٹھی ہیں اور ان پر تھوڑی سی کھجوریں، مونگ پھلی کی ذرا ذرا سی ڈھیریاں، ریوڑی، بتاشے، اندرسے، گڑ کی بھیلیاں دھری ہیں اور ایک ایک ٹین کی ڈبیا ٹمٹما رہی ہے۔ یقین جانو اور ایمان لے آؤ۔ کہ اہل بہشت یہی لوگ ہیں۔

ایک سفید ریش بڑے میاں "ہر مال ملے گا چار آنے" کی صدا لگا رہے ہیں۔ ان کی دوکان فیتوں میں ٹنکے بندے، کلپ، ہاروں اور نقلی گھڑیوں پر مشتمل ہے۔ میلے والیاں ہیں کہ اس ڈپارٹمنٹ اسٹور پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں۔

"یہ کلپ کیا بھاؤ دیا ــــ" ایک نوعمر لڑکی جارجٹ کا بوسیدہ سبز دوپٹہ سر سے لپیٹ کر

اکڑوں بیٹھ جاتی ہے۔

"ہر مال ملے گا چار آنے ــــ بٹیا۔"

لڑکی دوپٹے کے کونے کی گرہ کھول کر چونّی نکالتی ہے۔ پھر ایک ہار کو للچائی نظروں سے دیکھتی ہے۔ انٹی میں فقط چار آنے باقی ہیں۔ ابھی جمیلن کے لئے بھی کچھ خریدنا ہے۔

"اچھا ایک کلپ اور دے دو ــــ وہ لال والا۔ ہماری چھوٹی بہن کے لئے ــــ" لڑکی نے زرد "کیلے" کی قمیص اور نیلے ساٹن کی شلوار پہن رکھی تھی۔ کلائیوں میں ہری "ریشمیں" چوڑیاں۔

"رشکِ قمر ــــ او رشکِ قمر ــــ" بھیڑ میں سے آواز آتی ہے۔

"جانو تمہری مہتاری گھراوت ہیں۔" ایک عورت ٹھوکا دے کر اس سے کہتی ہے۔ وہ درگاہ کی طرف بھاگتی ہے۔ جہاں بھورے خاں کا پروگرام ختم ہو چکا ہے۔ اب "امرتی جلیبی" اور "کانڑے بھانڈ" کا نمبر ہے۔

لڑکی دوڑتی ہوئی چبوترے کی سمت آتی ہے۔ جہاں ایک یک چشم مسخرہ پھندنے کی ترکی ٹوپی اور سرخ واسکٹ اور سلیپنگ سوٹ کا نیلا دھاری دار پاجامہ پہنے ایک مختصر سا ہارمونیم سنبھال چکا ہے۔ ایک مدقوق عورت دھسّے شال میں لپٹی ڈھولک اپنے آگے سرکاتی ہے۔ ایک کمسن بچی قریب بیٹھی مجمع کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ مدقوق عورت اسے ایک تھپڑ رسید کرتی ہے۔ "اری بدذات ادھر کیا بیٹھی ہے تھوا کی تھوا۔ سامنے آ کر بیٹھ۔"

"خالہ ہمیں اٹھاؤ تو" ــــ بچی نرمی سے کہتی ہے۔

"سات فاقوں پر بھی وزن ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مرنے جوگی کا ــــ" مدقوق عورت بڑبڑاتی ہے۔ اتنی دیر میں نیلی شلوار، ہرے دوپٹے والی لڑکی چبوترے پر پہنچ جاتی ہے۔

"بجیا ــــ" بچی اس کی طرف باہیں پھیلاتی ہے۔ بڑی لڑکی اسے گود میں اٹھا کر ہارمونیم کے سامنے بٹھال دیتی ہے۔ بچی اپنی خشک ٹہنی ایسی ٹانگ کو احتیاط سے اپنے منے سے غرارے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اب یک چشم مسخرہ سر ترچھا کر کے ہارمونیم پر تیز تیز انگلیاں چلاتا

ہے۔ بڑی لڑکی کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگاتی ہے۔

"چلو —— چلو امرتی جلیبی گاوت ہیں" مجمع میں بھنبھناہٹ۔

بڑی لڑکی نے گانا شروع کر دیا ہے "سفر ہے دشوار —— سفر ہے دشوار —— خواب کب تک

—— بہت بڑی منزل عدم ہے"

لنگڑی بچی مصرع ثانی اٹھاتی ہے —— "نسیم جاگو —— نسیم جاگو —— کمر کو باندھو

اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے ——" سامعین سر ہلا ہلا کر جھوم رہے ہیں۔

"جوانی و حسن، جاہ و دولت، یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے ——" اپاہج بچی بڑی محنت

سے بڑی بہن کا ساتھ دیتی ہے ——

"اجل ہے استادہ دست بستہ، نوید رخصت ہر ایک دم ہے —— بسان دستِ سوالِ

سائل تہی ہوں ہر ایک مدعا سے ——" بڑی لڑکی خنین قاف سے درست، نہایت سلیقے سے گا رہی

ہے۔

"—— نیاز ہے بے نیازیوں سے، بغل میں دل صورتِ صنم ہے"

"حق اللہ ——" ایک کالا بھجنگ ملنگ نعرہ لگا کر فرش پر لوٹنے لگتا ہے "اللہ ہُو اللہ ——

اللہ ہُو —— اللہ ——"

"مآلِ کارِ جہانِ فانی کبھی نہیں ایک قاعدے پہ —— جو چار دن ہے وفورِ راحت تو بعد

اس کے غم والم ہے ——"

گاؤں کے چودھری حامد علی کے چچا زاد بھائی جو مقدمے بازی میں لٹ پٹ چکے ہیں زور زور

سے فرش پہ ہاتھ مارتے اور روتے ہیں اور چلا چلا کر دہرا رہے ہیں "جو چار دن ہے —— جو چار

دن ہے —— واہ رے اللہ —— واہ —— واہ رے مولا واہ —— دیکھ لی تیری قدرت ——

دیکھ لی ——"

"زبان روکو بہک رہے ہو، سرور دوشینہ جوش پر ہے ——" بڑی لڑکی ان کو مخاطب

کرکے گاتی ہے —— اب چند لوگوں کو حال آرہا ہے —— جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔ معذور بچی کو یک چشم مسخرے نے اپنے کاندھے پر بٹھالیا ہے۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے تال دے کر بہن کی ہمنوائی میں مصروف ہے —— "زبان رو کو بہک رہے ہو —— سرور دو شینہ جوش پہ ہے ——"

"یہ مصرع: بجز مصیبت پسند ہم کو کمال آیا —— نسیم جاگو —— کمر کو باندھو —— اٹھاؤ بستر —— اٹھاؤ بستر —— کہ رات کم ہے ——"

غربت زدہ سامعین اکنیاں دونیاں مدقوق عورت کی طرف پھینکتے ہیں جو وہ اپنا دوپٹہ پھیلا کر اس میں سمیٹتی جا رہی ہے۔

"کھسکے ڈبل —— کھسکے ڈبل ——" بڑی لڑکی رشکِ قمر عرف قمرن عرف امرتی ٹھمکی لگاتی گاؤں کے سفید پوشوں کی طرف جاتی ہے جو اسے چونی اٹھنی دیتے ہیں۔ سب ملا کر ساڑھے نو روپلے بنے۔ رشکِ قمر مایوسی سے پیسوں پر نظر ڈال کر ان کو دوپٹے کی گرہ میں باندھ لیتی ہے۔

مجمع چھٹنے لگتا ہے۔ قمرن کا کنبہ اپنا ساز و سامان سمیٹ کر چبوترے سے اترتا ہے۔ وہ درگاہ کے احاطے سے نکل کر نانبائی کی دوکان کی طرف جاتے ہیں۔ جہاں ان کا زادِ راہ ایک کونے میں رکھا ہے۔ نانبائی بھی اپنی دوکان بڑھانے میں مشغول ہے۔ قمرن ٹین کا چھوٹا سا بکسا کھول کر بڑی احتیاط سے اپنے دونوں کلپ اس میں رکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔

"ٹسوے کیوں بہاتی ہے کم نصیب۔" مدقوق عورت برقعہ سر پر ڈالتے ہوئے اسے جھڑکتی ہے۔ "جمیلن کو اٹھا۔"

"کھانا تو کھالو ——" نانبائی المونیم کے کٹورے میں تھوڑا تھوڑا شوربہ اور چار نان ان کو دیتا ہے۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کے سر جوڑ کر طعامِ شب تناول کرتے ہیں —— نانبائی ان سے پیسے نہیں لیتا۔ اب یک چشم بھانڈ ریلوے قلی کی سی پھرتی سے ٹرنک اور دری میں لپٹا بستر اپنے سر پر دھرتا ہے۔ ہارمونیم کمر سے لٹکاتا ہے۔ عورت ڈھولکی سنبھالتی ہے۔ قمرن گود میں جمیلن کو اٹھا لیتی ہے۔ تینوں سر جھکائے یکّوں کے اڈے کی سمت چل پڑتے ہیں۔ میلے کے بازار میں سے گذرتے

ہوئے ننھی جمیلن سر موڑ موڑ کر للچائی نظروں سے چوڑیوں کی دوکان کو دیکھتی ہے۔ کانڑا کھانڈ چلتے چلتے ایک لمبا سانس لے کر درگاہ کو مخاطب کرتا ہے ــــ "واہ پیر ہنڈے شاہ ــــ بڑی آس مراد لے کر آپ کے دربار میں آئے تھے ــــ ملا کیا ــــ نو روپے سوا چھ آنے ــــ"

(۲)

فرقان منزل کے زنان خانے میں ڈپٹی صاحب آرام کرسی پر بیٹھے آگے کو جھکے ایک ابرو اٹھا کر سر پر خضاب لگا رہے تھے۔ ڈپٹیائن آئینہ لئے سامنے کھڑی تھیں، ڈپٹی صاحب گنگناتے جا رہے تھے اور محوِ آرائشِ جمال تھے۔ دفعتاً انھوں نے کہا "بیوی۔ ہم رشکِ قمر سے متعہ کر لیں؟" ڈپٹیائن نے آئینہ اسٹول پر رکھا اور وصلی کی بیٹھی ایڑیوں والی جوتیاں گھسیٹتی چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ اندر جا کر مسہری پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر باہر دالان میں جھانکا۔ شوہر عینک کا کیس اور سرفراز اخبار سنبھالے سر جھکائے مردانے کی سمت جا رہے تھے۔

ڈپٹیائن نے چبوترے پر نکل کر آواز دی "چھیدو کی بی بی ــــ ذرا قمرن کی خالہ کو تو بھیجنا"

چھیدو کی بی بی چبوترے کے نیچے سے نمودار ہوئیں اور ڈیوڑھی کی طرف چلیں۔

یہ فرقان منزل ڈپٹی صاحب کے پر دادا نے بنوائی تھی جو سنا ہے قندھار کے گورنر تھے۔ ڈپٹی صاحب کے مخالفین کا قول تھا کہ واجد علی شاہ کے اصطبل میں سائیس تھے اب واللہ علم۔ ڈپٹیائن پیٹ بھر کے کنجوس تھیں۔ چبوترے کے نیچے کا تہ خانہ دو دو روپے مہینہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ کرائے دار عورتیں فرقان منزل میں مفت کام کاج کرتیں۔ ان کے لڑکے بالے سودا سلف لاتے۔ مرد فجر کے وقت باہر نکل جاتے، ٹھیلے چلاتے، پتنگیں بناتے یا یوں ہی ادائی توائی پھرتے۔ پھاٹک کے باہر بھی چار کوٹھریاں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں رشکِ قمر کا کنبہ رہتا تھا۔ کانڑے خالو۔ سِٹرن خالہ۔ لنگڑی بہن۔ ہمہ خانہ آفتاب ــــ اللہ توبہ۔ اللہ توبہ!

چھیدو کی بی بی ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں پہنچیں۔ کوٹھری کے باہر کانڑے خالو کسبت کھولے بیٹھے تھے۔ ایک گاہک ان سے اپنا سر گھٹوا رہا تھا۔ اندر دھواں دھار کٹھریا میں قمرن کی خالہ ہرمزی

بیگم چولہا دھونک رہی تھیں۔ نوجوان جمیلن ایک چھلنگے پر پڑی چھت کی سیاہ کڑیاں گن رہی تھی۔ ایک کھونٹی پر ڈھولک ٹنگی تھی۔ چھیدو کی بی بی نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ہانک لگائی "اے قمرن کی خالہ! تم کو ڈپٹیائن یاد فرماتی ہیں۔"

"آ گیا ملگن موت کا بلاوا ــــ" ہرمزی بیگم نے پھنکنی پٹخ کر کہا۔ چند منٹ بعد بکتی جھکتی بڑبڑاتی اندر پہنچیں۔ ڈپٹیائن چبوترے پر ان کی منتظر تھیں۔ جا کر متارسی کھڑی ہو گئیں۔

"آؤ بیٹھو ــــ" ڈپٹیائن نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھ گئیں۔

"قمرن کی خالہ۔ ہم نے تم کو گرہستن سمجھ کر کرائے دار رکھا تھا۔"

"تو کیا ہم گرہستن نہیں ہیں" خالہ نے چمک کر کہا۔

"تمھاری لنگڑی بھانجی پر رحم کھایا"

"شکریہ عنایت"

بہت ہی بد عورت تھی۔

"تم نے ہم سے کہا تمھارا خاوند حجام ہے"

"تو کیا گر اس کٹ ہے"

"ہم سے لوگوں نے آ آ کر کہا آپ نے کن الفتوں کو گھر میں گھسا لیا۔ گلی گلی گاتے بجاتے، مانگتے کھاتے پھرتے تھے"

"آپ سے تو مانگ کر نہیں کھاتے"

ڈپٹیائن تلملا کر رہ گئیں۔ مگر خالہ بسٹرن مشہور تھیں۔ انداز گفتگو یہی تھا۔

"زبان سنبھال بات کرو۔ اتنے جوتے لگواؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے ــــ ٹھیک کہتے ہیں کہنے والے کہ حسین آباد کی خانگیوں کا ٹبر ہے۔ ہم نے یقین نہ کیا۔ حضورؐ کی حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک خود نہ دیکھو کسی پر شک نہ کرو۔ لیکن اب ہم نے خود رشکِ قمر کو برقعہ اوڑھ کر رات

برات باہر جاتے دیکھا ہے۔ اب تم یہاں رہنے جوگی نہیں قمرن کی خالہ ——" اماں اور قمرن کی خالہ کے جھگڑے کی آواز سن کر فرہاد میاں اوپر سے اترے۔ آج یونیورسٹی نہیں گئے تھے، دیر سے سو کر اٹھے تھے۔ زینہ طے کر کے آنکھیں ملتے چبوترے پر آئے۔ جمائی لے کر دریافت کیا "امی جان! کیا رشک قمر کا کوئی مقدمہ پیش ہے؟"

"ارے ہم نے کتنی بھلائی کی ان بے گھروں، ناشکروں کے ساتھ۔ رشک قمر کو اسکول میں ڈالا، تمیز سلیقہ سکھلایا——" ڈپٹیائن نے فریاد کی۔

"امی جان! آپ اب خاموش رہیے۔ ہم آج سارا تیا پانچہ کیے دیتے ہیں۔ قمرن کی خالہ! آپ تشریف لے جائیے اپنی محل سرا...."

"ارے طعنے نہ دو بھیا۔ خدا کے غضب سے ڈرو" خالہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر فرش سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور چبوترے سے اتر کر باہر سٹک لیں۔ فرقان منزل کے شاہ پور آغا ضمیر حسین خان قندھاری متعلم ایم۔ اے۔ (فارسی) کے کان میں اپنے قبلہ و کعبہ کی رشک قمر میں افلاطونی دلچسپی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ غصے اور شرم سے بھنّائے ہوئے چبوترے کی سیڑھیاں اترے۔ رشک قمر عرف قمرن صحن کے ایک گوشے میں ہینڈ پمپ کے تھڑے پر اکڑوں بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔ ریشمی ململ کا بسنتی دوپٹہ نزدیک گل مخمل کے پودوں پر سوکھ رہا تھا۔ تھڑے کی منڈیر پر گیسو دراز ہیر آئل کی بوتل اور صابن دانی میں لکس سوپ رکھا تھا۔ یہ ٹھاٹھ باٹھ کہاں سے ہوتے ہیں۔ رشکِ قمر نے منہ پر چھپکا مار کر سر اٹھایا، اس کی صورت دیکھتے ہی فرہاد میاں کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔

"رشکِ قمر—— منہ ہاتھ دھو لو تو اوپر ذرا ہمارے کمرے میں آنا۔"

"ڈپٹیائن وہ سامنے ہی بیٹھی ہیں۔" رشکِ قمر نے ہنس کر جواب دیا۔ فرہاد صاحب جھینپ کر گلابی ہو گئے۔ واقعی خانگیوں کی اولاد ہے۔ بے حیا۔ آوارہ۔ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"رشکے۔ ہم تمھاری بھلائی چاہتے ہیں۔ یہاں روز تمھاری وجہ سے کوئی نہ کوئی شگوفہ کھل رہا ہے۔ اوپر آؤ۔ بیٹھ کر سوچیں گے تمھارے لیے کیا بندوبست کیا جائے۔"

"بہت اچھا میاں! ابھی آتے ہیں۔ آپ جائیے۔" لڑکی نے اب اسی متانت سے جواب دیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ لک چھپ کر مردانے زینے سے ہوتی، دوسری منزل پر آغا فرہاد کی عملداری میں پہنچ گئیں۔ وہ ایک دروازے پاس کرسی پر بیٹھے دیوانِ فانی کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ دروازہ جس کے نچلے حصے میں سلاخیں لگی تھیں گلی پر کھلتا تھا۔ بڑی سہانی ہوا آرہی تھی۔
"جی۔ فرمائیے۔" رشکِ قمر نے کمرے میں آکر بیباکی سے کہا۔
"قمرن!" فرہاد صاحب نے کتاب کشمیری تپائی پر رکھ کر بات شروع کی۔ "ہم دو سال سے تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ تمھیں یہاں آئے دو سال ہو گئے نا؟ پہلے کوئی شکایت تمھارے خلاف سننے میں نہیں آئی۔ جب تک اسکول جاتی رہیں، کشمیری محلے، امن قائم تھا۔ بھلا تم نے اسکول کیوں چھوڑ دیا؟"
"وہاں کے اوپر چند صاحبزادیوں نے اعتراض کیا تھا۔ ہم نے کہا جاؤ جہنم میں۔ ہم کون سا تمھارے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔"
"رشکِ قمر بیٹھ جاؤ۔"
وہ قالین پر بیٹھنے لگی۔
"نہیں۔ نہیں — یہاں۔"
وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔
"آج ہمیں پورا قصہ بتا دو۔ یہ تم لوگوں نے کیا مسٹری بنا رکھی ہے؟"
"مسٹری کیا —؟"
"راز —"
"ہمارے کیا راز ہوں گے صاحب۔ راز بڑے آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ ہم بہت چھوٹے کمین لوگ ہیں۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ لیکن امی جان سے محلے والیاں طرح طرح کی باتیں جڑ رہی ہیں۔"

"سب سچ کہتی ہیں۔"

"ہیں ؟"

"جی ہاں۔ ہم میں یہی تو ایک خوبی ہے میاں کہ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔"

"تم لوگ جب یہاں آئے تو کہا تھا کہ گاؤں میں کاروبار مندا تھا اس لئے شہر واپس آگئے۔"

"وہ بھی سچ کہا تھا۔ ہم لوگ گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔ خالہ نے کہا۔ جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے تھک گئے۔ اب شہر واپس چلو۔ یہاں کسی نے بتلایا آپ کے شاگرد پیشے میں کرائے کے لئے کوٹھری خالی ہے۔ یہاں آگئے۔ گانا بجانا البتہ چھوڑ دیا، یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ گھر گھر ریڈیو بج رہا ہے۔ خالو اپنا پرانا کام کرنے لگے نائی کا۔ سارے محلّے کی حجامت بناتے ہیں۔ اس میں کون لمبے چوڑے راز کی بات ہے۔"

"اب تمھارا کیا ارادہ ہے رشکِ قمر ــــ شادی نہیں کروگی ؟"

"شادی ــــ ؟"

"کیوں۔ تم کو تعجب کیوں ہوا ؟ قاعدہ ہے جب لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں ان کا بیاہ کر دیا جاتا ہے۔"

"بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں آج کل ماں باپ کے ہاں بیٹھی سوکھ رہی ہیں۔ ہم جیسوں سے بیاہ کوئی عقل کا اندھا ہی کرے گا۔ میاں آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں ــــ لائیے ہمیں دکھائیے آپ کیا پڑھ رہے تھے۔" اس نے کتاب تپائی سے اٹھالی۔ اس کے ورق پلٹے۔ ایک غزل گنگنانے لگی۔

"ذرا زور سے ــــ"

"دروازے بھیڑ دیجئے۔ نیچے سب آواز جاتی ہے۔"

فرہاد نے اٹھ کر صحن کی طرف کھلنے والے دروازے بھیڑ دیئے، رشکِ قمر نے ذرا نیچے سروں میں ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ فرہاد میاں مسحور و مبہوت سنا کئے۔ پھر یک لخت کرسی سے اٹھ کر

کہا: "رشکے ـــــ ملاؤ ہاتھ ۔ تمھارا کیریر سمجھ میں آگیا ۔ ہم تمھیں شاعرہ بنائیں گے ۔"

(۳)

"آل انڈیا مشاعرہ قیصر باغ کی بارہ دری سے ریلے کیا جارہا ہے ۔ محترمہ صوفیہ نسیم صبیح آبادی مشاعرے کی صدارت فرما رہی ہیں ۔ ابھی آپ نے محترمہ نازنین بریلوی سے ان کا کلام سنا ۔ اب لکھنؤ کی ہونہار شاعرہ مس رشکِ قمر سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمائیے ۔ آئیے بہن رشکِ قمر "

مشاعرے کے اختتام پر رشکِ قمر نے اپنا لیڈی ہملٹن کا سیاہ برقعہ اوڑھا اور پچھلے دروازے سے نکل کر گیلری میں پہنچی جہاں آغا فرہاد سیاہ شیروانی سفید پاجامے میں ملبوس اپنی بیاض ہاتھ میں لئے ریڈیو اسٹیشن کے ایک نوجوان افسر سید صاحب کے ساتھ موجود تھے ۔ سید صاحب نے ہیڈ فون اتارا ۔ ان کے آدمیوں نے اپنا انگوٹھا کھنگرو سمیٹنا شروع کیا ۔

"رشکے صاحبہ آپ کے ترنم نے مشاعرہ لوٹ لیا " سید صاحب نے مسکرا کر کہا ۔ رشکِ قمر نے نقاب الٹ کر تسلیم عرض کی ۔

" اب پچھلے سے نکل چلو ۔ ورما صاحب نے تمھارے لئے ایک اور پروگرام بنایا ہے " آغا فرہاد نے اٹھتے ہوئے کہا ۔ " وہ پروگرام کل بتائیں گے ۔ اچھا بھئی سید ۔ کل تم سے ورما کے ہاں ملاقات ہوگی ۔"

آغا فرہاد کے ساتھ باہر آکر رشکِ قمر تانگے پر سوار ہوئی ۔

" تم سے کسی نے سوالات تو نہیں کئے ۔ غیر ضروری ـــــ " فرہاد نے دریافت کیا ۔

" سوالات ہمیشہ غیر ضروری ہوتے ہیں ـــــ " رشکِ قمر نے کہا " لیکن اب آپ کون سا نیا پروگرام سوچ رہے ہیں ؟ "

" یہ بھی غیر ضروری سوال ہے ۔ خاموش رہو اور دیکھتی جاؤ ۔ ہم تمھارا کیریر بنا رہے ہیں ۔"

تانگہ پاٹے نالے کے ایک مکان پر جاکر رکا ۔ اس کے دروازے پر بھی ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا ۔ لیکن یہ مکان فرقان منزل کی اس کوٹھری سے ہزار درجہ بہتر تھا ۔ ڈیوڑھی کے اندر سا چھوٹا سا آنگن ۔

کھپریل کا برآمدہ ۔ اندر دو کمرے ۔ ڈیوڑھی کے پاس بیت الخلا۔ دوسری طرف باورچی خانہ۔ امرود کے
درخت کے نیچے پانی کا نل۔ رشک قمر کو مشاعروں سے آمدنی ہو رہی تھی ۔ ریڈیو پر گانے کے پروگرام مل
رہے تھے ۔ چھ سات مہینے میں کایا پلٹ گئی ۔ خالو اب کسی بڑھیا ہیر کٹنگ سیلون میں ملازمت کرنا چاہتے
تھے ۔ مگر ہرمزی خالہ نے منع کر دیا کہ لوگ کہیں گے مس رشکِ قمر کے خالو نائی ہیں۔ ان کو فرہاد صاحب
نے ایک دوکان میں جلد سازی کے کام پر لگوا دیا تھا۔

دوسرے روز شام کے پانچ بجے قمرن اور جمیلن برقعے اوڑھ نظر باغ فرہاد صاحب کے
بتائے ہوئے پتے پر پہنچیں ۔ بالائی منزل کی بالکنی میں میاں فرہاد انتظارِ ساغر کھینچ رہے تھے ،
اشارے سے اوپر بلایا۔ جمیلن کے لیے نئی بیساکھی آگئی تھی مگر اسے زینہ چڑھنے میں دقت ہوتی تھی ۔
فرہاد خود دوڑے ہوئے نیچے گئے ۔ اس بے چاری کو سہارا دے کر دوسری منزل پر لائے۔ گیلری میں ایک
دروازے پر بورڈ لگا تھا ـــــ نریندر کمار ورما جرنلسٹ (گولڈ مڈلسٹ) رائٹر اینڈ آرٹ ایڈوائزر ۔

اندر کمرہ منہ سے بول رہا تھا کہ ایک خالص انٹلکچوئیل کی بیٹھک ہوں۔ دیواروں پر چغتائی
کے پرنٹ ۔ ایک طرف غالب دوسری طرف ٹیگور۔ کونے میں فلور لیمپ ۔ بک شیلف میں انگریزی اردو
کتابیں ۔ نیچی طویل میز پر اردو کے ترقی پسند جریدے اور چند تازہ بتازہ پاکستانی رسالے ۔ فرش پر
رنگین چٹائی کشتی میں اسٹوڈیو پوٹری کا ٹی سیٹ ۔ صاحبِ خانہ فرش پر بیٹھے ، ریڈیو اسٹیشن والے
دوست سے مصروفِ گفتگو تھے ۔ ایک دیوان پر ایک نازک اندام گوری سی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی
معمولی فالسئی ساری پہنے سہمی بیٹھی تھی ۔ نو وارد لڑکیوں کو دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ
جوڑ کر نمستے کیا۔ صاحب خانہ فوراً کھڑے ہو گئے ۔ قمرن جمیلن کو بڑے تپاک سے تسلیمات عرض کی اور ٹوکری
نما نہایت آرٹسٹک کرسیوں پر بٹھایا ۔ ورما صاحب آغا فرہاد سے عمر میں چند سال بڑے تھے ۔ موٹے سیاہ
فریم کی عینک ، سر پہ جھوا بھر بال ، کھادی سلک کا بادامی کرتا ۔ نہرو جیکٹ ، چوڑی دار پاجامہ ، چہرے
سے نیک دلی اور خوش خلقی ہویدا تھی ۔ دیکھنے سننے میں بھی برے نہیں تھے ۔

بیچلر اپارٹمنٹ تھا ۔ ملازم چھوکرے کو آواز دی ۔ وہ نہیں آیا تو جھنجھلا کر چار دانی اٹھائی

اور کچن کی طرف بھاگے۔

"آپ نے اب تک بتایا ہی نہیں صاحب خانہ کون صاحب ہیں؟" رشک قمر نے چپکے سے پوچھا۔ ریڈیو والے دوست دیوان پر بیٹھے چھریری لڑکی سے بات کر رہے تھے۔

"یہ ——" آغا فرہاد نے جواب دیا۔ "ارے لاجواب آدمی ہیں۔ رئیس زادے ہیں۔ ماں باپ ترائی پر رہتے ہیں۔ انھوں نے یہ فلیٹ لے رکھا ہے آرٹ اور کلچر کی خدمت کے واسطے۔ ہم نے تمھارے متعلق انھیں بتایا۔ انھوں نے فوراً ایک اسکیم بنا ڈالی۔ ابھی دیکھو آکر بتلائیں گے۔"

دریا صاحب چار دانی اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ اب آغا فرہاد نے سرگوشی میں ان سے دریافت کیا —— "یار یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ ——؟"

"پہاڑن ہے ——"

"یہ ستواں ناک، کنول نین، پتلی کمر —— آپ کو پہاڑن نظر آتی ہے؟"

"سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں ہے۔ خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں ——" فرہاد صاحب اکّے تانگے والوں کی طرح گنگنائے۔

"لاحول ولاقوۃ ——" دریا صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ اور گوری لڑکی سے مخاطب ہوئے۔ "موتی۔ ادھر آکر بیٹھو۔ لو —— چار بنانا سیکھو —— بھئی رشک قمر صاحبہ! ذرا اب آپ ان کی تربیت کیجیے۔"

لڑکی دیوان سے اتر کر چارپائی پر آ بیٹھی اور گھبرائی ہوئی سی سب کے چہرے تکتی رہی۔

"لو —— چار بناؤ سب کے لئے ——" دریا صاحب نے ٹرے اس کے سامنے سرکائی۔

"چوکے میں بیٹھنا چھوڑ میری سرتاں۔ چھری کانٹے سے کھانا سیکھ —— لہنگا پہننا چھوڑ میری سرتاں۔ سایہ پہننا سیکھ —— پیڑھی پہ بیٹھنا چھوڑ میری سرتاں —— اپنے دھوئے کنویں پہ تنبورے تانے بھینس دیں گڑھوائے —— بھینس دیں گڑھوائے ——" سید صاحب نے جو دلّی والے تھے، الاپنا شروع کیا۔

"یہ کیا ہے ؟ کہاں کا لوک گیت ہے ؟" ورما نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک دیہاتن پر دلّی کا انگریز ریزیڈنٹ عاشق ہوگیا تھا۔ اس کے متعلق اس زمانے میں ہماری طرف یہ گیت گایا جاتا تھا ـــــ"

"پھر کیا ہوا ـــ؟"

"وہ انگریز قتل ہوا ـــ!"

"ولیم فریزر ـــــ؟" آغا فرہاد نے دریافت کیا۔

"ہماری موتی پہ کوئی فرنگی عاشق ہوگیا تو ہم بھی اسے قتل کردیں گے ـــــ" ورما صاحب نے اعلان کیا۔

"صاحب یہ قتل خون کی باتیں نہ کیجئے۔ بدشگونی ہے۔" رشکِ قمر بولیں۔

"بھائی سنو۔" ورما صاحب نے سینڈوچز سرو کرتے ہوئے فرمایا ـــــ "پچھلے ہفتے ہم گئے تھے علی گنج کے میلے۔ والدہ کو لے کر۔ وہ بے چاری ہنومان جی کے مندر جا جا کر ہمارے لئے منتیں مانتی ہیں کہ ہم راہ راست پر آجائیں یعنی اپنا گھر بسائیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ والدہ تو گئیں مندر کے اندر۔ ہم ذرا کیمرہ لے کر نکلے برائے سیر گشت تو آپ نظر آگئیں۔ ایک پیڑ کے نیچے کھڑی کجری گا رہی تھیں۔ پوری ٹولی ساتھ تھی۔ قیامت کی آواز ہے۔ بس رشکِ قمر صاحبہ آپ کے توڑ پر ہیں۔ ہم نے آپ کو ریڈیو پر کئی دفعہ سنا ہے۔"

"تو آپ ان کو پٹا کے یہاں لے آئیے۔" رشکِ قمر نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"بڑی مشکل ہے۔ خاص الخاص ضلع فیض آباد کی پاتر ہیں۔"

"اور والدہ کو معلوم ہوگیا تو ـــ؟" آغا فرہاد نے پوچھا۔

"ابھی تو انھیں کچھ علم نہیں ہے۔ ہم کیا کریں۔ بجرنگ بلی کی مرضی یہی تھی۔ اچھا بھئی سنو ہماری اسکیم، ہم ایک سونگ برڈز کلب قائم کرتے ہیں۔ آپ تینوں بحیثیت لوک گیت ایکسپرٹ اس کی اسٹارز۔ شہر میں پروگرام کریں گے، ٹور پر جائیں گے۔ سونگ برڈز کلب اڑ جائے گا۔ ہم آرگنائیزر آدمی

ہیں۔ بلا کے ایفی شنٹ۔ کل ہم آرٹ اسکول سے اس کے لیٹر ہیڈ کا نمونہ بھی بنوا لائے ہیں۔ دیکھیے ــــ"
انھوں نے کافی ٹیبل کے نچلے خانے سے ایک کاغذ نکالا۔ جس کی پیشانی پر لکھا تھا: "سونگ برڈز کلب
مینجنگ ڈائریکٹر ایں۔ کے۔ ورما"۔ گوشے میں آم کا درخت، اس پر چڑیاں۔ نیچے ایک لڑکی بیٹھی طنبورہ
بجا رہی تھی۔ سب نے باری باری اس کاغذ کو ملاحظہ کیا۔

"جب چڑیاں ہیں تو لڑکی کی کیا ضرورت ہے ــــ" آغا فرہاد نے اعتراض کیا۔

"بھائی آغا صاحب۔ یہ باریکیاں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم جا کے بینگ بیچو۔ اور سنیے گا۔ ان کا نام تھا موتی۔ ہم نے رکھا ہے صدف آرا بیگم موتی ــــ" ورما صاحب نے لڑکی کو یا للتوپی کی طرح مخاطب کیا: "موتی ــــ کہو صدف۔"

"صدپھ ــــ" لڑکی نے دہرایا۔

"ارے بھئی صدف ــــ ف سے۔"

"صدپھ ــــ پھ سے ــــ"

"استغفراللہ۔ کہو صدف آرا بیگم۔"

"صدپھ آرا بیغم ــــ"

ورما صاحب نے ایک طویل سانس لی: "خیر۔ اللہ مالک ہے۔ کل سے ان کا شین قاف درست کرنے کی INTENSIVE ٹریننگ شروع۔ ڈیڑھ مہینے بعد سونگ برڈز کلب کا پہلا پروگرام ریڈیو پر بھی شیڈیول کر لیا گیا ہے ــــ کیوں میاں؟" انھوں نے سید صاحب سے دریافت کیا۔

"قطعی۔" انھوں نے پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اب ورما صاحب جمیلن کی طرف متوجہ ہوئے جو اس دوران میں چپکی بیٹھی غور سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔ ورما صاحب نے اسے بڑے دھیان سے دیکھا۔ پھر دفعتاً چٹکی بجا کر بولے ــــ "کماری جل بالا لہری ــــ"

"کون ــــ؟ ہم ــــ؟ ہمارا نام جمیل النساء بیگم ہے۔" جمیلن نے بگڑ کر کہا۔

"کماری جل بالا لہری" ورما صاحب نے قطعیت کے ساتھ دہرایا "شکل میں بالکل بنگالی ملاحت ہے۔ آپ بنگال سے کل آئی ہیں ــــ جل بالا لہری ــــ"

"یہ جلا بلا کون بلا ہے؟ اور بنگال سے آئے ہماری بلا۔ ہم حسین آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اب پاٹے نالے پر رہتے ہیں۔"

"ارے بھائی ــــ ہم تمہارا کیریر بنا رہے ہیں۔"

"کریر نہ سریر ــــ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا مستقبل۔"

"ارے ہمارا کریر اللہ میاں نہ بنا پائے، آپ کیا بنائیں گے۔" جمیلن نے خشکی سے جواب دیا۔

"نعوذ باللہ ــــ کیا کفر بکتی ہو۔" ورما صاحب نے برا مان کر کہا۔

"جل بالا لہری ــــ" آغا فرہاد نے توصیفاً دہرایا ــــ "خوب نام سوچا۔"

"لہری کیوں ــــ؟ اس لئے کہ ہم لہرا کے چلتے ہیں؟" جمیلن نے سوال کیا۔

"ارے بھائی ذرا اس الٹی کھوپڑی کی لڑکی کو سمجھاؤ۔" ورما صاحب نے عاجز آکر کہا۔ "لہری ایک بنگالی SURNAME ہے۔"

"ورما صاحب ہم انھیں سمجھالیں گے۔ اب آپ بتائیے۔ ریہرسلیں کب شروع کریں گے؟" رشکِ قمر نے دریافت کیا۔

ورما صاحب پیڈ پر لکھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

سونگ برڈز کلب

۱۔ صدف آرا بیگم

۲۔ مس رشکِ قمر

۳۔ کماری جل بالا لہری۔

(۴)

"ہلو — ہلو — جی ہاں۔ میں ورما بول رہا ہوں۔ آغاہ آداب عرض۔ مزاج عالی — ارے صاحب آپ کہاں تھے۔ دلی سے کب آئے۔ آپ نے ہمارا کونسرٹ MISS کر دیا۔ جی ہاں بہت شاندار رہا۔ ایک منسٹر نے ادگھاٹن کیا۔ خوب تصویریں کھنچیں۔ زبردست پبلسٹی رہی۔ اور ہاؤس فل۔ جی —؟ جی نہیں۔ صرف لائٹ میوزک۔ ہماری آرٹسٹ لوگ غزل اور گیت کی ایکسپرٹ ہیں۔ پریس نے بہت عمدہ ریویو کئے۔ اس وقت —؟ بھئی معاف فرمائیے گا۔ بات یہ ہے کہ آج منگل کی شام ہے۔ والدہ صاحبہ کو ایک کیرتن میں لے جانا ہے۔ آج تو تشریف نہ لائیے۔ ہم اسی وقت نرہی جا رہے ہیں۔ اپنے مکان پر — جی ہاں جی ہاں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔ تو اگلے اتوار کو — بہت خوب۔ آداب عرض۔" ورما صاحب نے فون کا ریسیور واپس رکھ کر ایک گہری سانس بھری۔ آکر دیوان پر گر گئے اور فرمایا "مائیں ہی آڑے وقت پر کام آتی ہیں۔"

"اماں کیوں اتنا سفید جھوٹ بولتے ہو۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کہنے لگے والدہ صاحبہ کو کیرتن میں لے جانا ہے۔" فرہاد نے چٹائی پر لیٹے لیٹے کہا "کون تھا؟"

"ایک مہابور۔ پروگرام کی کامیابی کی داد دینے آرہے تھے۔ ہم نے ٹال دیا۔" ارے بھائی صدف آرا — " ورما صاحب نے آواز دی۔

"صدف آرا کچن میں کچالو بنا رہی ہیں۔" رشکِ قمر نے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھی ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"صدف آرا نے آج تم لوگوں کے لئے بڑھیا کھانا بنایا ہے۔" ورما صاحب بولے۔

"بہت بھلی لڑکی ہے۔" قمرن نے کہا۔

ورما صاحب اچانک جوش میں آکر اٹھ بیٹھے۔ "تم تینوں بہت بھلی لڑکیاں ہو — سنو رشکِ قمر ہم نے ایک اور اسکیم بنائی ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔"

" بات سنو۔ ہم ایک اردو رسالہ نکالیں گے۔ کل ہی جاکر ڈیکلریشن داخل کرتے ہیں۔ اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ گوہرِ شب چراغ۔"

" سبحان اللہ۔" فرہاد نے کہا۔" صدف آرا بیگم اور گوہرِ شب چراغ۔ آپ کا جواب نہیں۔"

" اور پہلے شمارے میں ایک مضمون لکھیں گے رشکِ قمر کے متعلق۔ یہ دیکھو ـــ" انھوں نے کاغذ پر جلدی جلدی کچھ گھسیٹا اور کاغذ رشکِ قمر کو پیش کیا۔

" ممکن عنوان

رشکِ قمر کی شاعری

" کا نظریۂ فن

" کا فلسفۂ حیات

" کے ساتھ ایک شام

" کے شب و روز ـــ"

آغا فرہاد نے کاغذ لے کر پڑھا اور بولے ـــ" یہ آخری عنوان ہمیں پسند آیا۔"

" آپ لوگوں کو ہمارا مذاق اڑاتے شرم تو نہیں آتی۔" رشکِ قمر نے اداسی سے کہا۔

" مذاق ـــ؟ کمال کرتی ہو ـــ ہم تمھارا ادبی کیریر بنا رہے ہیں۔" ورما صاحب نے سنجیدگی سے ارشاد کیا۔

جمیلن صوفے پر لیٹی تھی۔ بیساکھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔ ورما صاحب اور آغا فرہاد دونوں ان کی مدد کے لئے لپکے۔ اچانک جمیلن سر جھکا کر رونے لگی۔

" جلی مُن ـــ جمیلن ـــ کیا ہوا ـــ؟" ورما صاحب نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

" کچھ نہیں ورما صاحب۔" جمیلن نے کشمیری سلک کی ساری کے پلّو سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔" ہمیں ابھی ابھی یہ خیال آیا ـــ کہ ـــ"

" کیا ـــ؟ کیا ـــ؟"

"۔۔۔ کہ ہم نے زندگی میں کبھی سکھ چین دیکھا ہی نہیں۔ اب جو اچانک یہ ہمارا ماحول بدلا ہے۔ اس میں بھی کوئی دھوکا نہ ہو ۔۔۔ بجیا تو سخت جان ہیں، ہم نہیں ہیں ۔۔۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بھائی جلی مُن ۔۔۔ جمیلُن ۔۔۔" ورما صاحب نے انتہائی خلوص کے ساتھ کہا۔

"ارے آپ لوگ ہماری رام کہانی سنیں تو یقین نہ آئے گا۔" رشکِ قمر کافی بناتے ہوئے بولیں "لیکن ہمیں ہمدردی وصول کرنے سے نفرت ہے اور شرم بھی آتی ہے۔"

"ہمیں نہیں آتی شرم۔ جب قدرت کو ہماری یہ دھجیاں بناتے شرم نہ آئی تو ہمیں کیوں آئے۔" جمیلُن نے رومال سے ناک پر پچھتے ہوئے کہا۔ ورما صاحب نے کافی کی پیالی پیش کی۔

"ہم پیدا ہوئے اماں ہماری پیدائش ہی میں مر گئیں۔" جمیلن نے کافی کا گھونٹ بھر کے کہا۔ ہم انگنو کی پیدائش پہ خالہ نے پالا۔ گلیوں میں رُل کے، لوٹ پیٹ کر پانچ چھ سال کے ہوئے۔ اماں کے مرنے کے بعد گھر کا خرچ چلانے والی صرف خالہ رہ گئیں۔ ان کو ہو گئی تپِ دق۔ اماں جو کچھ جوڑ جکوڑ گئی تھیں وہ خالہ کی دوا دارو میں اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ بھوالی جاؤ۔ جو تھوڑا سا پیسہ بچا تھا اسے لے کر ہر مزی خالہ نے بھوالی جانے کی ٹھانی ۔ ۔ ۔"

"اور یہ تمھارے خالو ۔۔۔؟" آغا فرہاد نے بات کاٹی۔

"بتلاتے ہیں سنتے جائیے۔ یہ ایک حجام ہمارے عقیقے کے لئے بلائے گئے تھے۔ ان بے چارے کو ہم لوگوں سے ہمدردی ہو گئی کبھی کبھار آ نکلتے۔ خالہ پہلے تو ان سے اپنی چلم بھروانے کی بھی روادار نہیں تھیں۔ لیکن پردے میں بیٹھتی تھیں۔ بیمار پڑیں تو لوگوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اب دوا علاج کی دوڑ بھاگ کون کرے۔ ہم چھ سال کے تھے، بجیا دس گیارہ سال کی۔ یہ چمن خاں حجام بے چارے باہر کے کام کر دیتے۔ ان کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ بھی محبت اپنائیت کے دو بولوں کے بھوکے تھے۔ کہنے لگے میں تم لوگوں کے ساتھ بھوالی چلوں گا۔ حسین آباد کا مکان بھی کرائے کا تھا۔ ہم لوگ بوریا بستر باندھ کاٹھ گودام روانہ ہوئے۔

" اب یہ نگوڑے یک چشم جمن خاں تھے بڑے عیبی۔ گانجے اور افیم کی لت انھیں۔ جوا یہ کھیلیں۔ خالہ، ہم اور بجیا زنانہ تھرڈ کلاس میں سوار ہوئے۔ وہ مردانے ڈبے میں جا بیٹھے۔

" مریں کو ماریں شاہ مدار۔ سارا پیسہ خالہ نے ان کے حوالے کر دیا تھا کہ حفاظت سے رکھیں گے۔ وہ خود رو گی۔ ہم دونوں بچیاں۔ خیر، کاٹھ گودام ٹرین پہنچی۔ ہم لوگ اترے تو جمن خاں نے اپنے ڈبے سے اتر کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ بولے۔ رات کو سوتے میں کسی نے جیب کاٹ لی۔ خالہ نے کہرام مچا دیا۔ عیبی، بدذات، بھانڈ، شہدے، کسی مسافر کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھا ہو گا۔ ساری رقم ہار گیا۔ انھوں نے حمائل شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ کسی جیب کترے نے بٹوہ پار کر دیا۔ انھوں نے جوا نہیں کھیلا۔ ہم لوگ اپنی قسمت کو رو پیٹ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ اب کیا کریں۔ جو ناشتہ ساتھ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ خالہ کے پاس دو چار روپے تھے وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اب کھائیں کہاں سے۔ جمن خاں اپنی کسبت ساتھ لائے تھے۔ دوسرے دن وہ پلیٹ فارم کے سرے پر جا بیٹھے۔ مسافروں کی حجامت بنانے لگے۔ پھر خالہ کی سمجھ میں ایک بات آگئی۔ وہ ہارمونیم ڈھولکی بھی ساتھ لائی تھیں۔ انھوں نے ڈھولک بجیا کے آگے سرکا دی۔ بجیا نے گانا شروع کیا۔ مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ تھوڑی سی آمدنی ہوئی۔ نینی تال جانے والے امیر لوگ ہمارا گانا سن کر ادھر آ جاتے۔ روپیہ دو روپیہ دے دیتے۔ ریلوے اسٹیشن پر پڑے کئی دن گذر گئے تو پولیس نے ہنکال دیا۔ نزدیک لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک سائبان تھا۔ اس میں جا بیٹھے۔

" کاٹھ گودام بھی آدھا نینی تال سمجھو۔ خالہ کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ ذرا دم آیا تو کسی نے جمن خاں سے کہا آس پاس کے گاؤں میں گا بجا کر کافی کما سکتے ہیں۔ ہم لوگ لاری میں بیٹھ کر ہلدوانی پہنچے۔ پھر وہاں سے اور آگے۔ ترائی کے علاقے میں گھومنے لگے۔ افضل گڑھ، لال ڈانگ، کالا گڑھ۔ وہاں باگھ بگھیلوں کی کثرت تھی۔ رات کو ہم لوگ کسی جنگل کے راستے سے گذرتے، شیروں کے دہاڑنے کی آواز آتی۔ اکثر خالہ مجھے کوستیں۔ کمبخت کوئی شیر بھی آ کر اسے نہیں کھاتا۔ میں بھی

کبھی کبھی دعا مانگتی۔ اللہ میاں کوئی شیر تیندوا بھیج دو جو آکر مجھے کھا جائے۔ لال ڈانگ میں کوربٹ صاحب کا بنگلہ تھا۔ وہ آدم خوروں کی تلاش میں بندوق اٹھائے جنگل جنگل گھومتا تھا۔

"اس علاقے کی آب و ہوا اتنی اچھی تھی کہ خالہ جو برسوں حسین آباد کے گندے مکان میں محبوس رہی تھیں، اچھی ہونے لگیں۔ وہ بڑا سرسبز پرفضا علاقہ تھا۔ وہاں کچے راستوں پر اب بھی دو منزلہ تخکر میں چلتی تھیں۔ ہم لوگ وہاں کئی برس گھومے۔ افضل گڑھ میں عیسائیوں کا مشن تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے اشارتاً ہم سے کہا کہ تم سب عیسائی ہو جاؤ اور ہماری تبلیغی ٹولی میں شامل ہو کر گاؤں گاؤں اسی طرح یسوع مسیح کے بھجن گاؤ تو تمھارا علاج بھی کرادیں گے۔ اسکول کالج پڑھا بھی دیں گے۔ میں نے خالہ سے کہا۔ ہو جاؤ عیسائی۔ خدا نہ یہاں ہے نہ وہاں، فرق کیا پڑتا ہے۔ تمھارا اور میرا علاج تو ہو جائے گا۔ بجیا اسکول میں داخل ہو جائیں گی۔ ان کی زندگی بن جائے گی۔ خالہ ہمیشہ کی ہتھ چھٹ۔ انھوں نے مار مار کر ہمیں اتو کر دیا۔ ٹانگ تو غارت ہوتی۔ بدبخت ایمان بھی کھونے پر تیار ہے۔ خیر ——— ان مشنری عورتوں نے ہمیں اور بجیا کو تھوڑی سی انگریزی پڑھا دی، اُون کا کام سکھلا دیا۔

"جمّن خاں ذات کے بھانڈ تھے۔ کہتے تھے ان کے دادا پردادا شاہی کے لکھنؤ میں نامی گرامی بھانڈ تھے۔ زمانہ بدل گیا۔ ان کے فن کے قدرداں نہ رہے۔ جمّن خاں نے مجبوراً نائی کا کام سیکھ لیا۔ اب بھی ان کو تین چار نقلیں یاد تھیں۔ بے چارے بڑی کوشش سے میلوں ٹھیلوں میں وہی پیش کرتے۔ بجیا اور ہم گاتے۔ خالہ ڈھولک بجاتیں۔ بے چاری خالہ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ گنواروں نے ہمارا نام جمیلن سے جلیبی کر دیا۔ بجیا امرتی کہلاتی تھیں۔ بڑی کٹھن زندگی تھی لیکن خالہ حسین آباد آنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مقید ہو کر انھیں پھر ٹی بی ہو جائے گی لیکن گاؤوں اور قصبوں میں اتنی غربت تھی۔ زمینداروں کی تقریبوں میں دس پانچ روپے ایک آدھ جوڑا کپڑا مل جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے گذر ہو رہی تھی۔ پھر پاکستان بنا۔ سکھ ریفیوجیوں کو بسانے کے لئے جنگل کاٹے گئے۔ اس علاقے میں پنجابی شرنارتھی آباد ہونے لگے۔ وہ ہمارے گاؤں

اور نقلوں کو کیا سمجھیں ۔ ہم لوگوں نے پھر ادودھ کا رخ کیا ۔

" وہاں ایک قصبے میں ہم لوگ ایک سرائے میں ٹکے تھے ۔ جاڑوں کا زمانہ تھا ۔ رمضان کا مہینہ ۔ مجھے وہ رات اب تک اتنی صاف یاد ہے ۔ ۲۱ رمضان کی شب تھی ۔ خالو گاؤں کی مسجد میں تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے ۔ میں اور خالہ اور بجیا سرائے کے برآمدے میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے خالو کا قاعدہ تھا کہ مسجد سے سحری کھا کر واپس آتے تھے کیوں کہ وہاں گاؤں والے دینداروں کی بھیجی ہوئی سحری کھانے کو مل جاتی تھی ۔ سحری کے بعد بستی کی طرف سے نوحے کی دلدوز آواز سنائی دی ـــــ ابن ملجم نے حیدرؑ کو مارا ۔ روزہ دارو قیامت کے دن ہیں ـــــ خالو ، بجیا اور میں بھی وہی نوحہ پڑھنے لگے ۔ اسی وقت ڈھاٹے باندھے ڈاکو صحن میں آ کودے ۔ ایک ڈکیت بجیا کو اٹھا لے جانے کے لئے آگے بڑھا ۔ سرائے کے آنگن میں سحری کے لئے جگہ جگہ چولھے جل رہے تھے ۔ ہماری چیخیں سن کر سارے مسافر دوڑ پڑے ۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا ۔ مگر ہم تینوں دہل کے رہ گئے ۔ خالو فجر پڑھ کر مسجد سے لوٹے ۔ خالہ نے کہا آج ہی شہر واپس چلو ۔ دیہات سے بھر پائے ۔ چنانچہ ہم لوگ لکھنؤ واپس آ گئے ۔ یہاں آغا فرہاد کے شاگرد پیشے میں ایک کوٹھری کرائے کے لئے خالی تھی اس میں آن بسے ـــــ "

ورما صاحب اور آغا فرہاد مبہوت بیٹھے سن رہے تھے ۔ جمیلن نے قصہ ختم کیا تو چونک پڑے ۔

صدف آرا جو رسوئی سے آ چکی تھی کہانی سن کر آنسو بہا رہی تھی ۔

" مگر تعجب ہے رشکِ قمر تم لوگ بھا بھر کے علاقے میں پلی بڑھیں اور اردو تمھاری اتنی نفیس ہے ۔" ورما صاحب نے کہا ۔

" ورما صاحب ـــــ جان صاحب کی ریختی خانگیوں ہی کی زبان تھی ـــــ " آغا فرہاد بولے ۔

" اور ہرمزی خالہ اور جمّن بھانڈ کی تربیت ۔" رشکِ قمر بولی ۔" ہرمزی خالہ سنک گئی ہیں ، لیکن اب بھی ان کو درجنوں شعر یاد ہیں ۔"

" اوہو ـــــ ہمارا خیال تھا تم لوگ ذات کی میراثن ہو ـــــ "

"میراثنیں بیچاریاں شریف ہوتی ہیں۔ پیشہ نہیں کرتیں۔ دراصل ہیں اور بجیا کو گانے کا بہت شوق تھا اس لئے خالہ نے ڈھولک منگوا دی تھی۔"

"پردہ نشین خانگیاں گاتی بجاتی نہیں ہیں۔ ہم سے پوچھیے۔ اچھا ایک بات بتاؤ قمرن۔ عورتیں خانگیاں کیوں بن جاتی ہیں؟"

"یہ بھی نہایت غیر ضروری سوال ہے آغا صاحب۔ گویا آپ تو جانتے ہی نہیں" رشک قمر نے اکتا کر جواب دیا "انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت ورافت سب دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بدحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود ہمارے نانا بیحد شریف، بیحد غریب آدمی تھے۔ وہ مر مرا گئے۔ اماں کو انھوں نے جس شریف غریب آدمی سے بیاہ دیا تھا وہ کسی وبا میں چل بسے۔ ہمارے باپ ——— ہم ڈیڑھ برس کے تھے۔ اماں سترہ برس کی عمر میں بیوہ ہوئیں۔ بالکل بے سہارا رہ گئیں تو مجبوراً ——— ہر مزی خالہ کے میاں کسی فوجداری کے مقدمے پھنس گئے تھے۔ وہ پولیس سے چھپنے کے لئے لاپتہ ہو گئے۔ خالہ کے سسرالیوں نے بیچاری کو منحوس منحوس کہہ کر گھر سے ہنکال دیا۔ وہ بھی ناچار اماں کے پاس حسین آباد آگئیں۔ جمیلن وہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باپ اسی شہر کے بڑے باعزت انسان ہیں۔ انھوں نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی۔"

"افوہ بھائی۔" ورما صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ "صدف آرا رے سنو تو وہ بھی کم ستائی ہوئی نہیں ہے۔ اسے تیرہ برس کی عمر میں اس کی ماں نے ایک جھڑوس زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ وہ تھا SADIST۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ دو سال ہی میں لڑھک گیا۔ یہ گڑھی سے بھاگ کر پھر اپنے گاؤں واپس آگئی۔"

صدف آرا، اب زار و قطار رو رہی تھی۔

"کبھی آپ کے پاس وقت ہو تو ہمارے جمن خاں سے ان کی داستانِ حیات بھی سنئے گا۔ یہ جو آپ لوگ اپنی کتابوں رسالوں میں بڑی اونچی اونچی باتیں لکھتے ہیں سب بھول جائیں گے۔" جمیلن نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

"بھانڈوں کی حالت بہت المناک ہے۔" آغا فرہاد سر ہلا کر بولے "فاقے کر رہے ہیں۔ ہمارے بچپن تک بھانڈ اور سادھو نیچے تقریبوں میں بلائے جاتے تھے۔ یار ورما! تم کو مصطفیٰ حسین بھانڈ یاد ہیں؟ کیا زبردست فن کار تھے۔"

"دھندلے سے یاد ہیں۔ ہماری بوا کی شادی پر برات کے ساتھ وہی تشریف لائے تھے۔" ورما صاحب نے جواب دیا۔

"ہمیں خوب یاد ہیں اسّی برس کے تھے جب ہم نے دیکھا۔ اس عمر میں بھی کیا ناچتے تھے باکمال رقاص تھے۔ اور بعض مرتبہ بس خاموش کھڑے ہو جاتے تھے لیکن اس انداز سے کھڑے ہوتے تھے کہ محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ اور وہ ان کی گھوڑا چھوڑنے کی نقل۔ ارے یہ لوگ ویسٹ میں پیدا ہوئے ہوتے تو ساری دنیا انھیں جانتی اور لکھپتی ہوتے۔"

"جمن خاں مصطفیٰ حسین صاحب سے اچھی طرح واقف تھے۔" رشکِ قمر نے کہا۔

"اب بتاؤ۔ بے چارے جمن خاں کو نائی بننا پڑا۔" ورما صاحب بولے۔

"یہ جو ہماری سوسائٹی میں بے چارے LOWEST OF THE LOWLY کہلاتے ہیں کبھی ان کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھنا چاہئے۔ ہمیں تو شہدوں پر بہت ترس آتا ہے۔ ساری عمر مردے اٹھانا، شادیوں میں پھاور کے پیسے لوٹنا۔ عجیب و غریب گالیاں دینا، یہی ان کی زندگی ہے اور یہ اسی طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں ـــــ اور گورکن اور مردہ شونیاں ـــــ" آغا فرہاد نے کہا۔

"بھائی اب زیادہ ڈیپریس نہ کرو۔" ورما صاحب اداسی سے بولے۔

"اور اب سونگ برڈز کلب ـــــ" جمیلن نے اسی تلخ آواز میں کہا۔

(۵)

لال باغ کی ایک نئی عمارت کی گیلری میں بورڈ:۔

دفاتر سونگ برڈز انٹرپرائیزز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ مینجنگ ڈائرکٹر:

این۔ کے۔ ورما (گراؤنڈ فلور)

سونگ برڈز اسکول آف لائٹ میوزک۔ پرنسپل صدف آرا بیگم، وائس پرنسپل کماری جل بالا لہری۔ فرسٹ فلور۔

"گوہر شب چراغ" اردو کوارٹرلی۔ ڈیوٹیڈ ٹو لائف اینڈ لٹریچر۔ پیٹرن: آغا فرہاد قندھاری۔ اڈیٹر این۔ کے۔ ورما۔ اسسٹنٹ اڈیٹر: مس رشک قمر لکھنوی۔ فرسٹ فلور۔

سونگ برڈز ڈانس اینڈ ڈراما گروپ۔ فرسٹ فلور۔

ریزیڈنس مینجنگ ڈائریکٹر شری این۔ کے ورما۔ سکنڈ فلور۔

شری این۔ کے۔ ورما اپنی نفیس خواب گاہ میں مسہری پر نیم دراز "گوہر شب چراغ" کا اداریہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ صدف آرا بیگم ایک پتی ورتا استری کے مانند پائنتی بیٹھی ان کے پاؤں داب رہی ہیں۔ سہ پہر کا وقت۔ خدا اپنی جنت میں ہے اور دنیا میں ہر طرح سے خیریت۔

"ورما صاحب ــــ اے ورما صاحب ــــ ہم ای کہت رہن اکی ــــ"

"ہم یہ کہتے تھے کہ ــــ"

"اچھا۔ ہم یہ کہتے تھے کہ اب قمرن کا کا ہوییے۔ جمیلن بتاوت رہن مساعروں میں آئے والی ساعرہ لوگ ایجی ٹیسن کر رہی ہیں اکی جس مساعرے میں رسک کمر کو بلایا جیہے وہ نہ جیہیں۔ ان کا چال چلن خراب ہے ــــ"

"شاعرہ لوگ کا دماغ خراب ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو گواہ ہے کہ بہت سی اربابِ نشاط صاحبِ دیوان گذری ہیں اور اہلِ نظر نے ان کی ہمیشہ قدر کی ــــ"

"کا ــــ؟"

"ارے یار۔ تم تو ہو گدھیا۔ اب بک بک مت کرو ہمیں مضمون لکھنے دو ــــ"

"ورما صاحب ــــ ہم ایک بار ہی ایک سپنا دیکھے رہن ــــ اکی تم ہم سے بیاہ کر لیہن ہو اور آغا فرہاد رسک کمر سے۔"

"اس رات تم کھانا بہت کھا کر سوئی ہوں گی۔"

"پر کچھ زمانہ انھوں نے آغا فرہاد کے ساتھ اچھا بتا لیا۔ مشاعروں میں دور دور بلائی گئیں۔ بمبئی گئیں تو بتاوت رہین ہوتے آؤ بھگت ہوئی۔ رائیٹر لوگ کے ہاں روز دعوت۔ چارپانی۔ پھولو پہنچے جگہ جگہ محفلیں سنائیں۔ مشاعرے ہوئے۔ ہر جگہ فرہاد صاحب اور رشک قمر۔ فرہاد صاحب اور رشک قمر دھوم مچا دی۔"

"جی ہاں اور جب صاحبزادے لکھنؤ واپس آئے تو ڈپٹی ڈپٹیائن نے وہ جوتے کاری کی۔ لگائے پچاس اور گنا ایک۔ اسی مہینے باندھ بوندھ کر بیاہ کر دیا۔"

"یہی تو غضب ہوا۔"

"کیا غضب ہوا۔ ماں باپ کی طے کی ہوئی لڑکی سے بیاہ نہ کرتے ؟"

"ارے تم مرد لوگ ہو بڑے حرامی۔ ہم تو جب جانتے جب فرہاد صاحب ڈنکے کی چوٹ رشک قمر سے دو بول پڑھوا لیتے۔"

"زیادہ ٹر ٹر نہ کرو۔"

"تم بھی ہمارے ساتھ یہی کرو گے ہمیں معلوم ہے۔ جہاں تمھاری ماتا کہیں گی اسی کنواری کنیا سپتری راجکماری، سو بھاگیہ لکشمی کے ساتھ سات پھیرے ڈالو گے۔"

"دیکھو صدف ہمارا بھیجا مت کھاؤ۔ جا کر سو رہو۔ بھول گئیں تم کون تھیں۔ کیا سے کیا بنا دیا۔ نامور آرٹسٹ۔ اب اور زیادہ اونچے خواب نہ دیکھو بھائی۔ میلوں ٹھیلوں میں گانے والی موتی کو صدف آرا بیگم میں تبدیل کر دیا۔ پھر بھی چاؤں چاؤں۔"

"نام بدلے سے قسمت تھوڑے بدل جات ہے۔ جمیلن کا نام بدلے سے کیا ان کی ریکھا بدل گئی۔ ویسے ہی پڑی جھینک رہی ہیں کھاٹ پر۔ ہم جات کے ہندو۔ تم نے ہمیں بنایا صدف آرا بیگم۔ جمیلن کو کر دیا جل بالا لہری۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ ارے جو بھگوان کے گھر سے لکھوا کر لایا ہے وہی بھوگے گا۔"

"عجیب پاگل عورت ہے۔"

"ارے بھگوان کی بے انصافی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ رشک قمر کے ہاں چار برس میں دو ٹھو لڑکے۔ اور فرہاد صاحب کے ہاں تین تین بیٹیاں۔ بھگوان کا جو کام دیکھو الٹا۔ اتنے زمانے سے سنسار چلاتے چلاتے گڑبڑا گئے ہیں۔ ارے سنو درما صاحب ...."

"کیا ہے یار ——" درما صاحب اونگھ رہے تھے۔

"جب نادر پیدا ہوئے ہم نے قمرن کو سمجھایا تھا —— یہ بڑے ہو جائیں تو آغا فرہاد پہ دعویٰ کر دینا۔ اتنی بڑی جائداد کے مالک ہیں کچھ تو مل جائے گا۔ وہ توبہ تلا کرنے لگیں کہ ایسی بات ہی پھر نہ کہنا۔ اس بے چارے کے مرنے کے بعد فرہاد صاحب نے قمرن کا دوئی سو روپیہ باندھا۔ یہ بھی الٹی بات۔ اب جون آفتاب پیدا بھئے تو ان کا چار سو رو مہینہ نہیں کرنے کا چاہی ؟"

"ارے چغد! آفتاب ان کا لڑکا نہیں ہے۔"

"وہ تو ہم ہُو جانت ہیں۔ وہ جون آرٹسٹ پنجاب سے آیا رہا اُو کلہے۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ —— ختم فسانہ ہوئے گیا۔ آغا فرہاد تو ملتے جُلتے ہیں نہیں۔ بیوی سے ڈرت ہیں۔ ہمدردی میں وظیفہ دیت ہیں۔ تو ہمدردی ما دو سو اور بڑھا دیں۔ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی ہے۔ اور قمرن بے چاری کی حالت بہت خراب ہے —— اے درما صاحب —— سوئے گیئن ——"

درما صاحب اب خراٹے لے رہے تھے۔ صدف آرا بیگم اٹھ کر رسوئی گھر کی طرف جا رہی تھیں جب کال بیل بجی۔ جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ایک لمبا تڑنگا، خوش شکل گورا چٹا اجنبی نیلا سوٹ پہنے کھڑا مسکرا رہا تھا، اپنا نام بتایا۔ صدف آرا نے اندر جا کر درما صاحب کو جگایا۔

"اے درما صاحب —— اٹھو —— وہ آئے ہیں۔ آغا شب دیگ ——"

(۶)

"بجیا —— بہت بن ٹھن کے چلیں —— آغا شب دیگ نے بلایا ہے ؟"

"جمیلئن تم صدف کی نقل میں جاہلانہ باتیں نہ کرو۔ ہم آغا شب آویز ہمدانی کے ساتھ آئی

پکچر دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"شب آویزنہ نام ہی انوکھا ہے۔"

"خالص ایرانی نام ہے۔ اور ہمدان سے ان کے باپ کلکتے آن بسے تھے۔"

"شکر زان، چار دان، ہمہ دان معقول۔ بس ذرا یہ خیال رکھنا کہیں یہ بھی چونا نہ لگا جائیں۔ ایرانی ہے۔ حد سے حد متعہ کر کے چھوڑ دے گا۔"

"کالی زبان۔ تھو تھو —"

"نکاح کرے گا —؟"

"ہاں کہہ چکا ہے۔"

"نکاح کے لئے تیار ہے؟ جمیلن خوشی کے مارے اٹھ بیٹھی۔ سرہانے سے کھسک کھسک کر پائنتی آگئی جہاں قمرن کھڑکی کے پاس کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔

"کل شام کہہ رہے تھے یہاں سے جاتے ہی خط لکھیں گے۔ ٹھیک دو مہینے بعد بلالیں گے۔"

"کلکتے —؟"

"نہیں ان کی بزنس کئی جگہ پھیلی ہے۔ کراچی، طہران، لندن۔ ابھی تو کراچی جا رہے ہیں۔"

"ورما صاحب ان سے اچھی طرح واقف ہیں؟"

"ورما صاحب ہی کے پاس تو آئے تھے اپنی بزنس کے سلسلے میں۔ صدف مجھ سے ریڈیو اسٹیشن پر ملی۔ کہنے لگی ایک آغا کلکتے سے آیا ہے۔ بہت امیر ہے اور چھڑا۔ شاید نکاح کر لے۔ موسیقی کا بہت شوقین ہے۔ بے چاری نے دوسرے روز ہی سونگ برڈز کلب کا پروگرام رکھا۔"

"بجیا — ایک بات کہوں۔ ورما صاحب صدف کی اس عادت سے بہت پریشان ہیں کہ وہ تمھیں سونگ برڈز کے ذریعے لوگوں سے ملواتی ہے۔ سونگ برڈز اسی لئے بدنام ہو رہا ہے۔"

"تو آخر میں کیا کروں؟ مر جاؤں؟ مشاعروں کے دعوت نامے آنے بند ہو گئے۔ ریڈیو پروگراموں سے خرچہ چل سکتا ہے؟ دو سو روپلی فرہاد کے ہاں سے آتے ہیں۔ پچاس روپے مہینہ

دریا صاحب فرضی میوزک اسکول کی فرضی وائس پرنسپل کے نام سے تم کو دے رہے ہیں محض از راہِ ہمدردی۔ ڈھائی سو میں گذر ہو سکتی ہے؟ ابھی آفتاب کو اسکول میں ڈالنا ہے۔"

"بجیا ـــــ یہ آغا ہمدانی واقعی تم سے شادی کرنے کو تیار ہے ـــــ؟"

"کہہ چکا ہے صاف صاف الفاظ میں۔"

"لگتا ہے تم اس پر عاشق ہو گئی ہو۔ کمبخت خوبصورت تو بہت ہے۔"

"ہاں عاشق تو ہو گئے ہیں۔ آج تک کسی پر عاشق نہیں ہوئے تھے۔ اس پر جان جاتی ہے اور وہ بھی ہمیں بہت چاہتے ہیں۔"

"مگر وہ تمھیں کراچی یا لندن بلا کر شادی کرے گا۔ یہ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کالی زبان۔ تھو۔ تھو۔ تھو ـــــ تو تو میری خوشی دیکھ کر جلتی ہے ـــــ لنگڑی چڑیل ـــــ بچھل پائی ـــــ"

"از برائے خدا بجیا ـــــ ایسی گھٹیا باتیں تو مت کرو ـــــ"

بجیا پرس اٹھا تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ٹاٹ کا پردہ اٹھایا۔ اور باہر نکلیں سائیکل رکشا میں بیٹھیں۔ رکشا پاٹلے نالے سے نکل کر کارلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔

(۷)

اور ے بدھاتا بنتی کروں توری پیّاں پڑوں بارم بار
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو چاہے نرک دیجو ڈار

ڈھولک کی تھاپ پر صدف آرا اور کماری جل بالا لہری کی سریلی آوازیں اور ایک دل دوز پوربی گیت ـــــ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو ـــــ ارے اگلے جنم ـــــ

سونگ برڈز میوزک اسکول کے کمرے میں ایک لڑکی ٹیپ ریکارڈ چلا رہی تھی۔ صدف اور جمیلن برآمدے میں چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ جمیلن کی بیساکھی سامنے دھری تھی۔ صدف تھالی میں ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ دریا صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔

"آج پندرہ تاریخ ہے۔ قمرن اب تک کراچی پہنچ گئی ہوں گی" صدف نے آلو چھیلتے ہوئے کہا۔

"کیا پتہ" جمیلن آہستہ سے بولی "کب تک پہنچیں گی۔ دھکا پاسپورٹ سے گئی ہیں۔ کھوکھراپار کا راستہ سنا ہے بڑا جان جوکھوں کا سفر ہے۔ جوان بیٹی کا ساتھ"

"آج کی بات ہے جب ماہ پارہ پیدا ہوئی تھی۔ سولہ برس گذر گئے" صدف نے کہا۔

"اب کیا وہ بجیا کو پہچانے گا۔ روپا ہو گئے کیس ـــــ صدف ہم تو جانتے ہیں بعض گیت ہی منحوس ہوتے ہیں۔ یاد ہے بجیا ہر پروگرام میں وہی ایک راجستھانی مانڈ سنایا کرتی تھیں۔ ساون بیتو جائے ـــــ عالیجاہ بیگی آؤ درے ـــــ عالیجاہ بیگی آؤ درے ـــــ روپا ملا نہ ساجن ملے روپا ہو گئے کیس ـــــ عالیجاہ بیگی حرامزادے الو کے پٹھے کو نہ واپس آنا تھا نہ آیا ـــــ ارے ایک خط تک نہ لکھا ـــــ"

"شروع شروع میں دو چار چٹھیاں تو آئی تھیں ـــــ" صدف نے کہا۔

"اس کے بعد گول ـــــ بجیا نے کتنے خط لکھے۔ ہر پتے پر ـــــ کراچی ـــــ طہران ـــــ لندن ـــــ سترہ برس ڈاکیے کی راہ دیکھتے گذار دیئے۔ صبح شام دروازے پر جاکر ڈاک کا انتظار کرتیں۔ ہم سے بار بار پوچھتیں کوئی ڈاک آئی ـــــ کوئی تار آیا۔ سترہ برس ـــــ اتنا بڑا انتظار"

"بہت بڑا انتظار ـــــ" صدف نے دہرایا۔

"جب ماہ پارہ پیدا ہوئی تھی یاد ہے ورما صاحب نے بھٹ سے اس کا کیا نام تجویز کیا تھا ـــــ ماہ رُخت ـــــ کہ ایرانی کی بیٹی ہے اس کا نام ہے ماہ رخت ـــــ اور ایک نام امرآپالی رکھا تھا ایک ایرانی نام رکھو۔ ایک ہندوستانی اور جب باپ کے پاس جاکر رہے گی انگلینڈ۔ ایک انگلش نام وہاں رکھے گی۔" جمیلن بے پایاں تلخی سے ہنسی "ماہ پارہ اپنے اسکول میں لڑکیوں سے کہا کرتی تھی ہمارے ڈیڈی لندن اور کراچی کے بڑے بھاری بزنس مین ہیں۔"

" ورما صاحب کوئی تحفہ اس کے لئے فارن سے لے کر آتے اسے سمجھا دیتے۔ بٹیا امرآپالی

اسکول میں اپنی دوستوں کو بتانا تمھارے ڈیڈی نے لندن سے بھیجا ہے۔" صدف نے کہا اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے۔

"صدف۔ بجیا کو ڈھونگی پیروں فقیروں کے چکر میں تم ہی نے ڈالا۔"

"ہم کیا کرتے جمیلن۔ قمرن ماہ پارہ کی وجہ سے بالکل خفقانی ہوتی جاتی تھیں۔ ہم سے روز کہتیں۔ ماہ پارہ بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں اسے بھی میری طرح کی زندگی نہ گذارنی پڑے۔ میں چاہتی ہوں اسے کسی نہ کسی طرح اس کے باپ کے سپرد کر دوں۔ جمیلن تو خدا ہی کو نہیں مانتیں ان سے کیا کہوں۔ تم کسی پہنچے ہوئے بزرگ کے پاس لے چلو۔ یہ تو اب کی بات ہے جب ماہ پارا تین سال کی تھی تب قمرن ایک شاہ صاحب کے پاس گئی تھیں ہمیں بھی ساتھ لے گئی تھیں ـــــ ان کی بہت دھوم سنی تھی۔ انھوں نے قمرن سے کہا تمھارے اوپر کسی دشمن نے جادو کر دیا ہے۔ راستے بند کر دیئے ہیں۔ تمھارے بال کہیں پر دفن کیے گئے ہیں۔ تین سو روپے دو۔ قبرستان میں چالیس دن عمل کریں گے ہم تو یہ سب سن کر ڈر گئے۔ ہم نے قمرن سے کہا واپس چلو ـــــ ہم تو آ گئے مگر وہ پھر پہنچیں ان کے پاس۔ ان سے مایوس ہوئیں تو دوسرے عاملوں کے پتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود جانے لگیں ـــــ کتنا روپیہ برباد کیا۔ تم سے ڈرتی تھیں۔ تمھیں کیا بتائیں۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ مگر وہ مانی ہی نہیں۔ بس یہی لگن لگی تھی کہ شب دیگ کا خط آجائے۔ وہ بلالے۔ بلا کر بیاہ کر لے یا ماہ پارہ کی ذمے داری سنبھال لے۔ سارے پیر فقیر، نجومی، رمّال انھیں یہی آس دلاتے گئے۔ آج سے اکیسویں دن خط آوے گا۔ آج سے ساتویں رات وہ خواب میں آئیں گے۔ آج سے چالیسویں دن خط آوے گا۔ سنیچر کی ساڑھ ستی ہے۔ وہ ختم ہوگی تو مراد پوری ہوگی ـــــ ارے کتنا سینکڑوں ہزاروں روپیہ کھلا دیا ان ٹھگوں کو ـــــ مگر آس نہ ٹوٹی ـــــ"

"اس پیر گردی میں بجیا نے اپنے زیور بھی بیچ ڈالے۔ پورا ایک سیٹ بنوایا تھا جڑاؤ ـــــ ایک جوڑ کڑے ٹھوس۔ تمھارے ہی ساتھ جا کر تو بنوائے تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کہیں جاتی ہیں تو گہنے نہیں پہنتیں۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگیں ماہ پارا کے لئے بنک کے لاکر میں رکھ دیئے ہیں۔ اب ان کے

پاکستان جانے کے بعد خبریں مل رہی ہیں کہ سارے گہنے بیچ کر ایک ٹھگ پیر فلفل شاہ بلیّوں والے کو کھلا دیئے ۔ وہ برسوں سے ان کے لئے بہت لمبے لمبے عمل کر رہا تھا۔"

"ایک بات ہے جمیلن ۔ ان ہی فلفل شاہ نے اِن کو کراچی جانے کی رائے دی۔"

"کہاں رہتا ہے ۔ میرا بس چلے تو جیل بھجوا دوں ۔" "بخشی کے تالاب پر رہتا تھا ۔ اب غائب ہے ۔ ہم سے ایک روز قمرن نے آکر بہت خوشی خوشی بتایا کہ فلفل شاہ کہتے ہیں ۔۔۔ لڑکی کو لے کر پاکستان چلی جاؤ ۔ ہم نے اس کا زائچہ بنایا ہے ۔ اس کے ستارے بہت تگڑے ہیں ۔ کراچی پہنچتے ہی گوہر مراد حاصل ہوگا ۔ محبوب کا سر تمہارے قدموں پر ہوگا ۔۔۔ اب ہم تو یہ کہتے ہیں جمیلن ہو سکتا ہے کراچی میں شب دیگ سے ملاقات ہو جائے ۔ اپنی لڑکی کو دیکھ کر ہی انہیں دیا آجائے ۔ اور کچھ نہیں تو ماہ پارا کے نصیب ہی اچھے نکلیں ۔ ان کا وہاں بیاہ ہو جائے ۔ ہم تو دونوں جب سے گئی ہیں ، روز دعائیں مانگ رہے ہیں ۔ کبھی کبھی بھگوان سن بھی لیتے ہیں ۔"

"اچھا ۔۔۔ ؟ تم اپنے لئے اتنی مدتوں سے دعا مانگ رہی ہو وہ تمہارے بھگوان نے سُنی ؟" جمیلن نے پوچھا۔

صدف سر جھکائے ترکاری کاٹتی رہی ۔

" ورما صاحب نہیں آئے اب تک ہم چلیں ۔" جمیلن نے اپنی بیساکھی اٹھاتے ہوئے کہا ۔

" اپنی پریشانیوں میں گھوم رہے ہیں ۔ جب سے ان کے باپ مرے ہیں وہ باپ کی بزنس سنبھالیں کہ سوئنگ برڈز کو دیکھیں ۔ کل کہہ رہے تھے اس کو بند ہی کر دیں گے ۔"

" پھر تم کہاں جاؤ گی ۔۔۔ ؟ ان کی ماتا جی تو تمھیں قبولنے کے لئے اب تک راضی نہیں ہوئیں ۔"

" جہاں ہمارے مقدر میں ہوگا جمیلن ہم وہاں جائیں گے ۔"

" ہمیں رکشا تک پہنچا دو صدف ۔۔۔۔ بجیا اگر کراچی پہنچ گئی ہیں تو وہاں دھکّے کھاتی پھر رہی ہوں گی ۔ اب ہم گھر جا کر ان خط کا انتظار شروع کریں گے ۔"

(۸)

پیاری بجیا تسلیم

آپ کو یہاں سے گئے ایک سال ہو گیا۔ خیریت سے پہنچنے کا صرف ایک پوسٹ کارڈ آیا تھا۔ اور اس کے چار مہینے بعد ایک اور پوسٹ کارڈ۔ ہم اور خالہ یہاں فکر سے ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں۔ از برائے خدا سب مفصل حالات لکھئے۔ شاید آپ نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔ ہم آپ کو جتنے خط بھیجتے ہیں جواب نہیں آتا۔ صدف بھی کئی خط لکھ چکی ہیں۔ اب یہاں کے حالات سنئے۔ بڑے افسوس سے اطلاع دیتی ہوں کہ خالو کا بدھ کو انتقال ہو گیا۔ کل مسجد میں سوئم کی قرآن خوانی، فاتحہ خوانی بھی کروا دی گئی۔ بجیا دوسری بری خبر یہ سناتی ہوں کہ تمھارا لڑکا آفتاب ایک روز مجھ جاگتی کی سونے کی دونوں چوڑیاں جو تم بنوا گئی تھیں کلائیوں میں سے نوچ کر لے بھاگا۔ میں جنم کی اپاہج: اس کے پیچھے دوڑ بھی نہ سکی۔ خالہ ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ یاد ہے پہلے کہا کرتا تھا فرہاد صاحب کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں گا۔ ان کی لڑکیوں کو غنڈوں سے اٹھوا لوں گا۔ اب تمھارے جانے کے بعد سے دُھن سوار تھی کہ بمبئی جا کر ہیرو بنوں گا۔ میری چوڑیاں اڑا کر بمبئی بھاگ گیا۔ سنا ہے وہاں چاقو چھری لئے غنڈہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔

فرہاد صاحب کی نئی کوٹھی بٹلر پیلیس کولونی میں بن کر تیار ہو گئی ہے۔ وہ اس میں اٹھ گئے ہیں۔ ان کی بڑی لڑکی جس کی شادی انگلینڈ میں کسی ڈاکٹر سے ہوئی تھی وہیں پر ہے۔ چھوٹی جو بیاہ کے کراچی گئی تھی شاید تمھاری کبھی اس سے وہاں مڈبھیڑ ہو جائے۔ سنا ہے اس کا شوہر وہاں کروڑ پتی ہے۔ منجھلی والی لڑکی آج کل لکھنؤ میں ہے۔ اس کے شوہر نے سیتاپور میں بڑے پیمانے پر فارمنگ شروع کر دی ہے۔ فرہاد صاحب نے خالو کے کفن دفن کے لئے پانچ سو روپے بھجوائے تھے۔ جو ملازم پیسے لے کر آیا تھا اس نے یہ سب بتلایا۔

بجیا تمھیں یاد ہے ماہ پارا کے باپ کے لکھنؤ سے جانے کے چند روز بعد ہم لوگ سب ورما صاحب کے ہاں جمع تھے۔ تم نے کہا تھا پتہ نہیں ہماری ماں، خالہ اور ہم دونوں اتنے بدنصیب کیوں

پیدا ہوئے تو میں نے تم سے کہا تھا ذرا دنیا کے اصل بدنصیبوں کو دیکھو۔ جنم کے اندھے۔ ڈھائی فٹ کے بونے بونیاں۔ کبڑی لڑکیاں، بیٹھ پر یہ بڑے بڑے کوبڑ یا چہرے پر چیچک کے نشان۔ بھینگی۔ کانی۔ ہم ہی کو دیکھ لو کہ اچک اچک کر چلتے ہیں۔ کم از کم تمھاری صورت تو اچھی ہے۔ آواز تو ہے۔ اور دیکھو مردہ شو نیاں، بھکارنیں، جیل کاٹنے والی عورتیں۔ فرض کرو تم کسی قتل کے مقدمے میں پھنس جاتیں اور عمر قید ہوتی۔ دنیا میں ہزاروں کیا لاکھوں انسان عمر قید کاٹ رہے ہیں سینکڑوں پھانسی چڑھتے ہیں۔ قتل کئے جاتے ہیں۔ تم اور ہم تو لاکھوں سے بہتر ہیں، اپنے سے بدتر لوگوں پر نظر کرو۔

ورما صاحب تالی بجا کر بولے۔ شاباش جمیلن THAT'S THE SPIRIT۔ لیکن اب بھیا ہماری اسپرٹ کا بھی کچھ کچومر نکلتا جا رہا ہے۔ کہاں تک اور کب تک۔

اسی روز، تم اس کمبخت آغا شب دیگ کی روانگی کی وجہ سے بہت اداس بیٹھی تھیں تو ورما صاحب نے تمھیں CHEER UP کرنے کے لئے چھیڑا تھا کہ رشکِ قمر تم کو ہر شب چراغ کے لئے ایک افسانہ لکھو۔ افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بیقرار کا۔ آنکھوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا — تو میں نے چڑ کر کہا تھا افسانہ لکھیں بھیا کے دشمن۔ اور موئی آنکھیں نہ ہوئیں بالٹیاں ہوگئیں۔ بالٹیوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا۔ سب خوب ہنسے تھے۔ تم بھی ہنس پڑی تھیں۔ پھر ورما صاحب خود ہی کہنے لگے واقعی تم دونوں کی زندگیاں تو ایسی ہیں کہ کوئی گریک ٹریجڈی بھی اس کے مقابلے میں پکنک معلوم ہو۔ میں نے پوچھا گریک ٹریجڈی کیسی ہوتی ہے۔ تم نے کہا تھا وہی جو ہمارے مقابلے میں پکنک معلوم ہو۔

ورما صاحب بولے۔ تم لوگ تنہا نہیں ہو۔ ہمارے سماج میں زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں ہمیشہ سے ٹریجک رہی ہیں اور انھیں مزید بیوقوف بنانے کے لئے انھیں ستی ساوتری، وفا کی پتلی، ایثار کی دیوی کے خطاب دے دیئے جاتے ہیں اور وہ خوش ہو جاتی ہیں۔"

"نہایت الو کی پٹھیاں ہیں۔" میں نے جل کے کہا تھا۔ کہنے لگے "لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں روتی ہے کہ جانے کیسا نصیبہ لے کر آئی ہے۔ وداع ہوتی ہے تو ماں پچھاڑیں کھاتی ہے کہ جانے

سسرال میں اس پر کیا بیتے گی۔ کبھی تم نے کسی انگریز یا امریکن یا یوروپین لڑکی کو دیکھا یا سنا ہے
کہ اس کے بیاہ پر وہ خود یا اس کے ماں باپ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوں۔ پھر ہماری ہندوستانی
عورت بیوہ ہوتی ہے تو دراصل پچھاڑیں اس لئے کھاتی ہے کہ اس کے روٹی کپڑے کا سہارا ختم ہوا۔
مگر بجیا۔ ان سب کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔ ورما صاحب نے ہمیشہ اسی طرح
بڑی اونچی اونچی باتیں کیں مگر خود صدف سے بیاہ نہ کیا۔ ایسی وفادار عورت جس نے بنئس ایکیس[21] برس
ان کے پاؤں دھو دھو کر پئے کسی دوسرے پر نظر نہ ڈالی اسے انھوں نے پچھلے دنوں پرانی جوتی کی طرح
اتار پھینکا۔

چنانچہ اب ایک بلکہ دو زوردار خبریں بھی سن لو۔ شری نریندر کمار ورما کو ایک دولت مند
گجراتن لیڈی ڈاکٹر نے اغوا کر لیا۔ ولایت سے آئی تھی۔ یہ بڑی بھینس کی بھینس۔ ورما صاحب پر
خوب ڈورے ڈالے۔ بہت امیر عورت ہے۔ باپ احمد آباد میں مل اونر ہے۔ ورما صاحب کی سونگ برڈز
انٹرپرائیزز اب تقریباً ٹھپ ہو چکی ہے۔ اپنا خاندانی بزنس وہ گھاٹے سے چلا رہے تھے۔ گو ہر شب چراغ
بھی بند ہو گیا۔ اس میں بہت روپیہ اتنے برسوں ڈبویا۔ شاید یہی سب سوچ کر ڈاکٹرنی سے شادی کر لی۔
وہ انھیں رخصت کرا کے احمد آباد لے گئی۔ بجیا تم سوچ سکتی ہو صدف کا کیا حال ہوگا۔ بہت برا حال
تھا۔ چکو پھکو روتی تھی۔ لیکن ورما صاحب نے کچھ روپیہ اس کے نام جمع کر دیا تھا۔ اس نے دو کمروں کا
ایک فلیٹ لے لیا۔ اس میں اٹھ گئی۔ یہ کوئی چھ مہینے کی بات ہے۔ مگر اب جو قصہ سناتی ہوں اس پہ
سر دھنو۔ ابھی چار مہینے ہوئے لکھنؤ میں ہندوستانی لوک سنگیت پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔
مجھے اور صدف کو بھی مدعو کیا گیا۔ کانفرنس والے مجھے کرسی پر بٹھا کر لے گئے۔ میرے اندر اب گانے
کی طاقت تو رہی نہیں بس بیٹھی ٹکر ٹکر سب کے منہ دیکھا کی۔ کانفرنس میں فارن کے لوگ بھی آئے
تھے۔ ایک اردو ہندی داں امریکن بھی تھا۔ بجیا، وہ امریکن صدف پر لٹو ہو گیا۔ جتنی دیر انھوں نے
گایا وہ بالکل الوؤں کی طرح منہ کھولے ان کو تکتا رہا۔ کانفرنس کے بعد صدف سے بار بار ملا۔ پندرہ ہی
دن ان کو کورٹ میں لے جا کر سول میرج کر لی۔ صدف سے تین چار سال چھوٹا ہی ہوگا۔ (یاد ہے ورما صاحب

کہا کرتے تھے۔ ہماری سرون پہ کوئی فرنگی عاشق ہوگیا۔ ہم جاکر اسے قتل کر دیں گے!) شادی کے تیسرے دن صدف اسے لے کر ہم سے ملانے لائیں۔ کہنے لگیں یہ ہیں سیڈی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں' مس سیڈی تھامپسن'، کسی انگریز کے مشہور ناول کی ہیروئن ہے۔ میں نے دل میں سوچا یہ دریا صاحب کو بتانے والی بات ہے۔ وہ فٹافٹ نام تجویز کرنے کے بہت شوقین تھے۔ مگر دریا صاحب اب کہاں۔ احمد آباد میں بیٹھے سسرے کا بہی کھاتہ دیکھ رہے ہوں گے۔

آج پندرہ دن ہوئے ہیں بی صدف اپنے میاں کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ چلتے وقت ہم سے لپٹ کر اور تمھیں یاد کر کے دھاروں روئیں۔ پرسوں ان کا پیرس سے ہمارے نام خط بھی آگیا۔

کاش بجیا اسی طرح تمھارے دن بھی پھر جائیں۔

دریا صاحب کا میوزک اسکول بند ہونے سے ہماری وہ پنشن بھی القطع جو بچارے نے اتنے برسوں دی۔ تمھارے جانے کے بعد تو ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ فرہاد صاحب سے ہم ایک پیسے کی مدد نہ لیں گے۔ بجیا اب چلا پھرا بالکل نہیں جاتا۔ پلنگ پر پڑے پڑے پلاسٹک کی ٹوکریاں، سوئیٹر بن کر بیچے۔ اب چکن کاڑھنی شروع کر دی ہے۔ ایک ساڑی کے دس روپے۔ زیادہ کڑھت ہو تو بیس یا پچیس۔ بہت دیدہ ریزی کا کام ہے۔ مگر اب آمدنی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ فاقہ کشی کا وہی زمانہ واپس آگیا جو بچپن اور لڑکپن میں تھا۔ واہ ہماری بھی کیا زندگی رہی۔

بجیا اگر تمھارا کام وہاں نہ بنے تو از برائے خدا واپس آجاؤ۔ خالہ دعا لکھواتی ہیں۔ ماہ پارا کو بہت بہت پیار۔

تمھاری جمیل النساء

یہ خط مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا کیوں کہ ۱۹۶۵ء کی انڈو پاک جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھارت اور مغربی پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

(۹)

میری پیاری بہن جمیل النساء ہزاروں دعائیں۔ میں جب سے یہاں آئی ہوں تم کو کئی خط

لکھ چکی ہوں۔ ایک کا جواب نہیں آیا۔ تمھارے اور خالہ خالو اور آفتاب بیٹے کے لئے سخت فکرمند ہوں۔ میں نے تمھیں پہلے بھی لکھا تھا اب پھر تاکید ہے آفتاب کو کسی طرح مار پیٹ کر اسکول بھیجتی رہو۔ ورما صاحب سے کہو اس کی فیس معاف کرادیں اور اسے سمجھائیں کہ وہ پڑھنے میں دل لگائے۔ وہ میرے سامنے ہی حد سے زیادہ آوارہ ہوگیا تھا۔

میں تم کو یہاں کی داستان پوری لکھ چکی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مفصل خط تم کو نہیں ملا از سر نو سارا قصہ بتاتی ہوں۔ مگر تم میری فکر میں گھلنا نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

کھوکھراپار کے رستے میں بریلی کے ایک غریب مولوی صاحب اور ان کی بڑھیا کا ساتھ ہوگیا تھا جو اپنے بیٹے کے پاس کراچی جارہے تھے۔ بڑے نیک لوگ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے تم عورت ذات۔ جوان جہان بیٹی کا ساتھ۔ کراچی میں اکیلی کہاں دھکے کھاؤگی۔ جب تک کوئی ٹھکانہ نہ بنے ہمارے ساتھ ہی رہو۔ میں نے ان کو یوں بتایا تھا کہ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ وہ چھ ماہ کراچی چھ ماہ لندن رہتا ہے اور میں نان نفقے کا مطالبہ کرنے پاکستان آئی ہوں۔ یہ سن کر انھیں بہت ہمدردی ہوگئی تھی کیوں کہ ان کی لڑکی کو بھی اس کے خاوند نے بے قصور طلاق طلاق کہہ کر دھتا بتائی تھی اور وہ بریلی میں پڑی اپنی جان کو رو رہی تھی۔

بہرحال۔ تو میں ان کے ساتھ لالوکھیت پہنچی جو یہاں غریب مہاجروں کی ایک بستی ہے۔ ان کا بیٹا محمد لطیف خان کسی امریکن کے ہاں موٹر ڈرائیور تھا۔ وہ بھی بہت اچھی طرح پیش آیا مگر اس کی بیوی ماہ پارا اور مجھ سے جلنے لگی۔ میں نے لطیف بھائی سے کہا کہ جلد از جلد مجھے کہیں کھانا پکانے کی نوکری ہی دلوادیں تو میں ان کے گھر سے چلی جاؤں۔ وہ میرے لئے نوکری ڈھونڈنے لگے۔ ہمیں وہاں رہتے دس بارہ دن ہوئے تھے کہ ایک روز لطیف بھائی کی دلہن نے میلاد شریف کیا۔ اس میں میں نے نعتیں اور سلام پڑھا تو بہت تعریف ہوئی اور محلے میں گھر گھر میلاد شریف پڑھنے کے لئے بلائی جانے لگی۔ یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ اکثر مکانوں میں بیویاں میری حالت پر ترس کھاکر دو چار روپے بھی دے دیتیں۔ ایک بار پھر وہ ترائی کے گاؤں میں گھومنے کا زمانہ لوٹ آیا۔ کیا اللہ کی شان ہے۔

ایک روز ایک محفل میلاد میں درود شریف پڑھا جارہا تھا کہ باہر ایک موٹر آن کر رکی اور اس میں سے کچھ غیر ملکی کیمرے سنبھالے اترے۔ میں سمجھی لطیف بھائی جہاں ملازم ہیں وہ لوگ ہیں۔ باہر گئی۔ وہ یوروپین ٹورسٹ تھے۔ اس وقت عورتیں اندر صحن میں زور زور سے درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ ان لوگوں میں سے ایک نے جس کے لمبے لمبے سرخ بال تھے اور نیچے کو جھکی ہوئی مونچھیں۔ مجھے بلا کر انگریزی میں پوچھا "یہ آل محمڈن کیا ہے؟" پہلے تو میں چکرائی پھر خیال آیا کہ "آلِ محمدؐ" ان کی سمجھ میں ALL MOHAMMADEN آیا ہے۔ توبہ توبہ۔ اتنے میں ماہ پارا آگئی اس نے انگریزی میں سمجھایا کہ ہم لوگوں کی ریلی جس میٹنگ ہو رہی ہے۔ لال مونچھوں والا ماہ پارا کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میری لڑکی ہے۔ میں نے کہا "یس"۔ اجازت چاہی تصویر کھینچ سکتا ہوں "اِسٹننگ پرشین بیوٹی" میں نے سر ہلایا اس نے فوراً کئی تصویریں اتار لیں۔ اب ہمارے گرد بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ لال مونچھوں والے نے اپنا کارڈ ماہ پارا کو دیا کہ فلاں ہوٹل میں کل صبح دس بجے آئے۔ وہ اور تصویریں کھینچے گا کسی فارن میگزین کے لئے اور اس کا بہت اچھا معاوضہ دے گا۔ ماہ پارا فوراً راضی ہوگئی۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ لطیف بھائی سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ میں نے ماہ پارا سے کہا اس سے کہہ دے کل فون کر کے بتا دے گی کہ آسکتی ہے یا نہیں۔ چند منٹ بعد وہ لوگ چلے گئے۔ شام کو جب لطیف بھائی گھر آئے میں نے ان سے ذکر کیا۔ وہ بریلی کے پٹھان آدمی اور مولوی کے بیٹے ایک دم لال پیلے ہوگئے۔ کہنے لگے یہ لڑکی کا بربادی کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ تمھیں معلوم ہے یہ لوگ فارن رسالوں کے لئے کس قسم کی تصویریں کھینچتے ہیں؟ اگر تم کو اپنی اور ماہ پارا کی عافیت منظور ہے اور یہ بھی چاہتی ہو کہ اپنے خاوند پہ نان و نفقے کا دعویٰ کر سکو تو شرافت سے رہو۔ میں نے ایک جاپانی کے ہاں آیا گیری کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہاں چلی جاؤ۔ وہ لوگ کوارٹر بھی دیں گے۔ لڑکی ایوا کے کسی انڈسٹریل ہوم میں کام سیکھ سکتی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھ چکی ہے۔ کسی نرسری اسکول میں ملازمت مل جائے گی۔ میں کوشش کروں گا۔ میں نے اس شریف انسان کی بات مان لی اور ماہ پارا کو ہوٹل جانے کے لئے سختی سے منع کر دیا۔ مگر وہ صبح سویرے ہی چپکے سے بھاگ گئی اور پھر کبھی لالوکھیت واپس نہ آئی۔

آگے کی داستان بہت لمبی ہے مختصر کرتی ہوں۔ ماہ پارا کو اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں غیر ملکیوں کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ وہ کہاں رہتی تھی اور کیا کرتی تھی کسی کو معلوم نہیں۔ بہت دنوں بعد مجھے جاپانیوں کے ہاں فون کیا جہاں مجھے لطیف بھائی نے آپا کی نوکری دلادی تھی۔ میں نے اپنا نام مونا رکھ لیا۔ کوئی پرانا شناسا دیکھ بھی لے تو مونا آپا کو بھلا کیا پہچانے گا۔ میں نے آغا شب آویز ہمدانی کی تلاش جاری رکھی۔ جگہ جگہ فون کئے۔ معلوم ہوا کہ وہ اب مستقلاً لندن میں رہتے ہیں۔ تو پھر وہاں خط لکھے۔ اور حسبِ معمول جواب کا انتظار شروع کیا اور حسبِ معمول محروم رہی۔ ایک روز ماہ پارا نے بہت مضطرب آواز میں فون کیا کہ فلاں ہوٹل میں کوئی آغا ہمدانی طہران سے آکر ٹھہرے ہیں۔ میں تو ان سے ملنے نہیں جاؤں گی، تم ہو آؤ۔ شاید ڈیڈی ہوں۔ میں نے فوراً اپنی جاپانی میم سے چھٹی لی۔ برسوں بعد سنگھار پٹار کرکے اچھی ساری پہن کر دھڑکتے دل سے اس ہوٹل پہنچی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر آغا ہمدانی کے کمرے کا نمبر دریافت کیا۔ میرے حواس باختہ ہورہے تھے، رنگ فق تھا۔ کاؤنٹر کی لڑکیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ اتفاق سے اسی وقت آغا ہمدانی آگئے۔ وہ شب آویز کے بجائے ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ اب مجھے اتنی انگریزی نہ آئے نہ انھیں اتنی اردو۔ بہرحال میں نے ان سے پوچھا۔ آغا شب آویز ہمدانی کو جانتے ہیں کیسے ہیں؟ گفت۔ بالے بالے۔ خوبے۔ خوبے۔ لندن میں رہتے ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا۔ ان کی خانم اور میری خالہ شیراز میں ایک ہی دانش گاہ میں دانش جو تھیں۔ یک پسر دارد۔ وہی نام۔

پھر آغا ہمدانی تو ایران ایر کی کوچ کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے ماہ پارا کا فون آنے کے بعد شب آویز کے نام جو کھڑا لکھا تھا وہ پرس سے نکالا پرزے پرزے کرکے وہیں ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور ہوٹل سے باہر آگئی۔ اب سکون ہے۔ اب کسی چیز کا انتظار نہیں لیکن اب ماہ پارا کی فکر کھائے جارہی ہے۔ وہ مجھ سے بالکل برگشتہ ہوچکی ہے۔ کسی کو یہ کبھی نہیں بتاتی کہ میں اس کی ماں ہوں۔ کہتی ہے میں ایک آپا کو اپنی ماں کیسے بتاؤں۔ میرے پاس آکر کیوں نہیں رہتیں۔ کیوں ڈھائی سو روپے مہینے پر نوکرانی بنی اپنی اوقات کھو رہی ہو۔ میرے پاس پیسے کی کمی نہیں ـــــ لیکن ماہ پارا

کے ہاں دولت کی یہی فراوانی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ وہ ایک مشتبہ قسم کے ہوٹل میں رہتی ہے۔
اور طرح طرح کے مشتبہ لوگوں سے اس کی دوستی ہے۔ کبھی کہتی ہے اپنے ایک عرب فرینڈ کے ساتھ
بیروت جا رہی ہے۔ کبھی فون کرتی ہے کہ کیبرے ڈانس سیکھنے ہانگ کانگ جانے والی ہے۔ ہفتوں
مہینوں غائب رہنے کے بعد صورت دکھاتی ہے تو لگتا ہے کوئی فلم اسٹار آگئی۔ بڑھیا ولایتی کپڑے،
قیمتی عطر، نت نئے ہیر اسٹائل اور وگ، بے چارے بھائی لطیف خاں جو ورما صاحب کی طرح نیک دل
آدمی ہیں مجھ سے بے حد ناراض ہیں، کبھی ملتے بھی نہیں۔ اور میں کیا منہ لے کر ان کے گھر والوں سے
ملنے لالو کھیت جاؤں۔ ان سب کو ماہ پارا کے متعلق معلوم ہو چکا ہے۔ میں ماہ پارا سے ایک پیسہ
نہیں لیتی مگر وہ تو یہی سمجھتے ہوں گے۔

اب جب کہ آغا شب آویز کی طرف سے بھی مکمل ناامیدی ہو چکی ہے مجھے ماہ پارا کے ساتھ
رہنے میں کیا عار ہے۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔ کیا اماں، ہرمزی خالہ اور میں نے ساری عمر وہی
نہیں کیا جو اب ماہ پارا نہایت اعلیٰ پیمانے پر بڑے اسٹائل سے کر رہی ہے۔ میری جاپانی میم جسے
مجھ سے بے حد ہمدردی ہے مجھے بتایا کرتی ہے کہ ٹوکیو میں ایک پورا علاقہ بیحد شاندار گینسزا ڈسٹرکٹ
کہلاتا ہے جس میں جاپان کی ہزاروں ہزار لڑکی انہی اشغال میں مصروف ہے اور پرانے فیشن کی باوقار
گیشا گرلز کی جگہ لے چکی ہے۔

ٹھیک ہے۔ پھر مجھے ماہ پارا سے پیسے لیتے کیوں جھجھک آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ ہم لوگوں
نے "عزت" اور "وقار" کا ایک پردہ اپنے سامنے آویزاں کر رکھا تھا گو وہ پردہ ٹاٹ کا تھا اور ٹٹی دھوکے
کی۔ وہ دھوکہ ہم اپنے آپ کو بھی دیتے تھے اور دوسروں کو بھی اور وہ کیا انوکھی وضعداری تھی۔ حالانکہ
تمھیں معلوم ہے ایران میں "خانگی" طوائف ہی کو کہتے ہیں۔ اب ایک علی الاعلان "ہائی کلاس پارٹی گرل"
کی کمائی کھاتے مجھے شرم آتی ہے۔ کس قدر غیر منطقی اور بے تکی بات ہے۔ اور ماہ پارا کی طرف سے تشویش
بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری وہ تنگ و تاریک گلیاں محفوظ تھیں اور انسان اتنے درندے نہیں تھے۔
آج یہ باہر کی کھلی فضائیں اور یہ جگمگاتی دولت مند موڈرن دنیا بے حد پرخطر ہے اور انسان زیادہ

کمینے ہو چکے ہیں۔

بہرکیف، میں اپنی قسمت پر پیچ وتاب کھاتی ہوں اور شاید قسمت ہی سے انتقام لینے کی خاطر ماہ پارا سے کسی قسم کی مدد نہیں لیتی۔

ایک روز اتفاقیہ آغا فرہاد کی چھوٹی لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ میری جاپانی میم اپنی کسی امریکن سہیلی سے ملنے گئی تھیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ پڑوس کی عالی شان سہ منزلہ کوٹھی کے پھاٹک پر آغا فرہاد کے چھوٹے داماد کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ میری میم صاحب امریکنوں سے ملنے ان کے ہاں گئیں۔ میں باہر دھوپ میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے پڑوس کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ کوٹھی تھی کہ محل کا محل۔ جیسے امریکن رسالوں میں تصویریں ہوتی ہیں۔ برآمدے میں پہنچی۔ سنگِ مرمر کا فرش۔ اندر جھانکا سفید "وال ٹو وال" کارپٹ۔ نہایت بڑھیا فرنیچر۔ آغا فرہاد کی لڑکی سامنے ہی نظر پڑی۔ میں فوراً پہچان گئی۔ کئی بار لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ وہ سفید رنگ کے ٹیلی فون پر جھکی "چپن ڈیل۔ چپن ڈیل" کر رہی تھی۔ جی ہاں ہم نے سکنڈ فلور کے لئے چپن ڈیل کا فرنیچر آرڈر کیا ہے۔ تھرڈ فلور کے صرف چھ کمروں کے لئے کوئین آین فرنیچر چاہئے۔ جی ہاں۔ ہم نے سارا سامان یوروپ سے منگوایا ہے۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ درشتی سے پوچھا، کیا ہے؟ کیا چاہئے؟ —— میں نے کہا کچھ نہیں بیگم صاحب۔ آپ کی آیا سے ملنے آئی تھی۔ اس نے جواب دیا —— اُدھر جاؤ۔ اندر کہاں گھسی آتی ہو —— میں برآمدے سے اتر کر ٹہلتی ہوئی پھاٹک سے باہر آگئی۔

میری جاپانی میم بہت اچھی عورت ہے۔ اس نے کہا ہے یہ خط اپنی ماں کو ٹوکیو بھیج دے گی۔ اس کی ماں اسے تمھارے پتے پر انڈیا ری ڈائیریکٹ کر دے گی۔

خالہ خالو کو دست بستہ آداب۔ ورما صاحب اور صدف کو سلام۔ آفتاب بیٹے کو پیار۔ تمھیں پیار۔

جمیلن دعا کرو ماہ پارا راہِ راست پر آجائے۔ اب سنا ہے وہ اسمگلروں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ میں تو دعائیں مانگتے مانگتے بھی تھک کے چور ہو گئی۔

تمھاری بجیا

یہ خط بھی مکتوب الیہ کے پاس نہیں پہنچا۔ کیونکہ جاپانی میم نے اسے اپنی ماما سان کو ٹوکیو بھیجا۔ اور اس جاپانی ضعیفہ نے دوسری ڈاک کے ساتھ اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا اور اسے انڈیا پوسٹ کرنا بھول گئی۔

(۱۰)

پاکستان کے اردو اخباروں کی ایک سرخی ـــــ کلفٹن پر نوعمر حسینہ کا پراسرار قتل، قاتل مفرور ہیں۔ لڑکی کی لاش صبح چار بجے کے قریب ساحل پر پڑی پائی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی غالباً اسمگلروں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ماں ایک غیر ملکی کے ہاں گھریلو ملازمہ ہے۔ تحقیقات کے بعد جس وقت اس عورت کو لڑکی کی لاش شناخت کرنے کے لئے بلوایا گیا وہ ہسٹریائی انداز میں چلا چلا کر کہہ رہی تھی: "دراصاحب آپ کی امرآپالی مر گئی۔ دراصاحب آپ کی امرآپالی کو مار ڈالا ـــــ" اس وجہ سے یہ شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ دونوں ماں بیٹیاں بھارتی جاسوس تھیں۔ تحقیق و تفتیش جاری ہے۔

(۱۱)

پولیس کے مردہ گھر کا ایک منظر۔

"متوفیہ کے باپ کا نام؟" پولیس افسر پوچھتا ہے۔

"باپ کا نام ـــــ؟ قدرتِ خدا لکھ لیجئے۔"

"عجیب نام ہے۔"

"ہر نام عجیب ہوتا ہے۔"

"قدرتِ خدا بنگالی معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں متوطن کلکتہ۔ غالباً اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔"

"ان کی کیا قومیت تھی ـــــ؟"

"برٹش۔"

"مقتول کا پاسپورٹ نمبر ___؟"

"صفر ___ صفر ___ صفر"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ"

"لاش کا پاسپورٹ ___؟ زیرو ___ زیرو ___ زیرو ___"

"کیا اب پھر دورہ پڑنے والا ہے؟"

"لاش کا پاسپورٹ ___ ہاہا ___ سفر ہے دشوار۔ خواب کب تک ___ بہت بڑی منزل عدم ہے ___ ہاہا ___ نسیم جاگو۔ کمر کو باندھو ___ اٹھاؤ بستر ___ ابھی اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے" عورت اب گانا شروع کر دیتی ہے۔ پولیس کے لوگ اسے تعجب سے دیکھتے ہیں ___ "جوانی وحسن، جاہ ودولت ___ یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے۔ اجل ہے استادہ دست بستہ، نوید رخصت ہر ایک دم ہے ___ بسانِ دستِ سوال سائل تہی ہوں ہر ایک مدعا سے ___ تہی ہوں ہر ایک مدعا سے ___ تہی ہوں ہر ایک مدعا سے ___" عورت اب گراموفون ریکارڈ پر اٹکی ہوئی سوئی کی طرح بے تکان دہرا رہی ہے۔" سفر ہے دشوار ___ سفر ہے دشوار ___

"بہت بڑی منزل عدم ___ عدم ___ عدم ___ ابھی چھاپ تلک سب چھینی موسے نیہا لگائے کے ___ چھاپ تلک ___ خسروؔ نظامؔ کے بل بل جاؤں ___ بل بل بل بل بل بل" اس نے پھرکی کے مانند چکر لگانا شروع کر دیا۔ اس کا جوڑا کھل گیا اور لانبے بال شانوں پر بکھر گئے۔ اب وہ زبان نکال کر لٹو کی طرح گھومنے لگی ___ جیسے زندگی کے مرگھٹ پر کالی رقصاں ہو۔

دو سپاہی اسے بدقت پکڑ کر باہر ایمبولنس کی طرف لے گئے۔

(۱۲)

نورِ اسلام مسافر خانہ محمد علی روڈ بمبئی کے کلرک نے پوچھا ___ "پاکستانی؟" اور رجسٹر کھولا۔

"پتہ نہیں پاکستانی کہ ہندوستانی۔ دراصل جہنمی ___"

کلرک نے نووارد عورت کو تعجب سے دیکھا۔

"آپ نے مجھے پاکستانی کیوں سمجھا؟ ــــ کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے؟"

"جی نہیں۔ بیگم صاحب آپ چاروں طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے بعض پاکستانی جو پہلی بار یہاں آتے ہیں، ہر چیز کو شبہے کی نظروں سے ــــ"

"میں ساری دنیا کو شبہے کی نظروں سے دیکھتی ہوں ــــ کیا پتہ آپ بھی ابھی جاسوس سمجھ کر مجھے حوالات میں بند کروا دیں۔ دیوانی قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیں ــــ میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر میری لاش ساحل پر پھینک دیں۔ میرا زیور لُوٹ کھائیں۔ مجھے فریب میں مبتلا رکھیں۔ میرے منہ پر کالک پوت دیں۔ میں ہزاروں خط لکھوں، ایک کا جواب نہ دیں۔"

کلرک گھبرا کر منیجر کو بلانے کے لئے اٹھا۔

"گھبرائیے نہیں۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دیکھ لیجیے۔" اس نے پرس کھولا ــــ پھر بند کر دیا۔ "ایک فون کر سکتی ہوں ــــ؟"

"ضرور ــــ" کلرک نے کہا۔

عورت ٹیلی فون ڈائرکٹری میں نمبر تلاش کرنے لگی۔ چند منٹ بعد اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہلو ــــ ہلو ــــ شیخ طاؤس ہیں؟"

"جی میں حاضر ہوں۔ فرمائیے۔ کون صاحب؟"

"میں رشکِ قمر بات کر رہی ہوں۔"

"اوہو ــــ رشکِ قمر صاحبہ ــــ یہ عید کا چاند کہاں سے نکل آیا۔ سنا تھا آپ کراچی چلی گئی تھیں۔"

"جی ہاں۔ ابھی آج صبح دس بجے ہی وہاں سے واپس آئی ہوں ــــ"

پچیس برس قبل جب وہ آغا فرہاد کے ساتھ بمبئی آئی تھی شیخ صاحب کے ہاں کئی محفلیں رہی تھیں۔ شیخ طاؤس بھی اس زمانے میں افسانے لکھتے تھے اور شعر کہتے تھے۔ طاؤس تخلص تھا۔

عرصے سے ادب سے تائب ہو چکے تھے اور اب لوہے کے بڑے بھاری بیوپاری تھے مگر گاہے بگاہے ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے اور شاعروں وغیرہ کی سرپرستی فرماتے تھے۔ "تو فرمائیے کب ملیں گی"؟ انھوں نے پوچھا۔ "اتفاق سے غریب خانے پر کل ہی ایک نشست ہے۔ آپ کا قیام کہاں ہے"؟

"نورِ اسلام مسافر خانہ ــــ"

"اوہ ــــ"

اگر وہ ادبی رائٹر شیرٹن یا تاج میں ٹھیری ہوتی تو شیخ طاؤس کہتے میں خود کار لے کر آپ کو لینے آؤں گا۔ اب انھوں نے ذرا سرد مہری سے جواب دیا۔ "اچھا تو کل آپ سات ساڑھے سات تک آجائیے۔ میں ورلی سی فیس پر رہتا ہوں۔ آپ کو بس آسانی سے مل جائے گی۔ میرا پتہ لکھ لیجیے۔"

دوسری شام وہ مسافر خانے کے کلرک سے بسوں کے نمبر دریافت کر کے ایک بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔ بہت لمبا کیو تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ ایک غلط بس پر چڑھ گئی۔ وہ بمبئی کے راستوں سے نابلد تھی۔ غلط بس اسٹاپ پر اتر گئی۔ دوسری بس میں سوار ہوئی۔ اس نے حاجی علی پر اتار دیا۔ اس وقت تک وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ تازہ دم ہونے کے لئے سمندر کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک ٹاپو پر حاجی علی کی خوبصورت سفید درگاہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ جمعرات کی شام تھی اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ پانی میں بنے ہوئے طویل پختہ راستے پر سے گزرتے درگاہ کی سمت جا رہے تھے۔ اس نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ایک برقعہ پوش عورت سے ورلی سی فیس کا راستہ پوچھ کر پیدل چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ایک عالی شان عمارت کے سامنے پہنچی۔ شیخ طاؤس کا بڑھیا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔ ڈرائنگ روم میں محفل ناؤ نوش گرم تھی۔ رخشندہ قمر اپنے کھچڑی بالوں، معمولی ساری، بجھی ہوئی شخصیت کی وجہ سے میونسپلٹی کی اسکول ٹیچر معلوم ہو رہی تھی۔ بلکہ ان میں سے ایک نے تو پوچھ بھی لیا "کیا آپ کسی اسکول میں پڑھاتی ہیں"؟ صاحب خانہ اور القرائیشن ایبل بیگم طاؤس نے بھی کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہ کیا اور ایک دو غزلیں سن کر مہمانوں نے رسمی واہ واہ کے بعد نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی رہی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ لوگ ڈنر کے لئے اٹھے۔ اس وقت ایک صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ وہ دل ہی دل میں ان کی بہت مشکور ہوئی۔ وہ پلیٹیں لے کر اس کے ساتھ سمندر کے رخ ایک دریچے میں آ بیٹھے۔ وہ خانصاحب خانصاحب کہلا رہے تھے اور نہایت معقول اور بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی انھوں نے صاحبِ خانہ سے اجازت چاہی۔ "مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ایک جگہ پہنچنا ہے۔ میں کولابہ میں رہتا ہوں۔ آپ کہاں جائیں گی ؟" انھوں نے رشکِ قمر سے دریافت کیا۔

"محمد علی روڈ ـــــ"

"مجھے بھی ساؤتھ بومبے جانا ہے۔ لیکن راستے میں ذرا سا کام ہے۔ اس کے بعد آپ کو پہنچا دوں گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ؟"

وہ نیچے آ کر خانصاحب کی کار میں بیٹھی۔ خانصاحب نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"قمر صاحبہ ـــــ میں امپریساریو ہوں۔ ARTISTES میں DEAL کرتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ محض رسمی قسم کی شاعرہ نہیں پرفورمنگ آرٹسٹ ہیں یا رہ چکی ہیں۔ اور اس وقت کسی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔ کیا میں آپ کی کسی طرح سے مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ نے شاید سنا ہو۔ میں ایک زمانے میں ریڈیو پر گایا کرتی تھی۔"

خانصاحب نے کار چلاتے چلاتے چٹکی بجائی ـــــ "دیر یو آر ـــــ میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا ـــــ اگر آپ مناسب سمجھیں اپنی پریشانی کی وجہ بتلا دیں ـــــ یو سی ـــــ مسز قمر۔ میری جو لائن ہے اس میں میں نے آرٹسٹوں کی دکھی زندگیوں کے اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ میرے اندر ـــــ یوں کہنا چاہئے کہ اب ایک قسم کی وسعتِ نظر آ گئی ہے اور جس طرح انسان انسان کو ستاتا ہے اس کی کمینگی اور رذالت پر اب میں متحیر بھی نہیں ہوتا۔"

"نہیں میرے حالات تو ٹھیک ہیں۔ صرف سفر کی تکان ہے۔"

خوددار عورت ہے۔ خانصاحب نے دل میں سوچا۔ خاموشی سے راستہ طے کرنے لگے۔

میرین ڈرائیو پر سے گذرتے ہوئے انھوں نے گھڑی دیکھی اور کہا "آیئے کہیں چل کر کافی پی لیں۔"
وہ اوبیرائے شیرٹن پہنچے ـــــ ریسٹوران میں جاکر کافی کا آرڈر دیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے شریف اور زردمند آدمی ہیں۔ وربا اور لطیف خاں کی طرح۔ رشکِ قمر نے سوچا۔ پھر خود ہی بتانا شروع کیا۔

"میرے شوہر مجھے چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے۔ میں ان کے رشتے داروں کے پاس کراچی گئی۔ لڑکی کو لے کر۔ وہاں اس کی شادی کر دی۔ اب واپس آگئی ہوں۔"
جہاندیدہ خانصاحب اس کی آواز سے سمجھ گئے کہ وہ سچ نہیں بتا رہی۔ مزید کرید کر کے اسے مضطرب کرنے کے بجائے نرمی سے دریافت کیا "اب کیا ارادہ ہے؟"
"پتہ نہیں۔ لکھنؤ جاکر سوچوں گی۔"
"آپ قوالی گانا پسند کریں گی؟" پھر خود ہی فوراً خیال آیا کہ یہ اسٹیج پر غمزہ وادا کے ساتھ قوالی گانے کی عمر سے کافی آگے نکل چکی ہیں۔
رشکِ قمر نے مسکرا کر کہا "بہ ایں سن و سال میں قوالی گاؤں گی؟"
"کیوں نہیں؟" خانصاحب نے بات بنانے کی خاطر جواب دیا "شکیلہ بانو بھوپالی برسوں سے گا رہی ہیں۔ نور جہاں۔ رضیہ بانو۔ شکیلہ بانو اور نور جہاں تو انگلینڈ کا دورہ بھی کر چکی ہیں۔" پھر انھوں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی "آیئے چلیں۔ سامنے ہی جانا ہے۔"
وہ ہوٹل سے نکل کر نریمان پوائنٹ کے ایک تھیٹر ہال پر پہنچے جہاں "مجرا کیبرے کمبی نیشن" کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ وہ اندر گئے۔ اسٹیج پر ایک لڑکی سنہرا وگ پہنے انتہائی لچر رقص کر رہی تھی۔

"اسے بیلی ڈانس کی الف بے بھی نہیں آتی" ـــــ خانصاحب نے کوفت سے کہا۔
"اور لوگ اتنے مہنگے ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے آتے ہیں۔"
"جی ہاں زیادہ تر انڈر ورلڈ کے لوگ ـــــ اور گلف کے عرب ـــــ آیئے چلیں۔"

وہ اٹھ کر باہر آئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور سمندر کی اونچی لہریں ساحلی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر سناٹا طاری تھا۔ برساتی میں ایک آدمی اوورکوٹ میں چہرہ چھپائے چپ چاپ کھڑا تھا ـــــ اس نے رشک قمر سے فرنچ میں کچھ کہا۔ وہ گھبرا کر خانصاحب کے برابر دبک گئی

"بمبئی کی انڈر ورلڈ بہت خطرناک ہے۔ آئیے یہاں سے نکل چلیں ـــــ" خانصاحب بولے۔

"موسیو ـــــ مادام" ـــــ اس آدمی نے بے بسی سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا ـــــ "میں ماریشس سے آیا ہوں۔ ایک شخص نے میری جیب کاٹ لی۔"

خانصاحب اور رشک قمر سرعت سے کار میں جا بیٹھے۔ سامنے ایک نامی گرامی اسمگلر کی کیڈیلیک آکر رکی۔ وہ اپنے گرگوں کے ساتھ جھومتا جھامتا اترا ـــــ خانصاحب نے اپنی کار اسٹارٹ کی ـــــ "بمبئی کی انڈر ورلڈ ـــــ" انھوں نے دہرایا۔

"خانصاحب ـــــ میری بچی کراچی کی انڈر ورلڈ میں ماری گئی ـــــ" اس نے کہا اور بے اختیار رونے لگی۔

خانصاحب نے کار کی رفتار دھیمی کی اور نرمی سے بولے "مجھے پورا واقعہ بتلا دیجئے۔"

تب اس نے پوری داستان ان کو مختصراً سنائی۔

"ـــــ پھر سپاہی مجھے ہسپتال لے گئے اور جاپانی صاحب کو اطلاع کی۔ اس بیچارے نے مجھے ایک مینٹل ہوم میں داخل کروایا ـــــ الیکٹرک شوک لگائے گئے۔ چار پانچ مہینے علاج ہوا۔ جاپانی نے سارا خرچہ اٹھایا۔ وہ ٹوکیو لوٹنے والے تھے۔ مجھ سے کہا مجھے کسی اور جاپانی یا امریکن کے ہاں نوکر رکھوا دیں گے۔ تب ہی میرے پاس سقط سے پوسٹ کیا ہوا جمیلن کا چار سطروں کا پرچہ پہنچا کہ وہ سخت بیمار ہے اور اس کی دیکھ بھال اور مالی اعانت کے لئے کوئی موجود نہیں۔ میں رات بھر دن بھر روتی رہی۔ جاپانیوں نے میری یہ حالت دیکھ کر اور اس خط کی بنیاد پر میرے

لئے پروانہ راہداری کی تگ و دو کی۔ اس میں ایک سال لگ گیا۔ اجازت ملتے ہی میرے لئے جاپان کا ٹکٹ خریدا۔ ایرپورٹ پر مجھے خود پہنچانے آئے۔ میرا رواں رواں جاپانی میاں بیوی کو دعائیں دیتا ہے۔

" روانگی سے ایک دن قبل ماہ پارا کو خدا حافظ کہنے قبرستان گئی تھی۔ بہت دیر تک اس کی کچی قبر کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اچانک بہت گہما گہمی شروع ہو گئی۔ کسی وی آئی پی کا جنازہ لایا جا رہا تھا۔ ٹیلی ویژن کیمرے، پریس رپوٹر، پھولوں کی بڑی سیاہ ربنوں والے ریتھ، سفید شفون اور جارجٹ کی ساریاں سفید سینڈلز پہنے، سفید پرس سنبھالے سیاہ چشمے لگائے، ہلکا میک اپ کئے، نفاست سے سر ڈھانپے سوگوار بیگمات۔ میں بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لئے اٹھی۔ رستے میں جنازے کے جلوس میں آئی ہوئی شاندار امپورٹڈ کاروں کی اتنی طویل قطار تھی کہ میں ان کے گذرنے کے انتظار میں سڑک کے کنارے ایک سنگ میل پر بیٹھ گئی۔ ایک کار میں سے ایک سفید شفون کی ساری اور سیاہ چشمے والی بیگم اتریں۔ مجھے کوئی بھکارن سمجھ کر میرے سامنے چند سکے پھینکے۔ بلجیم کی لیس کے سفید نازک رومال سے اپنی ناک کی نوک چھوتی آگے بڑھ گئیں۔"

" رشکِ قمر — آپ نے ابھی بتلایا تھا کہ آپ کا ایک لڑکا بھی ہے۔"

" جی ہاں۔ اسے اسکول میں پڑھانے کے لاکھ جتن کئے لیکن وہ لکھنؤ کی گلیوں میں آوارہ گردی کا شوقین تھا۔ اب کراچی میں کسی لکھنؤ سے آنے والے نے بتایا تھا کہ وہ بمبئی میں داداگیری کر رہا ہے۔ میں کل صبح سے جب سے یہاں پہنچی ہوں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں، شاید وہ کہیں نظر آجائے مگر ایسے اتفاقات صرف ہندوستانی فلموں میں ہوتے ہیں۔"

کار اب نور اسلام مسافر خانے بھنڈی بازار پہنچ چکی تھی۔ خانصاحب نے آہستہ سے کہا " آپ پاکستان سے تو کچھ روپیہ ساتھ لا نہ سکی ہوں گی۔"

" ایک پیسہ نہیں۔ میرے ہاتھ میں یہ دو سونے کی چوڑیاں ہیں۔ کل صبح انھیں فروخت

کر کے لکھنؤ کا ٹکٹ خریدوں گی۔ مسافر خانے کا کرایہ بہت سستا ہے۔ صرف تین روپے روز۔"
خانصاحب کا ہاتھ ان کے کوٹ کی جیب کی طرف گیا ـــــ "میں اگلے ہفتے اجمیر کے قوالوں کی ایک پارٹی کو لے کر مڈل ایسٹ اور انگلینڈ کے دورے پر جا رہا ہوں۔ اس کی وجہ سے بہت زیادہ اخراجات درپیش ہیں۔" انھوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔
کھسکے ڈبل ـــــ کھسکے ڈبل ـــــ کھسکے ڈبل ـــــ رشکِ قمر عرف قمرن عرف میلے والی لڑکی نے دل میں دہرانا شروع کیا۔ خانصاحب نے کہا: "اس وقت صرف اتنا ہی پیش کر سکتا ہوں۔ ایک مخلص دوست کی طرف سے قبول کیجیے۔" اور بٹوے میں سے چند نوٹ نکالے۔

(۱۲)

پڑوس کی مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی جس وقت وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اپنے آنگن میں داخل ہوئی۔ سامنے امرود کی ایک ٹہنی سے سائیکل رکشا کے پرانے ٹیوب اور ٹائر لٹکے نظر آئے۔ باورچی خانے کے آگے تین چار بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت نے کھپریل میں سے آواز دی ـــــ "کون ہے؟" ـــــ اسباب ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ "جمیلن ـــــ جمیلن" پکارتی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ جلدی میں دہلیز سے ٹھوکر لگی۔ انگوٹھے میں چوٹ آگئی۔ اندر اسٹول پر رکھی لالٹین اندھی اندھی جل رہی تھی۔

"جمیلن ـــــ خالہ ـــــ ہم آگئے ـــــ"

بیحد بوڑھی، سوکھی لقاط ہرمزی خالہ میلے کچیلے بستر پر سے دھوئیں کی پتلی لکیر کی طرح اٹھیں، ان کے برابر بچھا جمیلن کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ اس کی بیساکھی کمرے کے ایک کونے میں رکھی تھی۔ رشکِ قمر کا دل دھک سے رہ گیا۔
"خالہ تسلیم ـــــ" وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر خالہ سے لپٹ گئی۔ وہ پھُسر پھُسر رونے لگیں۔
"خالہ۔ جمیلن ـــــ کہاں ہے؟"
عورت باورچی خانے سے نکلی۔ اپنے بچوں کے ساتھ مل کر رشکِ قمر کا اسباب ڈیوڑھی سے

اٹھایا اور اسے لاکر برآمدے میں چُن دیا۔ خود میلی اوڑھنی سے پسینہ پونچھتی دہلیز میں آکھڑی ہوئی اور گھر کی نو وارد مالکن کو دیکھنے لگی۔

"خالہ ـــ جمیلُن ـــ؟" رشکِ قمر نے دہل کر دہرایا۔

"اللہ کے گھر گئی۔" بیٹرن. خالہ نے روتے روتے جواب دیا۔ "اس کے دونوں پاؤں بے کار ہو گئے تھے ـــ مولانے اس کی مشکل آسان کی۔"

"جمیلُن بٹیا تو بالکل ہل جُل نہیں سکتی تھیں۔ یہ داگدر بلاکر لائے۔ وہ بولا سارے بدن کو یہ ہو گیا ہے۔ گٹھیا ہو گئی ہے۔ جوڑ جوڑ جکڑ گیا ہے ـــ" دروازے میں کھڑی عورت نے کہا۔

رشکِ قمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آخر وقت تک اس نے تمہارا انتظار کیا۔ اسے تو مرے بھی اب ایک سال ہو جائے گا۔" خالہ بولیں۔

رشکِ قمر گم صم باری باری ان دونوں کی صورتیں دیکھا کی۔ ایک آنسو آنکھ سے نہ ٹپکا۔ اس نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں پوچھا۔ "خالہ ـــ تم نے ہمیں اطلاع بھی نہ بھیجی۔"

"بیماری کی اطلاع تو بتول کا دیور مسقط جارہا تھا، اس کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ وہ بھی وہاں پہنچ کر لاپتہ ہو گیا۔ ہمارا کون سگا ولایت میں بیٹھا ہے جس کے ذریعے خط و کتابت کرتے۔"

رشکِ قمر سر جھکائے جمیلُن کے خالی کھرّے پلنگ کو تکتی رہی۔ تعجب کی بات ہے جمیلن کی موت کی خبر پر میری آنکھوں سے ایک آنسو نہیں گرا۔ کیا ماہ پارا کی وفات ـــ نہیں قتل ـــ پر آنسوؤں کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔ میں روئی نہیں تو جیوں گی کیسے۔ اچانک اسے چمن خالو یاد آئے۔ شاید ابھی نماز پڑھ کر مسجد سے نہیں لوٹے۔

"خالہ ـــ خالو کیسے ہیں؟"

"کون ـــ تمہارے خالو ـــ ان کو مرے پانچ سال ہو گئے۔ جمیلُن مرحومہ نے تمھیں مفصل خط میں اطلاع دی تھی ـــ"

"مجھے کوئی خط نہیں ملا خالہ ـــــ کہیں سے کوئی خط نہیں آیا میرے نام۔"

مُہر مزی خالہ۔ جُمَّن خالو۔ رشک قمر لکھنوی۔ جمیل النسا بیگم عرف کماری جل بالا اُہری ـــــ
ماہ پارا خانم ـــــ ہم سب ایک دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھنسے ہوئے تھے۔ دلدل میں پھنسا آدمی باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، روتا نہیں۔ اسے رونے کی فرصت نہیں ہوتی وہ دلدل سے نکلنے کی کوشش میں جُٹا رہتا ہے ـــــ جمّن خالو۔ جمیل النسا۔ ماہ پارا خانم تینوں دلدل میں دھنس گئے۔ اس نے اپنی خشک آنکھوں پر انگلیاں پھیریں۔

"جمیلُن ـــــ کب ـــــ کیسے مری ـــــ خالہ ـــــ؟"

"آدمی کیسے مرتا ہے بِٹیا ـــــ؟ بس مر جاتا ہے۔ جمیلُن نے رات کے وقت دم توڑ دیا۔ تاریخ اور مہینہ ہمیں یاد نہیں۔ بھری برسات تھی۔ گھر میں کفن دفن کے لئے ایک پیسہ نہیں تھا لفاتی کہیں سے بیس روپے قرض لائے۔ کہنے لگے محلے والوں سے چندہ کر لوں۔"

"لفاتی کون ـــــ؟"

"حفیظن کے میاں ـــــ رکشا چلاتے ہیں۔ جمیلُن نے کرائے دار رکھ لیا تھا۔ جب سے وہ پلنگ سے لگی گانے کے لئے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ وِرا صاحب اور صدف آرا امداد کرتے رہتے تھے۔ وِرا شادی کر کے لکھنؤ سے اڑنچھو ہوئے۔ صدف کسی گورے کے ساتھ ولایت چلی گئیں۔ لفاتی نے کہا مسجد میں جا کر چندہ جمع کریں۔ ہمارا دل نہ مانا۔ آنکھ پہ ٹھیکری رکھ کر انھیں آغا فرہاد کے ہاں بھجوایا۔ بارش کہے آج برس کے پھر نہ برسوں گی۔ فرہاد میاں خود بیمار پڑے تھے۔ انھوں نے اپنے منشی کے ہاتھ پیسے بھجوائے۔ سب کفن دفن کا انتظام اس نے کیا۔ موسلا دھار بارش میں لے جا کر غریب کی مٹی عزیز کی۔"

"اب گذر کیسے ہوتی ہے ـــــ؟"

"جمیلُن مرحومہ پڑے پڑے چکن کاڑھ کر بیس روپے مہینہ پیدا کر لیتی تھی۔ پندرہ روپے مہینہ لفاتی کرایہ دیتے تھے۔ اب جمیلن کے مرنے کے بعد کرائے کے بجائے ہمیں دو وقت دال بھات

کھلا دیتے ہیں۔ رکشا کھینچتے کھینچتے ٹی۔بی ہوگئی ہے پھر بھی ان کی پوری نہیں پڑتی۔ چار بچے، دو میاں بیوی۔ اب بے چارے، ہمیں بھی سال بھر سے کھلا رہے ہیں۔ شکر ہے تم یہ مکان خرید گئی تھیں ورنہ اس کا کرایہ کہاں سے ادا ہوتا ــــ" دفعتاً ان کو ماہ پارا یاد آگئی پوچھا "اے قمرن ــ بٹیا کہاں ہیں ــــ وہ ساتھ نہیں آئیں ـــ؟"

"ماہ پارا کی کراچی میں شادی کردی ہے خالہ ــــ بہت اچھا لڑکا مل گیا۔ نیک۔ شریف۔ تعلیم یافتہ۔ اچھی تنخواہ پاتا ہے۔" رشکِ قمر نے کرخت آواز میں جواب دیا۔

"شکر ہے ــــ مولا تیرا شکر ہے۔ الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" وہ پلنگ سے اٹھنے لگیں۔

"کہاں جارہی ہو ـــ؟"

"جب ماہ پارا پیدا ہوئی تھی تب سے چودہ رکعت نماز مان رکھی ہے کہ اس کی شادی ہوجائے۔"

"تو اب کہاں چلیں ـــ؟"

"وضو کرنے ـــ"

"خالہ ـــ لیٹ جاؤ۔ کل پڑھ لینا۔" اس نے ہرمزی بیگم کو پھر بستر پر لٹا دیا۔ وہ وفورِ مسرت سے دوبارہ اٹھ بیٹھیں ــــ رشکِ قمر نے ان کا دھیان بٹانے کے لئے پوچھا ــــ "تم کہہ رہی تھیں آغا فرہاد بیمار پڑے ہیں ـــ"

"ارے انھیں کوئی جان لیوا مرض لگ گیا ہے۔ بڑے داماد کے پاس علاج کے لئے ولایت گئے ہیں۔ بڑا داماد وہاں ڈاکٹر ہے۔ بیوی اور منجھلی بیٹی داماد بھی ساتھ گئے ہیں۔ چلتے وقت دو سو روپے بھجوا گئے تھے اور تمھارے نام ایک بڑا لفافہ تھا۔ ابھی دیتے ہیں۔ ذرا لالٹین اٹھانا۔"

ہرمزی خالہ نے پھر اٹھنا چاہا۔

"خالہ مجھے بتاؤ میں ڈھونڈ لوں گی ـــ"

"وہ سا بکسا کھینچنا ـــ"

قمرن نے ہمیلن کی چارپائی کے نیچے سے سرخ ٹین کا پھول دار پرانا بکس کھینچ کر باہر نکالا۔

اس میں جمیلن کے کپڑے رکھے تھے۔ وہ آغا فرہاد کا لفافہ ڈھونڈنے کے لئے کپڑے نکال نکال کر فرش پر رکھتی گئی۔ ٹرنک کی تہ میں پرانا اخبار بچھا تھا۔ اس کے نیچے سے گلابی پلاسٹک کے دو کلپ نکلے جو اس نے مدتیں گذریں پیر ہنڈے شاہ کے عرس میں چار چار آنے میں اپنے اور جمیلن کے لئے خریدے تھے۔ ان کو کچھ دیر تک تکتی رہی۔ خالہ کی آواز پر چونک اٹھی۔ اب وہ کہہ رہی تھیں "آفتاب بھی غائب ہوگیا۔ بمبئی بھاگ گیا۔"

رشکِ قمر پھر آغا فرہاد کا لفافہ تلاش کرنے میں مصروف ہوئی۔ وہ جمیلن کے ایک ادھ بُنے سوئیٹر کے نیچے رکھا ملا۔ بہت بھاری تھا قمرن کے دل میں روشنی سی پیدا ہوئی۔ شاید نوٹوں کی گڈی بھجوا گئے ہوں۔ جلدی سے جمیلن کی کھاٹ پر آبیٹھی۔ اسٹول کھینچ کر قریب رکھا۔ لالٹین کی بتی اونچی کی۔ لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ ایک مراکو لیدر کی نفیس بیاض برآمد ہوئی اور ایک خط۔ اس نے خط پڑھنا شروع کیا:

رشکِ قمر!

ہم جمیل النساء مرحومہ کی تعزیت تم سے کن الفاظ میں کریں۔ ہمیں تمہارا کراچی کا پتہ معلوم نہیں ورنہ وہاں خط بھیجتے۔ چاہے تم جواب نہ دیتیں۔ پچیس سال گذر گئے لیکن ہم تمھیں بھولے نہیں۔ جو تمھاری ہماری قسمتوں میں لکھا تھا سو پورا ہوا۔ تمھیں لکھنؤ سے گئے بھی پانچ چھ برس ہونے آئے۔ تمھارے جانے کے بعد ہم نے جمیل النسا کو کئی بار مالی امداد کرنا چاہی انھوں نے ہمیشہ روپے واپس کردیئے۔ اس قدر کی غیور لڑکی ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ ساری عمر زندگی سے لڑتی رہی پھر موت سے لڑائی۔ آخر میں دونوں سے ہار گئی۔ اللہ تعالیٰ اسے دوسری دنیا ہی میں آرام اور چین نصیب کریں۔

رشکِ قمر! پچھلے چند برسوں میں تم ہمیں بے طرح یاد آئیں۔ اب ہم بھی بڈھے ہو چلے۔ بیوی اپنے میکے اور سسرال کی سیاست میں مشغول رہتی ہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں۔ اللہ نے ہمیں گھر بار، اولاد، دولت، آسائش سب کچھ دیا۔ دل کا چین نہ دیا۔ ہم نے تمھارے لئے بہت

سی غزلیں کہیں۔ سب ایک بیاض میں لکھتے گئے۔ اس امید پر کہ شاید یہ کبھی تمھارے ہاتھ میں پہنچ جائے۔ شاید تم کبھی لکھنؤ لوٹ آؤ۔ پبلک کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر تم واپس آؤ اور مشاعروں میں مدعو کیا جائے (اب ہماری سوسائٹی بھی کافی وسیع النظر ہو چکی ہے) تو یہ غزلیں تمھارے کام آئیں گی۔

اور کیا لکھیں رشکِ قمر! ڈاکٹروں نے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ ہم اپنے بڑے داماد کے پاس بغرض علاج لندن جا رہے ہیں۔ اب کیا اچھے ہوں گے اور کیا زندہ واپس آئیں گے۔ رشکِ قمر اب خدا حافظ۔ اگر ممکن ہو ہمیں معاف کر دینا۔

تمھارا آغا فرہاد

(۱۴)

بمبئی والے خانصاحب کی دی ہوئی رقم میں سے اب صرف دس روپے باقی تھے۔ رشکِ قمر صبح کو پرانی عادت کے مطابق ڈاکیئے کے انتظار میں ڈیوڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد اچانک خیال آیا۔ میں بھی کتنی بڑی اُلّو کی پٹھی ہوں۔ اٹھارہ انیس برس لندن کے خط کا انتظار کیا۔ اب تو سب طرف سے ہمیشہ کے لئے چھٹی ——— وہ آنگن میں واپس آئی۔ بفاتی کی بیوی حفیظن باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ بفاتی صبح صبح کاڑھا چار اور ایک سخت لکڑ توڑ پاؤ کا ناشتہ کر کے رکشا لے کر باہر جا چکے تھے۔ بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ خالہ اندر پلنگ پر پڑی کھانس رہی تھیں۔ رشکِ قمر کھپریل میں آ بیٹھی اور سوچنے لگی۔ اب کیا کروں؟ آغا فرہاد کی بیاض یاد آئی۔ اندر سے اسے نکال کر لائی۔ ورق پلٹے۔ ہر غزل کے مقطع میں قمر تخلص موجود تھا۔ اس نے بیاض بند کی۔ تب ایک بڑا سا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک کر کتاب کی عنابی جلد پر ٹپ سے گرا۔ وہ کچھ دیر تک سوچا کی پھر اٹھ کر کپڑے بدلنے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔

بفاتی دوپہر کو کھانا کھانے ہانپتے کانپتے گھر لوٹے۔ رشکِ قمر نے کھانے کے بعد ان سے پوچھا "بفاتی ہمیں ذرا منصور نگر تک لے جاؤ گے؟"

"رو رہ بٹیا ــــ چلئے "

وہ باہر آکر رکشا میں بیٹھی ــــ وکٹوریہ اسٹریٹ ، فرنگی محل ۔ چوک ۔ اکبری دروازہ ۔ غلام حسین کا پل ۔

" محرم آنے والا ہے ۔ سنا ہے اس سال بھی شیعہ سنی سر پھٹول ہوگا " بقاتی نے رکشا چلاتے چلاتے اظہار خیال کیا ۔

" اب بھی برابر ہوتا ہے ؟ "

" ہر سال ، اور بہت زوروں میں ۔ ابھی تین چار برس ادھر کی بات ہے بٹیا ۔ ایران سے کچھ لوگ آئے تھے ۔ اپنے ٹیلی ویژن کے لئے لکھنؤ کے محرم کی پکچر بنانے ۔ یہاں پہنچے ۔ یہاں ہو رہی تھی زبردست جنگ شیعہ سنی کی ۔ الٹے پاؤں واپس گئے ۔ "

منصور نگر پہنچ کر وہ ایک پرانے مکان کے سامنے اتری ۔ بیٹھک کے دروازے پر پہنچی ۔ اندر رورماصاحب اور آغا فرہاد کے ایک متمول شاعر دوست اپنے حواری موالیوں کے ساتھ بیٹھے چار پی رہے تھے ۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا ۔

" اوہو ــــ بی رشکِ قمر ــــ آپ کب تشریف لائیں " وغیرہ وغیرہ ۔ مزید چار اور ناشتہ منگوایا گیا ۔ رشکِ قمر نے ریل سے اترنے کے بعد سے اس وقت تک پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا ۔ دل چاہ رہا تھا سامنے رکھی ساری نعمتیں چٹ کر جائے ۔ بڑی ہمت سے ہاتھ روکا ۔ باتوں باتوں میں پوچھا " آج کل مشاعرے کہاں کہاں ہو رہے ہیں ؟ "

" ایک تو پرسوں شام ہی کو ہے ۔ اتوار کے روز قیصر باغ کی بارہ دری میں آپ آئیں گی ؟ "

" آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے "

" بات یہ ہے کہ اب ہم تو اس کی انتظامیہ کمیٹی سے الگ ہو گئے ہیں ۔ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب اس کے سکریٹری سے کہہ دیں گے ۔ ارے میاں طاہر ــــ "

طاہر میاں تولیہ سے منہ پونچھتے اندر سے نکلے ۔ جھک کر رشک قمر کو تسلیمات عرض کی ۔

"طاہر میاں! بی رشکِ قمر صاحب کو اپنے مشاعرے میں بلوالو — تم تو بچے تھے۔ ہمیں ان کا پڑھنے کا انداز اور آواز اب تک یاد ہے۔"

"بہت خوب بھائی جان۔ ہم انتظام کردیں گے۔"

"کس وقت شروع ہوگا مشاعرہ —؟" رشکِ قمر نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم آدمی بھیج کر آپ کو بلوالیں گے۔ اپنی کار بھیج دیں گے۔ مکان کا پتہ بتلا دیجئے —" طاہر میاں نے فرمایا۔

اتوار کی صبح سویرے سے اس نے مشاعرے کی تیاریاں شروع کیں۔ ٹرنک کھول کر ساریاں دھوپ میں ڈالیں۔ بلاؤز پر استری کی۔ بال سیاہ رنگے۔ سہ پہر کو آغا فرہاد کی بیاض نکال کر دو تین غزلیں منتخب کیں۔ ان کے ترنم کی دھنیں بٹھاتی رہی۔ حفیظن سے کہا کھانا سات بجے تک تیار کر دے۔ رشکِ قمر نے کافی عرصہ قبل مکان میں بجلی منگوائی تھی جو اس کے جانے کے بعد بل ادا نہ ہونے کی وجہ سے کاٹ دی گئی تھی۔ سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے اس نے آنگن میں بیٹھ کر میک اپ کیا۔ کراچی میں خریدی ہوئی امریکن نائیلون کی ایک پھولدار نیلی ساری باندھی۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور طاہر میاں کی کار کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ آٹھ بجے۔ ساڑھے آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ ساڑھے گیارہ۔ اسے مشاعرے میں لے جانے کے لئے کوئی نہ آیا۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے بقاتی کو آواز دی۔ وہ برآمدے میں بیٹھے رکشا کے ٹائر میں ہوا بھر رہے تھے۔

"بقاتی" اس نے ان کے قریب جا کر کہا۔ "جمیلن مرحومہ کس ٹھیکیدار کے لئے چکن کاڑھتی تھیں۔ جانتے ہو —؟"

"جی ہاں۔ جانتے ہیں بٹیا۔"

وہ باہر آکر ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ حفیظن نے جھنجھٹ کی آرٹسٹک پیالی میں چائے پیش کی۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہ کہاں سے آئی —؟"

"صدرف بٹیا چلتے وقت اپنے برتن دے گئی تھیں۔ سب بک گئے۔ یہی پیالی باقی بچی ہے۔"
حفیظن نے کہا۔

"صدرف بٹیا اور ان کا امریکن خاوند جاتے وقت پیسے بھی دے گئے تھے وہ ایک مہینے کے اندر جمیلن بٹیا اور خالہ کے علاج میں اڑ گئے۔" بفاتی سر اٹھا کر بولے ــــ "امریکہ جاتے وقت صدرف آرا، تو بینک میں ان کا کچھ روپیہ تھا، وہ جمیلن بٹیا کے نام کرنے والی تھیں۔ بٹیا نے ان کو بہت سمجھایا کہ وہ یہ حماقت نہ کریں۔ کل کلاں انھیں لکھنؤ واپس آنا پڑا تو ضرورت ہوگی۔ وہ نہ مانیں۔ مگر عین وقت پر گاؤں سے ان کے لٹھ بند باپ بھائی آن پہنچے کہ اس روپے پر ہمارا حق ہے۔"

"صدرف چلتے چلتے کہہ گئی تھیں کہ امریکہ سے روپیہ بھیج دیں گی مگر جمیلن بٹیا ہی نہ رہیں۔"
حفیظن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشکِ قمر اسی طرح دل کڑا کئے سنا کی۔

"پھر بٹیا کی بیماری کی خبر سن کر آغا فرہاد نے اپنے آدمی کے ہاتھ پیسے بھجوائے وہ انھوں نے لوٹا دیئے۔ دوسری بار پھر ان کا سکتر پیسے لایا۔"

"آغا فرہاد کے ہاں اب سکتر بھی ہے؟" رشکِ قمر نے پوچھا۔

"پورا عملہ ہے۔" بفاتی نے اپنی نئی نویلی سائیکل رکشا کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔
"لاکھوں کا کاروبار ہے۔ شاہجہاں پور میں غالیچے بنانے کا کارخانہ تو ان کا بہت برسوں سے چل رہا ہے۔ سیتاپور میں فارم لیا ہے۔ جائداد کا کرایہ الگ آتا ہے۔ یہ بڑی جنگی کوٹھی بنوائی ہے۔ مگر خدا کی شان۔ اتنی دولت اور نام چلانے کے لئے لڑکا ایک نہیں۔ سب کچھ دامادوں کو ملے گا۔"

رشکِ قمر چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اسی مکان میں آغا فرہاد کا فرزند تولد ہوا تھا اور ورما صاحب نے فوراً اس کا نام نادر فرزین رکھ دیا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر جاتا رہا۔ آج پچیس برس کا کڑیل جوان ہوتا ــــ لیکن اگر زندہ رہتا تو بھی کیا ہوتا ــــ کچھ بھی نہیں۔ آفتاب تو زندہ ہے ــــ میری بدقسمتی ناقابلِ یقین ہے۔

حفیظن بالٹی اٹھا کر نل پر چلی گئیں ۔ رشکِ قمر نے جمیلن کے خالی پلنگ پر نظر ڈالی۔
جمیل النساء تمھیں تمھاری خودداری نے ہلاک کیا ـــــ اسے یاد آیا جمیلن کو آغا فرہاد سے تب سے نفرت ہوگئی تھی جب اس نے نادر فردین کی ولادت کے بعد سوئنگ بر ڈز کلب میں فرہاد کو ورما سے یہ کہتے سن لیا تھا کہ اس طبقے کی چھوکریوں کے پاس بلیک میل کا یہ سہل ترین نسخہ ہے۔ کسی آئے گئے کی اولاد کسی مالدار شناسا کے سر منڈھ دی ۔ قمرن کے پاس ثبوت کیا ہے؟ آغا فرہاد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی ۔ وہ اپنی تیز مزاج رئیس زادی دبنگ بیوی سے بہت ڈرتے تھے اور سماج کے LOWEST OF THE LOWLY سے ان کی ہمدردی ہوا ہو چکی تھی لیکن نادر فردین کے مرنے کے بعد اپنے اس رویئے پر شدت سے نادم تھے ۔ رشکِ قمر سے ملنا جلنا چھوڑ چکے تھے مگر دو سو روپے ماہوار "پنشن" مقرر کر دی تھی جو اس نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی کہہ کر تشکر یے کے ساتھ قبول کی تھی لیکن بلا کی ذہین اور اپاہج جمیلن اس پروفیشن میں کبھی داخل ہی نہ ہوئی تھی اور پلنگ پر پڑی پڑی اپنے صاف و شفاف ذہن سے دنیا کو آر پار دیکھا کرتی تھی۔ آغا فرہاد کے ان جملوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا ۔

" پھر کیا ہوا لفاتی ـــــ ؟" رشکِ قمر نے پوچھا۔

" فرہاد میاں نے تیسری بار روپے بھجوائے تو ہم نے چپکے سے لے کر رکھ لئے کہ ان کے لئے اچھا ڈاکٹر بلوائیں گے ۔ اچھا کھانا پکوایا کریں گے ۔ گھر کی حالت سدھرے گی ۔ پوچھیں گی کہہ دیں گے لاٹری نکل آئی ہے یا کسی سے قرضہ لیا ہے ۔ مگر ہمارے ایک بچے نے بھولے سے ان کو بتلا دیا ۔ بہت بگڑیں چلائیں ۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔ بٹیا ہم آپ کو فاقے کرتے ، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتے ۔

" ہماری رکشا ٹوٹ گئی تھی ۔ انھوں نے ہمارے بچوں کی قسم دے کر ہم سے کہا اس رقم سے نئی رکشا خرید لو ۔ ہم تو مرنے ہی والے ہیں ۔ تمھیں رکشا کے ذریعے اپنے کنبے کا پیٹ بھرنا ہے ۔ مجبوراً ہم نے یہ رکشا خریدی جو پیسے بچے اس سے بٹیا نے ہمارے بچوں کے کپڑے بنوا دیئے ۔ ارے وہ انسان تھیں کہ فرشتہ ۔ مگر ضدی ایسی کہ ہسپتال میں بھرتی ہونے کو آخر دم تک تیار نہ ہوئیں ۔

"جب تک چل پھر سکتی تھیں گانے کے پروگرام مل جاتے تھے۔ پلنگ سے لگ گئیں تو چکن کاڑھنے لگیں۔ اس میں بیس روپے کما لیتی تھیں۔ بٹیا بھوک سے مریں۔ ہم جو دال بھات کھاتے تھے وہی انھیں کھلاتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے وہ بھوکی رہتی تھیں۔ کہتی تھیں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر ہمیں نہ کھلاؤ۔ دو نوالے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتیں کہتیں ہمارا ہاضمہ خراب ہے۔ لالٹین کی روشنی میں چکن کاڑھتے کاڑھتے سو جاتیں۔"

رشکِ قمر پتھر کا بت بنی سنتی رہی۔ بفاتی رکشا کو جھاڑ پونچھ کر چلنے کے لئے تیار ہوئے پھر خود ہی بولے "یہ رکشا خرید کر ہم آغا فرہاد کو بتلا آئے تھے کہ بٹیا نے پیسے اب بھی نہیں لئے ہم کو دے دیئے۔"

"بفاتی جمیلن کے ٹھیکیدار سے ہمارے لئے کام لا دو۔"

"بٹیا۔ آپ ریڈیو پر گائیے۔ پہلے تو گاتی تھیں۔"

"اب ہماری آواز ریڈیو کے لائق نہیں رہی۔ ہم یہاں تھے جب ہی بہت عرصے سے گانا چھوڑ چکے تھے —— چکن بنانے کا ریٹ آج کل کیا ہے —— ؟"

"کرتوں کی ترپائی فی کرتا دس پیسے۔ ایک ساری کے پانچ دس یا پندرہ روپے۔ بھاری کام کے بیس پچیس۔ ایک نیا پیسہ فی مرّی پتّی۔ ایک آنہ فی پھول پکّی کڑھائی۔ پتّی میں جالی بنانے کا ایک نیا پیسہ۔ ایک نیا پیسہ فی شیڈو ورک۔ ایک نیا پیسہ فی بوٹی۔ ایک عورت ایک ساری نہیں بنا پاتی۔ ایک گھر میں مُرّی پتّی بنے گی۔ دوسرے میں شیڈو ورک۔ تیسرے میں بیل۔ جمیلن بٹیا مُرّی پتّی بناتی تھیں۔ بٹیا یہی ساریاں بازار میں اور فارن میں جا کر سینکڑوں میں بکتی ہیں۔ کاریگر بھوکے مرتے ہیں۔"

٭

دوسرے روز صبح ساڑھے نو بجے ٹھیکیدار چار کرتے، ایک سفید ساری اور سفید دھاگہ لے کر ڈیوڑھی پر آیا۔ قمرن نے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے سارا سامان لیا۔ ٹھیکیدار نے دھاگہ

ناپ کر دیا کہ عورت کہیں دو تین گز اپنے پاس نہ رکھ لے۔ پھر وہ بقچہ سنبھال کر پڑوس کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

قمرن کھپریل میں آئی۔ بوسیدہ تخت کو جھاڑن سے خوب اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر چادر بچھائی اور ساری اپنے سامنے پھیلا کر اس پر چھپے ہوئے بیل بوٹوں کو غور سے دیکھا۔ سوئی میں سفید دھاگہ پرویا۔ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ساری کا آنچل گھٹنوں پر پھیلایا اور بوٹا کاڑھنا شروع کیا۔

تب وہ دفعتاً اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

۱۹۷۶ء

ہمارے ادارے کی خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

کلیات اقبال اردو صدی ایڈیشن ۳۰/۰۰
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۵۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر رفیع الدین ہاشمی ۴۵/۰۰
اقبال کی اردو نثر ڈاکٹر عبادت بریلوی ۲۰/۰۰
اقبال شاعر اور فلسفی وقار عظیم ۲۰/۰۰
فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۵۰/۰۰
شکوہ جواب شکوہ مع شرح ۳/۰۰
بانگ درا (عکسی) علامہ اقبال ۱۲/۰۰
بال جبریل (عکسی) " ۱۰/۰۰
ضرب کلیم (عکسی) " ۱۰/۰۰
ارمغان حجاز (اردو) عکسی " ۴/۵۰

غالبیات

غالب: تقلید اور اجتہاد پروفیسر خورشید الاسلام ۳۰/
غالب: شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۱۵/
دیوان غالب نور الحسن نقوی ۱۵/۰۰
خطوط غالب: فنی تجزیہ حامدہ مسعود ۲۰/۰۰

سرسید

سرسید ایک تعارف پروفیسر خلیق احمد نظامی ۳/۰۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک " ۴۵/۰۰
سرسید اور ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۲۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقا سید عبداللہ ۳۰/۰۰
سرسید۔ اقبال۔ علی گڑھ ڈاکٹر اصغر عباس ۱۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۸/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں عبدالحق ۱۵/۰۰

فیض

کلام فیض (عکسی) فیض احمد فیض ۲۰/۰۰
نقش فریادی (عکسی) " ۷/۰۰
دست صبا (عکسی) " ۷/۰۰
زنداں نامہ (عکسی) " ۷/۵۰
دست تہ سنگ (عکسی) " ۶/۰۰

لسانیات و جمالیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۲۵/۰۰
اردو زبان و ادب " ۱۲/۵۰
اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۲/۰۰
لسانیات کے بنیادی اصول ڈاکٹر اقتدار حسین ۴۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۴۵/۰۰
جمالیات شرق و غرب پروفیسر ثریا حسین ۲۰/۰۰
ادب میں جمالیاتی اقدار ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۰/۰۰

ادب و تنقید

جواب دوست نسیم انصاری ۳۰/۰۰
اردو صحافت کی تاریخ نادر علی خاں ۸۰/۰۰
میراث پایا ہوا آوارہ ۳۰/۰۰
پریم چند۔ ایک نقیب ڈاکٹر صغیر افراہیم ۳۰/۰۰

ادب، ادیب اور انسان — محمد امین — ۳۰/..
فلسفۂ جمال اور اردو شاعری — ڈاکٹر نور الحسن نقوی — ۶۰/..
دیوان فانی مع شرح — ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی — ۵۰/..
عرض جوہر — " — ۴۰/..
ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمن اعظمی — ۴۵/..
تنا سا چہرے — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۴/..
تنقیدی تناظر — ڈاکٹر قمر رئیس — ۳۰/..
پریم چند شخصیت اور کارنامے — " — ۳۵/..
احساس و ادراک — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۲۲/..
انیس شناسی — ڈاکٹر فضل امام — ۱۶/..
چہرہ بہ چہرہ — ڈاکٹر ابن فرید — ۲۵/..
میں، ہم اور ادب — " — ۲۰/..
غزل کا نیا منظر نامہ — شمیم حنفی — ۱۰/..
اردو مثنوی کا ارتقا — عبد القادر سروری — ۱۵/..
اردو کی تین مثنویاں — خان رشید — ۱۶/..
اردو تنقید کا ارتقا — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۳۵/..
جدید شاعری — " — ۴۰/..
غزل اور مطالعۂ غزل — " — ۳۰/..
آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی — ۲۰/..
داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — ۲۵/..
نیا افسانہ — " — ۲۰/..
غزل کی سرگذشت — اختر انصاری — ۱۲/..
شہرت کی خاطر — نظیر صدیقی — ۱۵/..
اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ۱۲/..
سچائی کی تلوار — مترجم زلیخا کمالی — ۳۵/..
انتخاب مثنویات اردو — مغیث الدین فریدی — ۶/..

مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۶/..
اردو میں افسانوی ادب — جمال آرا نظامی — ۳۰/..
اردو قصیدہ نگاری — ام ہانی اشرف — ۲۰/..
کلاسیکیت و رومانیت — " — ۱۲/..
اردو ناول کی تاریخ و تنقید — علی عباس حسینی — ۲۵/..
نثر، نظم اور شعر — منظر عباس نقوی — ۷/۵۰
ستارہ یا بادبان — محمد حسن عسکری — ۱۵/..
ادب کا مطالعہ — ڈاکٹر اطہر پرویز — ۲۵/..
ادب اور زندگی — مجنوں گورکھپوری — ۲۵/..
ادبی تنقید کے اصول — مترجم اشفاق محمد خاں — ۱۲/..
باغ و بہار — مقدمہ سلیم اختر — ۱۵/..
موازنۂ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۱۵/..
مقدمۂ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۱۵/..
امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۱۵/..
مجموعۂ نظم حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
مثنوی گلزار نسیم — " — ۷/۵۰
مثنوی سحر البیان — " — ۹/..

ڈرامے

اردو ڈراما: تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ۲۵/..
یونانی ڈراما — مترجم عتیق احمد صدیقی — ۲۰/..
آغا حشر اور اردو ڈراما — انجمن آرا — ۳۰/..
انار کلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰/..
آگرہ بازار — حبیب تنویر — ۵/..
شطرنج کے مہرے — " — ۶/..

سیاسیات و تاریخ

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی — ۳۰/..

اصول سیاسیات ״ ۳۰/۰۰

جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) ״ ۲۰/۰۰

متفرق

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس ڈاکٹر محمد عارف خاں ۳۵/۰۰

علم سماجیات تصورات و نظریات ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۱۲/۰۰

جدید تعلیمی مسائل ״ ۲۰/۰۰

اصول تعلیم ״ ۱۶/۰۰

عام معلومات ״ ۹/۰۰

ایجادات کی کہانی ״ ۸/۰۰

جدید علم سائنس وزارت حسین ۱۵/۰۰

آیئے اردو سیکھیں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ۱۰/۰۰

اردو کیسے پڑھائیں سلیم عبداللہ ۱۲/۰۰

رہبر صحت مسرت زمانی ۱۰/۰۰

رہبر تندرستی ״ ۱۵/۰۰

تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے ״ ۲۰/۰۰

علم خانہ داری ״ ۲۰/۰۰

بچوں کی تربیت ״ ۱۵/۰۰

گلدستۂ مضامین و انشاپردازی ڈاکٹر محمد عارف خاں ۱۰/۰۰

اردو صرف ڈاکٹر انصار اللہ ۷/۰۰

اردو نحو ״ ۵/۰۰

فیروز اللغات جیبی (عکسی) ۱۲/۰۰

فیروز اللغات جدید (ریگزین) ۳۵/۰۰

اردو سکھشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) ۳/۰۰

انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم۔ اے شہید ۸/۰۰

ناول اور افسانے

غالب (ناول) قاضی عبدالستار ۳۰/۰۰

دارا شکوہ (ناول) ״ ۳۵/۰۰

صلاح الدین ایوبی (ناول) ״ ۳۰/۰۰

شب گزیدہ (ناول) ״ ۳۰/۰۰

حضرت جان (ناول) ״ ۵۰/۰۰

چار ناولٹ (ناولٹ) قرۃ العین حیدر ۳۰/۰۰

روشنی کی رفتار (افسانے) ״ ۳۰/۰۰

آخر شب کے ہمسفر (ناول) ״ ۴۵/۰۰

نیلمبر (افسانے) حمیدہ سلطان ۲۰/۰۰

آنگن (ناول) خدیجہ مستور ۳۰/۰۰

خدا کی بستی (ناول) شوکت صدیقی ۴۵/۰۰

انتظار حسین اور ان کے افسانے مرتبہ گوپی چند نارنگ ۳۰/۰۰

کرشن چندر اور ان کے افسانے مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ۳۵/۰۰

راجندر سنگھ بیدی اور انکے افسانے ״ ۳۰/۰۰

چوٹیں (افسانے) عصمت چغتائی ۲۰/۰۰

ضدی (ناولٹ) ״ ۱۲/۰۰

ہمارے پسندیدہ افسانے مرتبہ اطہر پرویز ۲۰/۰۰

اردو کے تیرہ افسانے ״ ۲۵/۰۰

منٹو کے نمائندہ افسانے ״ ۲۰/۰۰

پریم چند کے نمائندہ افسانے مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس ۱۶/۰۰

نمائندہ مختصر افسانے مرتبہ محمد طاہر فاروقی ۷/۵۰

ایک دن بیت گیا (ناول) صلاح الدین پرویز ۴۰/۰۰

سارے دن کا تھکا ہوا پرش (ناول) ״ ۳۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲